محفوظ الرحمٰن

اردو صحافت کا نشان امتیاز





سہیل انجم

اردو صحافت کے معاصر منظرنامہ کے چند اہم ناموں میں سہیل انجم کا نام ایک درخشاں ستارے کی مانند روشن ہے۔ آج بہت سے ایسے صحافی ہیں جو اپنے جذباتی انداز بیان اور اشتعال انگیز تحریروں کے سبب کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ہم ان کی صحافت کو زرد صحافت سے موسوم کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیں گمراہی کے تاریک غار میں دھکیل لے جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ حضرات تو ان عناصر کو بخوبی پہچانتے ہیں لیکن قوم بہت باشعور نہیں ہے۔ اس لیے وہ جذبات کے تیز بہاؤ میں بہتی چلی جاتی ہے اور اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ گمراہی کی کس انتہا پر پہنچ چکی ہے۔

اس صورت حال میں سہیل انجم کا دم غنیمت ہے جو نہ صرف ایماندارانہ صحافت کرتے ہیں بلکہ

(باقی فلیپ II)

محفوظ الرحمٰن

اردو صحافت کا نشان امتیاز

سہیل انجم

اپلائڈ بکس
APPLIED BOOKS

نام کتاب	:	محفوظ الرحمٰن: اردو صحافت کا نشان امتیاز
مرتب، مصنف و ناشر	:	سہیل انجم
پتہ	:	370/6A ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 09818195929-011-26982601
تعداد	:	400
صفحات	:	256
قیمت	:	-/200 روپے
سال اشاعت	:	2015
کمپوزنگ	:	ابو دانش
زیر اہتمام	:	اپلائڈ بکس، 1739/10 (ذیلی منزل)، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002 فون:011-23266347 E-mail: appliedbooks@gmail.com

ISBN 978-93-83239-33-7

ملنے کے پتے

- اردو بک ریویو، 1739/3 (ذیلی منزل)، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-2
- جلال الدین اسلم B-44 جوشی کالونی، آئی پی ایکسٹینشن، دہلی-110092
- دانش رحمٰن B-36 جوشی کالونی، آئی پی ایکسٹینشن، دہلی-110092
- سہیل انجم 370/6A ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

Mahfoozur Rahman : Urdu Sahafat Ka Nishan-e Imtiyaz
Author: Suhail Anjum
Ist Edition: December 2015 Pages: 256 Price Rs. 200/-
Printed at: New Print Centre, New Delhi - 110002

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش، لکھنؤ
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

فہرست

ابتدائیہ 7
محفوظ الرحمٰن: مختصر تعارف 10
ایک عہد ساز صحافی: سہیل انجم 12
باب اول: 25
محفوظ الرحمٰن اہل علم وفن کی نظر میں
۱۔حق مغفرت کرے: اظہر ندوی 26
۲۔یگانہ روزگار: قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی 30
۳۔موت اس کی ہے: جلال الدین اسلم 32
۴۔اصول پسند صحافی، اصول پسند انسان: ڈاکٹر سید احمد خاں 37
۵۔ایسا کہاں سے لائیں: ظفر زاہدی 39
۶۔محفوظ الرحمٰن صاحب کی خانقاہ میں: معصوم مرادآبادی 42
۷۔فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا: ریاض قدوائی 45
۸۔تجھ سا کہیں کسے: عقیدت اللہ قاسمی 51
۹۔صحافت کا دبستان: ظفر انور شکرپوری 56
۱۰۔وہ اس مہیب رات میں سحر ہلال تھا: بدر کاظمی 61

۱۱۔ایک درویش صفت صحافی: محمد عارف اقبال 66
۱۲۔ایک بیباک صحافی: حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی 69
۱۳۔مجاہد صحافی: وصی احمد نعمانی ایڈووکیٹ 73
۱۴۔کچھ یادیں کچھ باتیں: حکیم وسیم احمد اعظمی 77
۱۵۔جادو قلم صحافی: ڈاکٹر عمیر منظر 81
۱۶۔بڑی مشکل سے ہوتا ہے: شاہین 84
باب دوم: 87

محفوظ الرحمٰن اپنی تحریروں کے آئینے میں

۱۔امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کی منفی شبیہ 88
۲۔یہ رونا دھونا یہ سینہ کوبی کب تک 93
۳۔دریوزہ گری کے سوا اور راستے بھی ہیں 98
۴۔کیا زمانے میں ۔ کی یہی باتیں ہیں 102
۵۔یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں 106
۶۔مطالبات اور اپیلوں کا زنگ خوردہ آہنی حصار 111
۷۔آخر اس ڈھونگ کی ضرورت کیا ہے 116
۸۔امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا 120
۹۔مسلمانوں کی سیاسی جماعت: امکانات اور اندیشے 126
۱۰۔سول سروسز کے نتائج پر سینہ کوبی کب تک 137
۱۱۔دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ 141
۱۲۔یہ کالکھ چھوٹنے والی نہیں ہے 146
۱۳۔جوش کے بجائے ہوش سے کام لیجیے 151

۱۴۔ گودھرا کے اسیران پوٹا کو انصاف کب 156

۱۵۔ خواتین کے لیے ریزرویشن تو مسلمانوں کے لیے کیوں نہیں 161

۱۶۔ صرف معاوضہ کی ادائیگی ہی کافی نہیں ہے 166

۱۷۔ رنگ ناتھ مشرا کمیشن کا اچوک نسخہ 170

۱۸۔ مذہب کی آزادی پر چور دروازے سے حملہ 175

۱۹۔ دوسری شادی کے لیے اسلام کا سہارا 179

۲۰۔ ذات پات، اسلام اور مسلم سماج 183

۲۱۔ سارے دہشت گرد مسلمان نہیں ہیں 188

۲۲۔ بول کہ سچ اب تک زندہ ہے 193

۲۳۔ سپریم کورٹ کا ایک اور چشم کشا فیصلہ 197

۲۴۔ جسٹس سریواستو کا ایک اور ناقابل فہم فیصلہ 201

۲۵۔ دہلی ہائی کورٹ کا ایک چشم کشا فیصلہ 205

۲۶۔ ممبئی ہائی کورٹ کا تاریخ ساز فیصلہ 212

۲۷۔ اپنے گریبان میں بھی جھانکیے 220

۲۸۔ ہم سب محض رسم ادا کر رہے ہیں 224

۲۹۔ مسکراتی گنگناتی صبح آپ کی منتظر ہے 228

۳۰۔ اب مسجدوں کے مینارے بھی چبھنے لگے 233

۳۱۔ اسلامی کانفرنس برائے بین المذاہب مکالمہ 238

۳۲۔ سات پردوں میں مستور سچ 242

۳۳۔ بنگلہ دیش کے بہاری مسلمان 249

۳۴۔ پہاڑوں جیسے سربلند لوگ 254

○○

ابتدائیہ

شہنشاہ تغزل حضرت جگر مراد آبادی نے یوں تو یہ شعر اپنے لیے کہا ہوگا:

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

لیکن دنیا میں ایسی بہت سی شخصیات گزری ہیں جن کی وفات پر یہ شعر مکمل طور پر صادق آتا ہے۔ انھی شخصیات میں جناب محفوظ الرحمٰن بھی شامل ہیں جن کے انتقال کے بعد یہ شعر بار بار میرے ذہن پر دستک دیتا رہا اور اب بھی دے رہا ہے۔

جب میں دہلی بغرض ملازمت آیا اور جناب م۔ افضل کے ہفت روزہ اخبار ''اخبار نو'' میں کام کرنے لگا تو اس وقت کے نوجوان صحافی جناب معصوم مراد آبادی نے جو کہ ہفت روزہ ''نئی دنیا'' میں بحیثیت نمائندہ خصوصی خدمات انجام دے رہے تھے اور عموماً شام میں ان سے ملاقات ہوجایا کرتی تھی، ایک روز مجھ سے پوچھا کہ کیا تم محفوظ الرحمٰن صاحب سے واقف ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان سے ضرور ملو، وہ بہت اچھے صحافی اور بہت اچھے انسان ہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو ان سے متعارف نہیں ہوں اور نہ ہی ان کی قیام گاہ کا مجھے علم ہے، بہتر ہوگا کہ آپ ہی مجھے ان کے گھر لے چلیں اور ان سے ملوا دیں۔ لہٰذا ایک روز وہ مجھے ان کی قیام گاہ پر لے گئے اور اس طرح اس روز ان سے جو تعلق قائم ہوا وہ نہ صرف برقرار رہا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط و مستحکم ہوتا چلا گیا۔

جب میں صحافت میں آیا تو طفل مکتب تھا۔ نہ مضمون نگاری آتی تھی نہ ترجمہ نگاری۔ البتہ

دوسرے بہت سے نو واردانِ بساطِ صحافت کی مانند میں بھی خود کو صحافت کا مردِ میدان سمجھتا رہا۔ لیکن یہاں کے کٹھن شب و روز نے مجھے میری اوقات بتا دی۔ اس درمیان جناب محفوظ صاحب کے گھر میرا آنا جانا بڑھ گیا اور میں ان سے بہت کچھ سیکھنے لگا۔ ایک بار میرے دل میں روزنامہ اخبار میں کام کرنے کی خواہش بیدار ہوئی اور میں نے اس کا ذکر ان سے کیا تو انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور پوچھا کہ کیا روزنامہ ''قومی آواز'' میں کسی سے واقف ہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ لیکن انھوں نے میری حوصلہ شکنی نہیں کی۔ انھوں نے کہا کہ تم روزانہ کسی انگریزی اخبار کی خبروں کا ترجمہ کر کے مجھے دکھایا کرو۔ میں نے یہ سلسلہ شروع کیا جو کئی ماہ تک جاری رہا۔ میں روزانہ دو تین خبریں ترجمہ کر کے لے جاتا اور وہ اس کو دیکھ کر غلطیوں کی اصلاح کر دیا کرتے تھے۔ ترجمے کے دوران مجھ سے عجیب و غریب بلکہ مضحکہ خیز قسم کی غلطیاں ہوتیں مگر وہ مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہونے دیتے بلکہ ان کی اصلاح اس طرح کرتے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ مجھ سے کیسی کیسی حماقتیں ہو رہی ہیں۔

بہر حال اخبارِ نو چھوڑنے کے بعد وقت نہ ملنے کی وجہ سے میں نے کچھ دنوں کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا لیکن ان کے یہاں آنا جانا جاری رہا۔ میں نے ان کے مجلّہ ''اپنا ہفت روزہ'' میں بھی کام کیا اور اس طرح میں ان سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہا۔ وقت گزرتا رہا اور میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد روزنامہ ''قومی آواز'' کی ادارتی ٹیم میں شامل ہو گیا۔ قومی آواز نے سیکھنے سکھانے کے عمل کو مہمیز لگائی اور محفوظ صاحب کی تربیت نے رنگ دکھایا اور اس طرح میں کچھ نہ کچھ لکھنے لکھانے لگا۔ جب ''قومی آواز'' میں میرا کوئی مضمون چھپتا تو وہ نہ صرف خود اس کو پڑھتے بلکہ دوسروں سے بھی پڑھنے کو کہتے اور پھر فون پر میرے مضمون کی تعریف کرتے۔ حالانکہ ان مضامین میں تعریف کے لائق کوئی بات نہیں ہوتی۔ انھی کی تربیت کی وجہ سے میرے اندر میڈیا مطالعے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس بارے میں انھوں نے اس قدر حوصلہ افزائی کی کہ کسی دوسرے نے ویسی نہیں کی۔ جس کا نتیجہ اس شکل میں برآمد ہوا کہ میڈیا پر میری ایک کتاب منظرِ عام پر آ گئی۔ پھر تو انھوں نے یوں میری پیٹھ تھپتھپائی کہ میں کچھ نہ کچھ لکھنے کے قابل ہو گیا۔

لیکن ان کے اچانک انتقال نے سب کچھ ختم کر دیا۔ جب انتقال کی خبر ملی تو میں سناٹے میں آ گیا اور دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ محفوظ صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ بہر حال دنیا میں جو آیا ہے اسے ایک نہ ایک روز جانا ہے سو وہ بھی چلے گئے۔ اسی دوران اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے سربراہ ڈاکٹر سید احمد خاں نے عالمی یوم اردو کے موقع پر محفوظ صاحب پر یادگار مجلہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس مجلہ کے لیے متعدد قلمکاروں سے ان پر مضامین لکھوائے۔ مضمون نگاروں میں وہ لوگ زیادہ ہیں جو ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ محفوظ صاحب کے کچھ مضامین بھی اس میں شامل کیے گئے۔ میں نے بعد میں اس مجلہ کے مضامین سے انتخاب کیا اور محفوظ صاحب کے کچھ اور مضامین کو حاصل کر کے یہ کتاب مرتب کر دی۔

میں اس کتاب کی اشاعت کی اجازت دینے پر ان کے فرزند جناب دانش رحمٰن اور ان کے اہل خانہ کا شکر گزار ہوں۔ دانش نے مضامین کی فراہمی میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا اور ان کے تحریر کردہ وافر مضامین میرے حوالے کیے۔ اس سلسلے میں میں محفوظ الرحمٰن صاحب کے ایک بہت عزیز دوست اور بزرگ صحافی جناب جلال الدین اسلم صاحب کا بھی شکر گزار ہوں، جن کو وہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح مانتے تھے۔ انھوں نے بھی مضامین کی فراہمی میں تعاون کے علاوہ ضروری مشوروں سے بھی نوازا۔ ڈاکٹر سید احمد خاں صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے بھی اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اپنے پر جوش جذبات کا اظہار کیا۔ یہ کتاب دراصل محفوظ الرحمٰن صاحب کو ایک خراج عقیدت ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو قبول فرمائے اور محفوظ صاحب کی لغزشوں کو درگزر کر کے ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین۔

سہیل انجم

OO

محفوظ الرحمٰن: مختصر تعارف

محفوظ الرحمٰن 4 جنوری 1938 کو موضع نوناری، ضلع اعظم گڑھ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے اور 6 فروری 2010 کو دہلی میں واقع رہائش گاہ پر ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تدفین دہلی گیٹ کے قبرستان میں ہوئی۔

آپ نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا، اس کے بعد آپ کا صحافتی سفر شروع ہوا۔ آپ کے اظہارِ خیال کی زبان اردو، ہندی اور انگریزی تھی۔ وہ 44 برسوں تک صحافت کے خاردار جنگل میں اپنے اصولوں کی صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھائے سرگرم سفر رہے۔ زمانہ سازی کے فن سے ناآشنا اور کسی بھی قیمت پر اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہ کرنے کے عزم پر قائم رہنے کے سبب وہ منزل ان سے ہمیشہ دور رہی جسے اہل خرد ''منزل مراد'' کا نام دیتے ہیں۔ انھیں قلم کی حرمت اور فکر ونظر کی آزادی ہمیشہ عزیز رہی۔

روزنامہ قائد لکھنؤ اور اخبار دعوت دہلی کے چیف ایڈیٹر رہے۔ علاوہ ازیں ہفت روزہ جمعہ، اپنا ہفت روزہ اور بادبان جدید کی ادارتی ذمہ داری سنبھالی۔ آخر الذکر دونوں پرچے انھوں نے خود شروع کیے تھے۔ وہ چار سال کے لیے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔

انھوں نے ابتدا میں دو سال پولینڈ کے سفارت خانے میں ہندی مترجم کی ذمہ داری سنبھالی اور 1977 میں تقریباً تین سال تک سوویت انفارمیشن سینٹر کے اردو جریدہ سوویت جائزہ سے وابستہ رہے۔

یونیورسٹی سے فراغت کے بعد سے آخر وقت تک لکھنے لکھانے کا کام جاری رہا۔ وہ انتہائی نامساعد، حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات کے باوجود ملک وملت سے وفاداری پر قائم رہے۔ انھوں نے ملک کے ارباب سیاست وقیادت کے علاوہ عالم اسلام کی متعدد اہم شخصیتوں کے انٹرویوز لیے جن میں سب سے اہم اخوان المسلمین کے سربراہ ڈاکٹر عمر تلمسانی کی تھی۔ ان کے علاوہ اس فہرست میں ڈاکٹر حسن ترابی، ڈاکٹر فیض المهدی، ڈاکٹر اسماعیل فاروقی، ڈاکٹر سالم عزام سکریٹری جنزل اسلامی کونسل آف یورپ، پروفیسر عبدالرب سیاف، پروفیسر برہان الدین ربانی، جنزل ضیاء الحق، فواد صادق مفتی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، ذوالفقار اللہ، مولانا ابواللیث، چودھری چرن سنگھ، وی پی سنگھ، ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ یہ انٹرویو قائد، دعوت، جمعہ، اپنا ہفت روزہ اور بادبان وغیرہ کے علاوہ ملک کے دوسرے بہت سے اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے تھے۔

آپ کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آئیں اور مقبول ہوئیں جن میں فیصل اعظم: حیات اور کارنامے، سرخ یلغار، کویت پر عراق کا قبضۂ غاصبانہ: حقائق اور مضمرات' کسان کا بیٹا سب کا دوست، معاہدہ عمرانی، بھٹو: دوست یا دشمن اور جدید سیاسی اصلاحات قابل ذکر ہیں۔

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

○○

ایک عہد ساز صحافی

سہیل انجم

جناب محفوظ الرحمٰن صاحب اردو صحافیوں کی جس نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ اب رفتہ رفتہ اٹھتی جا رہی ہے۔ ان کا انتقال بلاشبہ اردو صحافت کا بڑا خسارہ اور صحافت کے ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ ان کے نزدیک صرف صحافتی قدریں ہی عزیز نہیں تھیں بلکہ اس مزاج کے صحافی اپنے پیچھے ایک نسل بھی چھوڑ جاتے ہیں اور بلاشبہ محفوظ الرحمٰن صاحب نے بھی ایک ایسی نسل چھوڑی ہے جو ان کی قلمی پرورش کے زیر سایہ جوان ہوئی ہے اور توقع ہے کہ یہ ان کے نظریات اور ان کی ملی فکر کو پروان چڑھائے گی اور اس طرح انھیں خراج عقیدت پیش کرتی رہے گی۔ ان کی موت سے دو روز قبل ہی کافی دیر تک ان سے باتیں ہوئی تھیں۔ ہم لوگ ایک تصنیفی پروجیکٹ کے سلسلے میں ایک ہفتے سے مسلسل ایک دوسرے کے قریبی رابطے میں رہے ہیں۔ ان کا انتقال ایک ایسا صدمہ جانکاہ ہے جس کا بار اٹھائے سے بھی نہیں اٹھ رہا۔ یہ اردو صحافت کا عظیم خسارہ تو ہے ہی، میرے لیے تو یہ کسی ذاتی خسارے سے کم نہیں ہے۔ ان کے انتقال کے بعد یادوں کا ایک ہجوم ہے اور واقعات کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ واقعات دست بستہ کھڑے ہیں اور فریاد کناں ہیں کہ پہلے مجھے چنو، پہلے مجھے چنو۔ لیکن ان واقعات کو سمیٹنا آسان نہیں۔ ان کو قلم بند کرنے کے لیے تو ایک دفتر چاہیے۔

آپ نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کیا، اس کے بعد آپ کا صحافتی سفر شروع ہوا۔ آپ کے اظہارِ خیال کی زبان اردو، ہندی اور انگریزی تھی۔ وہ

44 برسوں تک صحافت کے خاردار جنگل میں اپنے اصولوں کی صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھائے سرگرم سفر رہے۔ زمانہ سازی کے فن سے نا آشنا اور کسی بھی قیمت پر اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہ کرنے کے عزم پر قائم رہنے کے سبب وہ منزل ان سے ہمیشہ دور رہی جسے اہل خرد ''منزل مراد'' کا نام دیتے ہیں۔ انھیں قلم کی حرمت اور فکر ونظر کی آزادی ہمیشہ عزیز رہی۔ روزنامہ ''قائد'' لکھنؤ اور اخبار ''دعوت'' دہلی کے چیف ایڈیٹر رہے۔ علاوہ ازیں ہفت روزہ جمعہ، اپنا ہفت روزہ اور بادبان جدید کی ادارتی ذمہ داری سنبھالی۔ آخر الذکر دونوں پرچے انھوں نے خود شروع کیے تھے۔ وہ چار سال کے لیے آل انڈیا مجلس مشاورت کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ انھوں نے ابتدا میں دو سال پولینڈ کے سفارت خانے میں ہندی مترجم کی ذمہ داری سنبھالی اور 1977 میں تقریباً تین سال تک سوویت انفارمیشن سینٹر کے اردو جریدہ سوویت جائزہ سے وابستہ رہے۔

یونیورسٹی سے فراغت کے بعد سے آخر وقت تک لکھنے لکھانے کا کام جاری رہا۔ وہ انتہائی نامساعد حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات کے باوجود ملک وملت سے وفاداری پر قائم رہے۔ انھوں نے ملک کے ارباب سیاست وقیادت کے علاوہ عالم اسلام کی متعدد اہم شخصیتوں کے انٹرویوز لیے جن میں سب سے اہم اخوان المسلمین کے سربراہ ڈاکٹر عمر تلمسانی کی تھی۔ ان کے علاوہ اس فہرست میں ڈاکٹر حسن ترابی، ڈاکٹر فیض المہدی، ڈاکٹر اسماعیل فاروقی، ڈاکٹر سالم عزام سکریٹری جنرل اسلامی کونسل آف یورپ، پروفیسر عبدالرب سیاف، پروفیسر برہان الدین ربانی، جنرل ضیاء الحق، فواد صادق مفتی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، ذوالفقار اللہ، مولانا ابواللیث، چودھری چرن سنگھ، وی پی سنگھ، ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ یہ انٹرویو قائد، دعوت، جمعہ، اپنا ہفت روزہ اور بادبان وغیرہ کے علاوہ ملک کے دوسرے بہت سے اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے تھے۔

آپ کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آئیں اور مقبول ہوئیں جن میں فیصل اعظم: حیات اور کارنامے، سرخ یلغار، کویت پر عراق کا قبضۂ غاصبانہ: حقائق اور مضمرات، کسان کا بیٹا سب کا دوست، معاہدہ عمرانی، بھٹو: دوست یا دشمن اور جدید سیاسی اصلاحات قابل ذکر ہیں۔

محفوظ الرحمٰن اردو صحافیوں کی جس نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ اب رفتہ رفتہ اٹھتی جارہی ہے۔ ان کو صحافتی قدریں عزیز ہی نہیں تھیں بلکہ وہ ان پر اپنی جان بھی چھڑکتے تھے۔ اس مزاج کے صحافی اپنے پیچھے ایک پوری نسل چھوڑ جاتے ہیں اور بلاشبہ محفوظ الرحمٰن نے بھی ایک ایسی نسل چھوڑی ہے جو ان کی قلمی پرورش کے زیر سایہ جوان ہوئی ہے اور توقع ہے کہ یہ ان کے نظریات اور ان کی ملی فکر کو پروان چڑھائے گی اور اس طرح انھیں خراج عقیدت پیش کرتی رہے گی۔

محفوظ الرحمٰن میں جو صحافتی خوبیاں تھیں وہ بہت کم لوگوں میں ملتی ہیں اور آج کے مادہ پرست دور میں تو ویسے صحافی خال خال ہی ہیں۔ انتہائی خوددار اور غیرت مند، قلم کی آبرو کے ایسے محافظ کہ خود پر آنچ آجائے مگر قلم کی حرمت پر حرف نہ آنے پائے۔ راقم نے ان سے ذاتی تعلق کے پورے عرصے میں، جو کہ کم وبیش 23 سالوں پر محیط ہے، ان کی ایک بھی ایسی تحریر نہیں دیکھی جس میں انھوں نے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کیا ہو، اپنی خودداری کا سودا کیا ہو یا قلم کی حرمت کو پامال کیا ہو۔ جس بات کو سچ سمجھتے تھے اسے ڈنکے کی چوٹ پر لکھتے تھے۔ خواہ کوئی ناراض ہو یا خوش اور جس بات کو غلط سمجھتے تھے اسے قطعاً تسلیم نہیں کرتے تھے اور اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں سے اغیار کی پیشانیوں پر تو بل پڑ ہی جاتے بعض اوقات اپنے بھی خفا سے ہوجاتے تھے۔ لیکن ان کی حق گوئی، صحافتی دیانت داری اور جرأت مندی وبیباکی میں ذرا بھی لغزش نہیں آتی تھی۔ اسی لیے ان کے مخالفین بھی ان کے نظریات سے اتفاق نہ رکھنے کے باوجود ان کا احترام کرتے تھے اور ان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے ادا کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

ان کی شخصیت کی ایک عجیب دھاک تھی، ایک عجیب دبدبہ تھا اور اس میں ایک عجیب سی کشش بھی تھی۔ جس نے ایک بار ملاقات کرلی زندگی بھر کے لیے ان کا گرویدہ ہوگیا۔ یہ ان کی شخصیت اور ان کے قلم کی جادوگری ہی تھی کہ ان کے آستانے پر اپنے بھی حاضری دیتے تھے اور غیر بھی، دوست احباب بھی اور مخالفین بھی۔ ان کے ارادت مندوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن سے ان کا نظریاتی اختلاف رہا کرتا تھا۔ ان کے حلقۂ یاراں میں ہر مکتب فکر اور

ہر طبقہ خیال کے لوگ موجود تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سب ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے تھے۔ ان کے ارادت مندوں میں ہندی اور انگریزی صحافیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ وہ متعصب اور تنگ نظر علماء کے سخت خلاف تھے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایسے علماء کی بھی خاصی تعداد ان کی معتقد تھی جو ان کی دلچسپ اور تعمیری تنقید کو نہ صرف صبر و شکر کے ساتھ سنتی تھی بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتی تھی۔

بقول اظہر ندوی محفوظ الرحمٰن مرحوم کی شخصیت میں ایک خاص جاذبیت و دلنوازی تھی، جہاں بھی ہوتے بہت جلد گھل مل جاتے اور مقبولیت بھی حاصل کر لیتے، اپنی نرم گفتاری، کشادہ روئی اور خوش اخلاقی سے وہ مشرقی تہذیب کے نمائندہ معلوم ہوتے تھے۔ چالیس برس سے زیادہ عرصہ تک ان سے تعلقات رہے لیکن میں نے انھیں کبھی غصے میں یا رکیک زبان استعمال کرتے نہیں پایا۔

محفوظ الرحمٰن قلندرانہ مزاج رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی مال و دولت یا جاہ و منصب کے حصول کی کوشش نہیں کی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ان کے سامنے جتنے مواقع آئے اتنے شاید ہی اردو کے کسی صحافی کے سامنے آئے ہوں، اور کوئی دوسرا ہوتا تو ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر کروڑوں روپے کما سکتا تھا لیکن ان کی قلندری نے کبھی اس طرف تاکنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور پوری زندگی بڑی حد تک فاقہ مستی ہی میں گزار دی۔

محفوظ الرحمٰن کے ایک قریبی رفیق، صحافی اور معروف خطاط جلال الدین اسلم کہتے ہیں کہ محفوظ الرحمٰن ہندوستانی مسلمانوں کے ایسے مخلص اور ایسے بیباک صحافی تھے جن کی کوئی دوسری مثال ڈھونڈنے پر بھی شاید ہی مل سکے، وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے اور ان تمام خوبیوں سے مزین تھے جو ایک اچھے اور منجھے صحافی بلکہ ایک بہت اچھے انسان کو دوسرے تمام لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ تعلیم و تربیت نے ان کی سوچ کو نکھارا تھا اور ان کے مزاج کو اور ان کی فطرت کو اس طرح صیقل کیا تھا کہ وہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند اور کہیں زیادہ لائق تعظیم و تکریم نظر آتے تھے۔ سنہ ستر کے سیاسی، سماجی اور انقلابی دور میں ملک کے قد آور سیاستدانوں وی پی سنگھ، چندر شیکھر، چرن سنگھ وغیرہ سے بہت قریبی تعلقات پیدا ہو گئے

تھے، لیکن مفادات کی سیاست وصحافت سے، اس کی پیدا کردہ رعونت وعفونت سے کوسوں دور رہے، وہ چاہتے تو بہت کچھ حاصل کر لیتے لیکن ان کی صحافت چونکہ ملت کے لیے تھی اس لیے ملی خدمت کے جذبۂ بے پناہ میں ہی ڈوبی رہی۔ انھوں نے زندگی کی آخری دہائیوں میں اپنی رہائش گاہ کو دانش گاہ میں بدل دیا تھا۔ لوگ جوق در جوق آتے اور ''چشمۂ رحمانیہ'' سے فیضیاب ہوتے، دوستوں نے ان کی رہائش گاہ کو مذاقاً ''خانقاہ'' کے نام سے موسوم کر دیا تھا، ان کا ''لنچ ٹائم'' احباب کے لیے دعوت عام تھی جسے کچھ ساتھی لنگر خانہ کہتے اور کچھ لوگوں نے محفوظ صاحب کی ''دعوت شیراز'' کا نام دے رکھا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محفوظ بھائی کی دعوت شیراز سے اسلاف کی یاد تازہ ہوتی رہتی تھی۔ چشمۂ رحمانیہ کے ہم مشرب لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جوان کے بہت سے معاملات وخیالات سے اتفاق تو نہیں رکھتے تھے لیکن ان کے اعلام علم تلے ہی چین واطمینان بھی حاصل کرتے تھے، سچ تو یہ ہے کی محترم محفوظ الرحمٰن نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں جن صحافتی اقدار کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا ان کا محور ومرکز حقیقی معنوں میں وہ حدیث مبارک ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے، وہ ساری زندگی ملت کی زبوں حالی پر روتے رہے۔ اس کے غم میں ڈوبے رہے، اس کی تعمیر وترقی کے لیے قلمی جہاد کرتے رہے۔ وہ میدان صحافت کے ایسے بطل جلیل تھے جنھیں وقت کا نہ کوئی حکمراں اور نہ ہی کوئی اور اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکا، انھوں نے اپنی دانست میں جو بھی سچ جانا، سمجھا اسے بلا جھجک لکھا اور کہا۔ وہ اپنی تنقید میں بھی لوگوں کو صراط مستقیم دکھانے کا ہی فریضہ انجام دیتے رہے۔ ایسے بے لوث صحافیوں کی تعداد اب نا کے برابر ہے، انھیں بے لوث وبے غرض لوگوں میں مرحوم کا نام نامی بھی سرفہرست ہے۔

جس کے اندر خودداری ہوتی ہے عام طور پر وہ قناعت پسند بھی ہوتا ہے اور یہ خوبی ان میں بھی تھی۔ ان کے اندر قلندرانہ اوصاف بھی تھے۔ اسی لیے پچاس سال سے زائد کا عملی صحافتی تجربہ رکھنے کے باوجود وہ انعام واکرام اور اعزاز وایوارڈ کی حصولیابی کی کوششوں سے کوسوں دور تھے۔ ان کے سامنے بالشتیے صحافیوں نے کہاں سے کہاں تک کی چھلانگ لگائی لیکن وہ مادی اعتبار سے وہیں کے وہیں رہے۔ البتہ ان کا انسانی اور صحافتی قد بلند سے بلند تر ہوتا گیا

اور وہ صحافت کے قطب مینار میں تبدیل ہو گئے۔ عموماً اگر کوئی دو ایک ماہ کے لیے ہی گوشہ نشین ہو جائے تو زمانے سے کٹ جاتا ہے۔ محفوظ الرحمٰن کم وبیش ایک دہائی تک گوشہ نشین رہے اس کے باوجود وہ صحافتی اور سیاسی مین اسٹریم میں ہمیشہ موجود رہے۔ ملی معاملات ہوں یا قومی، ملکی صورت حال ہو یا غیر ملکی، سیاسی تجزیہ ہو یا غیر سیاسی، ان کی گرفت ہر مسئلے پر تھی اور ان کی نظر معاملات کے تمام پہلوؤں پر ہوتی تھی۔ وہ اپنے مضامین میں کسی بھی معاملے کے تجزیے کے دوران تمام جزیات پر گہری نظر ڈالتے تھے اور ایک ایک نکتے کا باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں رہتا تھا۔

محفوظ الرحمٰن کے ایک شاگرد اور سرکردہ صحافی ظفر زاہدی کے خیال میں قلندر صفت، یار باش، وضعدار، روپے پیسے کے تعلق سے لاپروا، صحافت اوڑھنا بچھونا، جیسے اللہ تعالیٰ نے انھیں اسی لیے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ بڑے بڑے مذہبی و سیاسی لیڈران کے مشورے کے خواہاں، سیاسی امور ومسائل پر صائب رائے رکھتے تھے اور اس کا برملا اظہار کرنے میں کوئی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ نو واردان صحافت سے لے کر بڑے بڑے قابل صحافی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ قلم کے بادشاہ، آخری بیس پچیس برسوں میں لکھنے کی بجائے، بے تکلف بول کر مضمون لکھواتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے الفاظ صف باندھے کھڑے ہیں، تحریر رواں دواں، شستہ وشگفتہ، رعنائی ودلکشی سے معمور ولبریز، آج سے چالیس برس پہلے جو زبان لکھتے تھے اسے سہل کرتے جا رہے تھے، کہتے تھے اب اتنی گاڑھی اردو، سمجھنے والے کتنے لوگ رہ گئے ہیں، خشک سے خشک موضوع میں ایسی دلآویزی اور کشش پیدا کر دیتے کہ وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی۔ گفتگو اتنی شیریں جیسے زبان سے پھول جھڑ رہے ہوں' وہ کہیں اور سنا کرے کوئی' ان سے لڑ کر بھی مزہ آتا تھا۔ گزشتہ پینتیس، چالیس برسوں میں بہت سے لوگوں سے ملا' مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی'۔

ان کے طرز تحریر کی ایک قابل ذکر خوبی یہ تھی کہ ان کے نظریات پر ملّی فکر حاوی رہتی تھی اور وہ کسی ایسے فیصلے یا معاملے کی حمایت نہیں کرتے تھے جس سے مسلم مخالفت یا اسلام دشمنی کی بو آتی ہو۔ ملی فکر ان کی صحافت کی اساس تھی۔ وہ یوں تو ایک مکمل صحافی تھے اور قومی وسیاسی امور

پر ان کی زبردست گرفت تھی۔ ملک و بیرون ملک کا کوئی بھی مسئلہ ان کی دور اندیش نگاہوں اور ان کی صحافتی لیاقت سے پرے نہیں تھا۔ وہ ملکی و عالمی حالات وواقعات کا انتہائی گہرائی اور جزرسی کے ساتھ مشاہدہ اور مطالعہ کرتے تھے۔ لیکن ان کا قلم اس وقت بہت کاٹ دار اور دھار دار ہو جاتا تھا جب وہ کسی ملی مسئلے پر نظر ڈالتے تھے یا کسی ملّی مسئلے کا پوسٹ مارٹم کرتے تھے۔ وہ ایسے مواقع پر کسی بھی مذہبی شخصیت سے خواہ اس کا عوامی قد کتنا ہی بلند و بالا کیوں نہ ہو اور اس کو ملی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی کیوں نہ حاصل ہو مرعوب نہیں ہوتے تھے اور اگر کسی بھی مذہبی شخصیت سے کوئی چوک ہوئی ہے تو ان کا قلم اسے بخشنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوئی بھی سمجھوتہ نہیں کرتے اور ان کے قلم کے وار سے کوئی بھی نہیں بچتا۔ وہ جب کسی اخبار یا رسالے کے مدیر رہے تب بھی اور نہیں رہے تب بھی اپنے اصولوں کی ڈگر پر ثابت قدمی کے ساتھ چلتے رہے۔ چونکہ کسی سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہیں تھا اس لیے ان کے قلم کا ترازو کسی بھی جانب جھکتا نہیں تھا۔ وہ اپنے قلمی ترازو کے ایک پلڑے پر ملت کو رکھتے تھے اور دوسرے پر ملی شخصیت کو۔ اور پھر ملی مفاد کی روشنی میں گہرا جائزہ لیتے تھے۔

محفوظ الرحمٰن مسلم مطلقہ خواتین بل کے، جس انداز اور جس شکل میں وہ پاس ہوا ہے، سخت مخالف تھے۔ وہ پہلے دن سے ہی یہ کہتے رہے ہیں کہ یہ بل اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہے اور عدالتیں طلاق اور نان ونفقہ کے مقدمات میں اس قانون کے تحت فیصلہ سنائیں گی اور وہ تمام فیصلے عائلی قوانین کے خلاف جائیں گے۔ یہ بات بعد میں سچ ثابت ہوئی اور ملک کی زیریں عدالتوں سے لے کر عدالت عظمیٰ تک متعدد مقدمات میں جو فیصلے سنائے گئے ہیں اور سنائے جارہے ہیں وہ شریعت کے عائلی قوانین کے خلاف ہیں۔ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اس سلسلے میں جو دوسرے مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں ان میں بھی ایسے ہی فیصلے سنائے جائیں گے۔ وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں کو بھی آڑے ہاتھوں لینے سے گریز نہیں کرتے تھے اور انتقال سے چند روز قبل لکھنؤ میں منعقدہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں منظور شدہ قراردادوں اور فیصلوں پر انھوں نے سخت تنقید کی تھی اور اس بارے میں ان کا مضمون روزنامہ راشٹریہ سہارا میں شائع ہوا تھا۔

پرسنل لا بورڈ کے فیصلوں سے متعلق ان کا وہ آخری مضمون تھا۔ وہ ناعاقبت اندیش، خودغرض اور مصلحت کوش مسلم لیڈروں اور سیاست دانوں کے ان فیصلوں کی بھی سخت مخالفت کرتے تھے جو مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کا سبب بننے کے امکانات رکھتے ہوں۔

ان کی صحافتی اور انسانی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایڈیٹر" جدید خبر" معصوم مرادآبادی کہتے ہیں کہ راقم الحروف کو محفوظ الرحمٰن صاحب کی خدمت میں حاضری کے بے شمار مواقع ملے اور ہر بار ان سے کچھ سیکھنے، سمجھنے اور انگیز کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے پرانی دہلی کی گنجان گلیوں میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کسی نمود و نمائش اور شوق شہرت کے بغیر خاموشی سے بسر کیا۔ انھیں دیکھ کر گزرے زمانے کے ان لوگوں کی یاد تازہ ہوتی تھی جو دنیا میں رہنے کے باوجود اس سے ایک فاصلہ بنا کر رکھتے ہیں ایسا ہی فاصلہ جیسا کہ آتش پرست آگ سے رکھتا ہے۔

انھوں نے دنیا سے محض ایک رسمی رشتہ ہی رکھا اور کبھی خود کو اس کی رنگینیوں، رعنائیوں اور بوقلمونیوں میں گم نہیں ہونے دیا۔ نہ کبھی ذاتی مکان خریدا، نہ گاڑی، نہ گھوڑا اور نہ مصاحب۔ ہمیشہ کرائے کے مکان میں ایک مسافر کی طرح رہے اور کسی مالی بوجھ کے بغیر آخرت کا سفر اختیار کیا۔ قناعت کا عالم یہ تھا کہ انھیں پیسوں کی طلب اپنی ضروریات زندگی سے بھی کم تھی۔ اس لیے اکثر تنگدستی کا شکار رہتے تھے لیکن اس معاشی تنگدستی کو دور کرنے کے لیے انھوں نے موجودہ زمانے کا ایسا کوئی حربہ استعمال نہیں کیا جس سے ان کے ضمیر یا قلم پر ضرب پڑتی۔ وہ ایک بیباک حقیقت پسند صحافی تھے۔ ان کا خمیر جہاں سے اٹھا تھا وہاں ذاتی مفادات اور انسانی خواہشوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ ملت کے مایۂ ناز قائد ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے لے کر مایۂ ناز صحافیوں محمد مسلم اور مولانا محمد عثمان فارقلیط جیسے جید صحافیوں سے اکتساب فیض کرنے والے محفوظ الرحمٰن صاحب کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ انھوں نے زندگی میں کبھی اپنے نظریات اور بنیادی عقائد سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہر چند کہ اپنی معاشی ضرورتوں کے تحت مختلف اور متضاد اداروں سے وابستگی اختیار کی لیکن اس کے باوجود اپنے بنیادی مشرب کو ترک نہیں کیا۔ راہ کی کوئی رکاوٹ، مشکل یا مصیبت ان

کے قدموں میں کوئی لغزش پیدا نہیں کرسکی اور انہوں نے تمام زندگی سرخرو ہو کر گزاری۔ محفوظ الرحمٰن صاحب کی خدمت میں ہر حاضری کے وقت ادب اور احترام کے جذبات انگڑائیاں لیتے تھے۔ لیکن وہ اسے تکلف گردانتے تھے اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی پوری طرح گھل مل کر اور اپنی بزرگی اور بے پناہ تجربات کا کوئی رعب ڈالے بغیر دوستی اور شفقت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جب گفتگو کرتے تھے تو طبیعت بڑی سیراب ہوتی تھی۔ محفوظ الرحمٰن صاحب نے ایک ایسے وقت میں آنکھیں موندی ہیں جب وسیع تجربہ، زبان دانی، تحریر کے حسن اور تسلسل کے علاوہ مقصد سے وابستگی رکھنے والے صحافیوں کا اردو میں زبردست قحط پیدا ہو گیا ہے۔ آج اردو صحافت ذہن، ضمیر اور زبان کے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہے اور ان موذی امراض کا علاج ڈھونڈنے کی کوئی کوشش نہیں کی جارہی ہے۔ اردو صحافت کے افق پر ایسے مجہول اور گمراہ عناصر اپنا تسلط قائم کررہے ہیں جنھیں دیکھ کر بعض اوقات اردو صحافت کا مستقبل مخدوش نظر آتا ہے۔

محفوظ الرحمٰن کی علمیت، ان کی صحافیانہ صلاحیت اور ان کی قابلیت ہی کی یہ دلیل ہے کہ مجھ سمیت صحافت کے بے شمار طالبان علم کسی اہم موضوع پر کچھ لکھنے سے قبل ان سے ضرور مشورہ کرتے تھے اور پھر ان کی گفتگو کی بنیاد پر یا بات چیت کے دوران ان کی زبان سے ادا ہو جانے والے چند جملوں کی بنیاد پر مضمون کی پوری عمارت کھڑی ہو جاتی تھی۔ ہندی یا انگریزی کے صحافیوں کو مسلم معاملات پر کوئی اسٹوری کرنی ہو تو وہ انہی کے آستانے پر حاضری دیتے تھے اور ان کے چند جملے ایکسکلوسیو اسٹوری کی بنیاد بن جایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی انویسٹی گیٹو اسٹوری کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے اور اپنی صحافتی زندگی میں انھوں نے اس کی بے شمار مثالیں بھی پیش کی تھیں۔ وہ واقعہ تو کوئی فراموش ہی نہیں کرسکتا جب انھوں نے میرٹھ اور ملیانہ کے متاثرین کے سلسلے میں جمع کی گئی رقم کے فکسڈ ڈپازٹ اور سود کی رقم سے دفتر چلانے کے معاملے کا انکشاف کیا تھا اور ''اپنا ہفت روزہ'' کا ''خیانت نمبر'' شائع کرکے ملی و صحافتی حلقوں میں زلزلہ پیدا کردیا تھا۔ وہ صحافت کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری کے ساتھ

ساتھ زبان و بیان کے معیار کو بھی ذہن میں رکھتے تھے اور ایسی شستہ زبان لکھتے تھے کہ پڑھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ اکثر بات چیت کے دوران آج کے اخباروں میں زبان کے گرتے معیار پر اظہار افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ موجودہ صحافیوں کو معیاری زبان کی ٹریننگ کا بھی انتظام کیا جانا چاہیے۔ ان کے اندر معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت بہ درجہ اتم موجود تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے تجزیاتی مضامین میں کوئی جھول نہیں ہوتا تھا، کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔

وہ نوجوان صحافیوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کی خامیوں کو نظر انداز کرتے تھے اور باتوں باتوں میں ایسی بات کہہ جاتے تھے کہ بعد میں خود بخود یہ احساس ہو جاتا تھا کہ ہم نے کہیں غلطی کی ہے۔ لیکن وہ براہ راست اس کی نشاندہی نہیں کرتے تھے کہ کہیں اس سے اس کی عزت نفس کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا، ان کی قلمی سرپرستی میں اردو صحافیوں کی پوری ایک نسل جوان ہوئی ہے۔ اس نسل نے ان کی سرپرستی میں بہت کچھ سیکھا ہے اور صحافت کے اصولوں سے روشناسی کے ساتھ ساتھ دیانت داری اور خودداری کی اہمیت کو سمجھا ہے۔ صحافت کے پیشے میں اب بلیک میلنگ کا دور آ گیا ہے لیکن محفوظ الرحمٰن اس گُر سے واقف ہی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کی گاڑی بس ایک ہی پٹری پر دوڑتی رہی۔ انھوں نے اس عیش و عشرت کو نہیں دیکھا جس کی حصولیابی موجودہ دور کے صحافیوں کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل بن چکی ہے۔ ان کے طرز زندگی اور انداز رہائش میں کبھی کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی۔ ان کے گھر جانے والے کسی بھی شخص کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے حالات کیسے ہیں۔ ابتر حالات میں بھی ان کے چہرے پر شکن نہیں آتی تھی۔

محفوظ الرحمٰن کا صحافتی سفر بہت طویل تھا۔ انھوں نے زمانے کے سرد و گرم کو جھیلا تھا اور ان کو وقت کی بھٹی میں تپ کر کندن بننے کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے انگریزی میں بھی صحافت کی تھی اور ہندی میں بھی۔ لیکن ان کی اصل شناخت اردو صحافت ہی تھی۔ انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کیا تھا اور پھر صحافت کی لائن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جب ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے سرکردہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہندوستانی مسلمانوں کو

عزت و وقار کے ساتھ جینے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے 70 کی دہائی میں مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد ڈالی تو ان کے ایک معاون کی حیثیت سے محفوظ الرحمٰن ان کے ساتھ تھے۔ اور پھر انھوں نے جب لکھنؤ سے روزنامہ قائد شروع کیا تو ان کی نظر انتخاب انہی پر جا کر رکی اور انھوں نے ان کو اس کا ایڈیٹر بنایا۔ وہ جماعت اسلامی کے آرگن سہ روزہ دعوت کے بھی ایک عرصے تک ایڈیٹر رہے۔ پہلے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے بہت دنوں تک کام کیا اس کے بعد ایڈیٹر کی ذمہ داریاں انجام دیں۔ ان کا مزاج اس قسم کا تھا کہ وہ کسی کی علمیت یا عہدہ ومنصب سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان سے طویل ذاتی تعلق کے دور میں یہ اندازہ لگایا کہ وہ صرف تین شخصیات سے متاثر تھے اور ان کے عقیدت مند تھے۔ ایک ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، دوسرے مولانا محمد مسلم اور تیسرے مولانا محمد عثمان فارقلیط۔ باقی کسی کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ جب بھی ان دونوں کے بارے میں گفتگو کرتے تو بے حد جذباتی ہو جاتے اور گھنٹوں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔ وہ صحافیوں میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کے بڑے قدردان تھے اور ان کے بارے میں جب بھی گفتگو کرتے تو جذباتی ہو جاتے۔ ان کے حکم پر ہی یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے مولانا فارقلیط کے نام پر ایک صحافتی ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

انھوں نے درمیان میں سوویت انفارمیشن سینٹر میں بھی ملازمت کی تھی لیکن اس ملازمت سے وہ مطمئن نہیں تھے اسی لیے موقع ملتے ہی اسے خیر باد کہہ دیا۔ ایک بار راقم الحروف سے کہنے لگے کہ سوویت انفارمیشن سینٹر میں ملازمت پر مجھ کو بہت افسوس تھا جس کا بعد میں میں نے کفارہ ادا کر دیا۔ میں نے پوچھا وہ کس طرح تو انھوں نے کہا کہ افغانستان پر روسی حملے کے خلاف ایک کتاب لکھ کر۔ (اس کتاب کا نام ''سرخ یلغار'' ہے اور اس میں نہ صرف روسی حملے کی دلخراش تفصیلات ہیں بلکہ افغانستان کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔) محفوظ الرحمٰن نے ایک انتہائی مقبول ہفت روزہ ''اخبار جمعہ'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے تھے اور ''اپنا ہفت روزہ'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اور ''بادبان'' کے نام سے ایک ماہنامہ بھی نکالا تھا۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے ''اپنا ہفت روزہ'' میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو اور سعودی عرب پر بھی کتاب لکھی تھی اور کویت پر عراق کے حملے کے خلاف بھی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ غیر ملکی شخصیات میں جنرل ضیاء الحق سمیت متعدد سیاست دانوں سے انٹرویو کیے تھے جبکہ ہندوستانی سیاست دانوں سے انٹرویو کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ سابق نائب وزیر اعظم چودھری دیوی لال اور سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ سے ان کے ذاتی مراسم تھے لیکن انھوں نے ان سے کوئی مادی فائدہ نہیں اٹھایا۔

وہ اس ناچیز کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کی تحریک پر ہی میں نے میڈیا کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی رہنمائی میں میڈیا کے موضوع پر تین کتابیں تصنیف کیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ترغیب و تحریک نے میرے اندر میڈیا کے گہرے مطالعے کا جذبہ پیدا کیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تم کوشش کرو کہ سال میں ایک کتاب ضرور شائع ہو جائے مرنے کے بعد یہی کتابیں زندہ رکھیں گی۔ جب میری کتاب ''میڈیا اردو اور جدید رجحانات'' شائع ہونے جا رہی تھی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ یا تو اس کتاب پر مقدمہ لکھ دیں ورنہ میں اس کا انتساب آپ کے نام کر دوں گا۔ مقدمہ لکھنے سے انکار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ اب مجھ سے نہیں لکھا جاتا۔ ہفتہ واری کالم بہت مشکل سے لکھتا ہوں۔ بہر حال میں نے ان کے نام کتاب منسوب کر دی اور جب ان کو بتایا تو کہنے لگے کہ میرے نام منسوب کرنے کے بجائے اپنے بزرگوں کے نام کیوں نہیں کرتے۔ میری زبان سے نکل گیا کہ میں اپنے بزرگ ہی کے نام کر رہا ہوں۔ ایک لمحے کو خاموش رہے پھر جذباتی ہو گئے اور کہنے لگے کہ ٹھیک ہے جو سمجھ میں آئے کر دو۔ جب میں 2006 میں حج کر کے واپس آیا تو انھوں نے اصرار کر کر کے سفر نامہ لکھوایا جو روزنامہ قومی آواز میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ اس سے بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ اس آگ کو بجھنے مت دینا۔ اس سے قبل کہ یہ بجھے مکمل سفر نامہ لکھ ڈالو۔ ان کے اصرار اور ان کی ہدایت پر میں نے پورا سفر نامہ لکھا جو ''پھر سوئے حرم لے چل'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس طرح میرے اوپر ان کی بڑی نوازشیں رہی ہیں جن کی یادیں ہی اب میرا سرمایہ ہیں۔

محفوظ الرحمٰن جیسے صحافی کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک نشانِ راہ چھوڑ جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے زیر تربیت پروان چڑھنے والی صحافیوں کی نوجوان نسل ان کے اصولوں کو حرزِ جاں بنا کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرے گی اور ان کی صحافتی دیانت داری کے چراغ کو بجھنے نہیں دے گی۔

○○

باب اوّل

محفوظ الرحمٰن

اہل علم وفن کی نظر میں

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

اظہر ندوی مرحوم

(نوٹ: جناب اظہر ندوی صاحب کا یہ مضمون ان کی زندگی کا آخری مضمون ہے۔اس کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔)

محفوظ الرحمٰن مرحوم کی شخصیت میں ایک خاص جاذبیت و دلنوازی تھی، جہاں بھی ہوتے بہت جلد گھل مل جاتے اور مقبولیت بھی حاصل کر لیتے، اپنی نرم گفتاری، کشادہ روئی اور خوش اخلاقی سے وہ مشرقی تہذیب کے نمائندہ معلوم ہوتے تھے۔ چالیس برس سے زیادہ عرصہ تک ان سے تعلقات رہے لیکن میں نے انھیں کبھی غصے میں یا رکیک زبان استعمال کرتے نہیں پایا۔

محفوظ صاحب قلندرانہ مزاج رکھتے تھے اور انھوں نے کبھی مال و دولت یا جاہ ومنصب کے حصول کی کوشش نہیں کی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ان کے سامنے جتنے مواقع آئے اتنے شاید ہی اردو کے کسی صحافی کے سامنے آئے ہوں، اور کوئی دوسرا ہوتا تو ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر کروڑوں روپے کما سکتا تھا لیکن ان کی قلندری نے کبھی اس طرف تاکنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور انھوں نے پوری زندگی بڑی حد تک فاقہ مستی ہی میں گزار دی۔

محفوظ صاحب اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے اور اردو میں تو کہنا چاہیے کہ وہ ایک صاحب اسلوب صحافی تھے۔ بہترین عبارت بھی لکھتے تھے اور انوکھی سرخیاں بھی لگاتے تھے، اپنی بات کو دلنشیں انداز میں کہنے کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ اردو کے اکثر صحافی تو ان سے تعلق رکھتے ہی تھے، ہندی کے بہت سے صحافی بھی ان سے مسلسل ربط رکھتے

تھے۔ خاص طور پر مسلم مسائل پر ان سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اردو کے ''نہایت مشہور صحافی'' کی حیثیت سے ان کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے۔

محفوظ صاحب نے ملازمت کی کبھی پروا نہیں کی۔ ملازمتیں تو گویا ان کے پیچھے پیچھے دوڑتی تھیں لیکن کوئی بات خلاف مرضی ہوئی تو چھوڑنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ یہ بھی کبھی نہیں سوچا کہ کل کے کھانے کا انتظام بھی ہے یا نہیں۔ پولینڈ کے سفارتخانہ میں کام کیا، سوویت یونین کے انفارمیشن سینٹر میں رہے، روزنامہ دعوت میں رہے، روزنامہ قائد، لکھنؤ والہ آباد کی ادارت کی اور کئی ہفت روزہ رسالے خود نکالے۔ ان کی تحریروں کو شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ آخر میں راشٹریہ سہارا میں ہفتہ وار کالم لکھتے رہے۔

1970ء سے پہلے الٰہ آباد سے جب روزنامہ قائد نکال رہے تھے، الٰہ آباد میں مسلم مجلس کا کافی اثر تھا۔ کانگریسی رہنما ہیم وتی نندن بہوگنا وہیں رہتے تھے وہ آپ سے متاثر ہوئے پھر جب کانگریس میں اندرا گاندھی اور سنڈیکیٹ کے لوگوں کے درمیان تقسیم عمل میں آئی تو بہوگنا جی کانگریس کے جنرل سکریٹری ہو کر دہلی آگئے، اسی دوران پارلیمانی انتخابات آگئے۔ محفوظ صاحب روزنامہ قائد بند ہونے کے بعد ''دعوت'' میں آچکے تھے۔ بہوگنا جی نے محفوظ صاحب کو بلایا اور انھوں نے اور کملا بہوگنا دونوں نے اصرار کیا کہ کانگریس کے دفتر میں اردو کا کام سنبھال لیں۔ کملا بہوگنا نے یہاں تک پیش کش کی کہ ''دعوت'' جیسا روزنامہ جہاں سے چاہیں انتخابات کے بعد نکلوا دیں گی اور اس کے لیے جتنے روپیوں کی ضرورت ہو، اگر چاہیں تو پہلے سے ان کے نام جمع کر دیں، لیکن محفوظ صاحب کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ بس اتنا کیا کہ انتخابی منشور کا اردو میں ترجمہ کر دیا۔

اس سے پہلے جب قائد ملت ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے لکھنؤ سے روزنامہ قائد نکالا تھا، تو محفوظ صاحب بھی اس کے حلقہ ادارت میں شامل ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ ڈاکٹر فریدی کے نہایت معتمد اور مشیر ہو گئے تھے۔ بعد میں عرصہ تک قائد کی ادارت کی بدولت پورے یوپی کے مسلم مجلس کے رہنماؤں سے ان کے قریبی تعلقات ہو گئے تھے اور اکثر لوگ ان سے صلاح و مشورہ کیا کرتے تھے۔

73-1972ء میں جب یوپی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو چرن سنگھ کے بھارتیہ کرانتی دل، راج نرائن کی سوشلسٹ پارٹی اور ڈاکٹر فریدی کی مسلم مجلس کا مشترکہ سہ رخی محاذ بنا۔ اس کی تشکیل میں بھی محفوظ صاحب اور سیتا رام دویدی ایڈوکیٹ کا خاص رول رہا۔ سیتارام دویدی ہی چرن سنگھ کو آمادہ کر کے ڈاکٹر فریدی کے گھر لے آئے تھے۔

اس محاذ کو زیادہ کامیابی تو نہیں ملی لیکن چرن سنگھ سے محفوظ صاحب کے تعلقات قائم ہو گئے اور جب وہ پھر دہلی آ گئے تو چرن سنگھ نے ان کو اپنی پارٹی کے مرکزی آفس میں اہم ذمہ داریاں سونپیں۔

ایمرجنسی کے بعد جو عام انتخابات ہوئے ان میں اپوزیشن پارٹیوں کے اتحاد اور کانگریس مخالف لہر کی وجہ سے جنتا پارٹی کو جس میں بیشتر مخالف پارٹیاں شامل تھیں زبردست کامیابی ملی اور مرکز میں اس کی حکومت بن گئی۔ مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم اور چرن سنگھ وزیر داخلہ ہوئے۔ چرن سنگھ کی پارٹی اس وقت لوک دل ہو چکی تھی۔ اس کے آفس کے دیگر کارکنوں نے خوب خوب فائدے اٹھائے۔ لیکن محفوظ صاحب نے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ یوپی کونسل کے انتخابات آئے تو لوک دل کے پاس تین ممبروں کو چننے کے لیے کافی ممبروں کے بعد بھی خاصے ممبر زائد بچ گئے تھے۔ اسی الیکشن میں مسلم مجلس کے بھی گیارہ ممبر اسمبلی میں پہنچ گئے تھے۔ چرن سنگھ نے محفوظ صاحب سے کہا بھی کہ تم مجلس والوں سے بات کر لو میں اپنے زائد ووٹ تمھیں الاٹ کر دوں گا اس طرح تم قانون ساز کونسل کے ممبر بن جاؤ گے۔ مجلس کے تقریباً تمام ہی ممبر محفوظ صاحب کے پرانے جاننے والے ہی تھے، لیکن انھوں نے کسی سے کہنا گوارا نہیں کیا اور یہ موقع ہاتھ سے جانے دیا۔

اس دوران دلی کے اخباری حلقوں میں محفوظ صاحب کی اہمیت بڑھتی گئی۔ کچھ دنوں انھوں نے سوویت یونین کے انفارمیشن سینٹر میں بھی اردو کا کام کیا اور پھر انھیں پراودا کی نمائندگی کے لیے چن لیا گیا اور ٹریننگ پر ماسکو جانے ہی والے تھے کہ روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا اور محفوظ صاحب نے انفارمیشن سینٹر کی ملازمت پر ہی لات مار دی۔

پھر کچھ دنوں تک دوبارہ سہ روزہ دعوت کی ادارت سنبھالی اور آخر میں اپنا ہفت روزہ

نکالا۔ جو وسائل کی قلت کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔

کمیاں کس انسان میں نہیں ہوتیں، انسان خطاؤں کا پتلا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی محفوظ صاحب بڑے ذہین آدمی تھے اور انھوں نے صحافت کو کبھی کسب زر کا ذریعہ بنا کر ضمیر فروشی کی کوشش نہیں کی اور یہ آج کے دور میں نایاب شے ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

○○

یگانۂ روزگار

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

اعظم گڑھ کے مردم خیز خطے سے بعض اہم شخصیات اٹھیں جنھوں نے دنیائے علم و ادب اور صحافت میں اپنے دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ محفوظ الرحمٰن صاحب مرحوم و مغفور کا شمار انہی یگانۂ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے۔ وہ نصف صدی سے زائد عرصے تک اردو صحافت کے میدان میں اپنی خالص اسلامی فکر، گہری انسانی دردمندی، بصیرت اور خلوص کے ساتھ تمام تر نامساعد حالات اور مخالفتوں کے باوجود اپنے پاکیزہ اخلاقی و انسانی مشن کی شمع ہاتھوں میں لیے آگے بڑھتے رہے۔

ملکی سطح پر اپنے دور کی مجہول سیاست، سماجی ظلم و جبر اور اقتصادی ناہمواری کے خلاف اپنے قلم سے مسلسل جہاد کرتے رہے۔ بین الاقوامی سیاسی منظرنامے پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ پچھلی چھ سات دہائیوں میں امریکہ، مغربی ممالک بشمول روس اور اس کے حلیفوں نے جس طرح اسلحہ کی فروخت اور مسلم ملکوں کی اقتصادیات پر قبضہ کرنے کے لیے لاکھوں انسانوں کا بے دریغ خون کیا ہے، ان کی املاک تباہ کی ہیں اور ان کے بچوں کو مستقبل کے بھیانک اور تاریک غار میں بھٹکنے پر مجبور کیا ہے اس حشر سامانی کا بھی اس جری اور بیباک صحافی نے خوب خوب مشاہدہ کیا ہے، اکثر خون کے آنسو بہائے ہیں اور اس طرح شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اپنے دلائل کی معقولیت اور اخلاص سے دنیا کے حق پسندوں کو اپنا ہمنوا اور گرویدہ بنایا ہے۔

محفوظ صاحب کی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ دعوت کی ادارت سے ہوا۔ دعوت خود ایک نہایت ذمہ دار، حق پسند اخبار اور ذہنی انقلاب کا داعی وترجمان رہا ہے۔ کوئی ایثار پیشہ ہی ایسے کسی رزنامہ سے وابستہ ہونا پسند کرسکتا ہے۔

محفوظ صاحب جن اخباروں میں بڑی پابندی سے لکھتے رہے ہیں ان میں سرفہرست ہیں: قائد لکھنؤ، انقلاب ممبئی، قومی آواز نئی دہلی، اور راشٹریہ سہارا نئی دہلی۔

اخبار انقلاب میں تجزیہ کے عنوان سے وہ عرصہ تک کالم لکھتے رہے، اسی طرح راشٹریہ سہارا میں ان کا کالم مشاہدہ پڑھنے کے لیے کون بے چین نہیں رہا کرتا تھا۔

انھوں نے خود بھی چند جرائد نکالے، جن میں بادبان اور اپنا ہفت روزہ مشہور ہیں۔

اردو، فارسی، عربی کے علاوہ ہندی اور انگریزی پر غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔

انھوں نے چند کتابیں بھی تحریر کیں، مثلاً سرخ یلغار، جس میں افغانستان پر روسی تسلط کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ بھٹو کی کہانی جو بنگلہ دیش کے تناظر میں اہمیت کی حامل ہے۔ عراق۔ کویت جنگ، امریکہ کی جارحیت، سیاسی ریشہ دوانیوں اور بین الاقوامی پالیسی کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔

محفوظ الرحمٰن صاحب کا ذریعۂ معاش بھی ان کی صحافتی تحریریں تھیں۔ حالانکہ یہ آمدنی اتنی قلیل تھی کہ اس سے گزر اوقات بمشکل ہی ہوسکتی تھی۔ کچھ عرصہ تک وہ روس اور پولینڈ کے سفارت خانوں سے بھی وابستہ رہے۔ تاہم یہ ملازمتی سلسلہ بھی کم مدت کے لیے تھا۔ جن لوگوں نے محفوظ الرحمٰن صاحب کی تحریریں پڑھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ اب ان جیسا بالغ نظر، صائب الرائے، انصاف پسند اور حق گو صحافی شاید ہی کبھی پیدا ہو۔

اردو نثر پر ایسی غیر معمولی حاکمانہ قدرت، دلنشیں اور مدلل اندازِ بیان، پختہ اور معیاری زبان شاید انھیں پر ختم ہوگئی۔ اس لیے کہ اب تو صحافت ہی کیا، ادب میں بھی جہل اور انحطاطِ فکر و اظہار کی حکمرانی ہے۔

○○

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

جلال الدین اسلم

موت اس عالم رنگ و بو کی سب سے تلخ اور اٹل حقیقت ہے، ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور اپنا مقررہ وقت پورا کر کے کارگاہ جہاں سے رخصت ہو جانا ہے۔ اس قاعدہ کلیہ سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ جو چلے جاتے ہیں ان کی یادیں بھی رفتہ رفتہ ذہنوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ یہی اس دار فانی کا دستور بھی ہے اور غالباً رب کائنات کا منشا بھی۔ ایسا اس لیے ہے کہ یادوں کے زخموں کے مسلسل رستے رہنے کی صورت میں زندگی دوبھر بن سکتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں بھول پانا آسان نہیں ہوتا۔ انھیں ان کے کارناموں، ان کی خدمات اور ان کی جہد مسلسل کے لیے نہ صرف یہ کہ بہت دنوں تک یاد رکھا جاتا ہے بلکہ انھیں یاد رکھنے والوں کا دائرہ وسیع بھی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ کسی ایک گروہ یا نسل کی امانت نہیں ہوا کرتے۔ ایسے ہی رجل عظیم، ہمہ جہت اور بلند قامت لوگوں میں جناب محفوظ الرحمٰن بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی سوچ، اپنے عمل، اپنے اخلاص کے جو نقوش چھوڑے ہیں انہیں ان کے بعد کی نسلیں بھی اپنے لیے سرمایۂ افتخار تصور کرتی رہیں گی۔ ان جیسی نکتہ سنج، نکتہ رس، نکتہ بیں اور نکتہ شناس شخصیت کے اٹھ جانے کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلامیان ہند بالخصوص صحافی برادری اپنے کیسۂ زر کے ایک انتہائی گراں قیمت موتی سے محروم ہو گئی ہے۔

جناب محفوظ الرحمٰن ایسے مخلص اور ایسے بے باک صحافی تھے جن کی کوئی دوسری مثال ڈھونڈنے پر بھی شاید ہی مل سکے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے اور ان تمام خوبیوں سے مزین تھے

جوایک اچھے اور منجھے ہوئے صحافی بلکہ ایک بہت اچھے انسان کو دوسرے تمام لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ تعلیم وتربیت نے ان کی سوچ کو نکھارا تھا اور ان کے مزاج کو اور ان کی فطرت کو اس طرح صیقل کیا تھا کہ وہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند اور کہیں زیادہ لائق تعظیم وتکریم نظر آتے تھے۔ سنہ ستر کے سیاسی، سماجی ااور انقلابی دور میں ملک کے قد آور سیاستدانوں مثلاً وی پی سنگھ، چندر شیکھر، چرن سنگھ وغیرہ سے ان کے بہت قریبی تعلقات پیدا ہو گئے تھے، لیکن وہ مفادات کی سیاست وصحافت سے، اس کی پیدا کردہ رعونت وعفونت سے کوسوں دور رہے، وہ چاہتے تو بہت کچھ حاصل کر لیتے لیکن ان کی صحافت چونکہ ملت کے لیے تھی اس لیے ملی خدمت کے جذبۂ بے پناہ میں ہی ڈوبی رہی۔ انتہائی سنجیدہ سوچ، غور وفکر نیز معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی ان کی غیر معمولی صلاحیت کا ہی نتیجہ تھا کہ انھوں نے ہر ایک کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ ان کی فکر فلک رس ان گوشوں کا بھی احاطہ کرتی تھی جن تک دوسروں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ ان کی نگاہ دوررس سات پردوں میں مستور حقیقتوں کو بے نقاب کر دیتی تھی۔ ملک کے بٹوارے کے بعد مسلمان بڑے نازک حالات سے گزر رہے تھے، چاروں طرف مایوسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسے میں سیاسی مطلع پر امیدوں کا سورج ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی شکل میں طلوع ہوا اور لوگوں میں یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ اب ان کے دن پھر جائیں گے۔ ملت کو اندھیروں سے اجالوں کی طرف لانے میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی سوچ وفکر کو جلا بخشنے اور آگے بڑھانے میں جس بے جگری اور بے لوثی کا کردار محفوظ الرحمٰن نے پیش کیا ہے وہ قائد کے اداریے اور اس کے ادارتی صفحات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی قائم کردہ مسلم مجلس تو آج بھی کسی نہ کسی حال میں موجود ہے لیکن اس کے قائد اور ترجمان دونوں ہی نے اس دار فانی سے رخصت ہوتے وقت جونقوش چھوڑے ہیں وہ ملی سیاست اور صحافت میں اب قصۂ پارینہ بن گئے ہیں۔

محفوظ الرحمٰن مرحوم کی مجموعی زندگی مسلمانوں کے حالات زندگی سے مربوط تھی۔ وہ نوجوانی سے ہی اسلامی لٹریچر کے مطالعہ خصوصاً مولانا مودودی کی فکر انگیز تحریروں کو پڑھنے کا شوق رکھتے تھے اور مولانا کی فکر ونظر سے بہت قریب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم جماعت

اسلامی ہند کے ترجمان ''دعوت'' کے ایک عرصہ تک مدیر بھی رہے اور انھوں نے جماعت کے فکر وخیال کی جس طرح ترجمانی کی ہے وہ اپنے آپ میں مثال ہے۔ وہ جمعیۃ علماء ہند کے ہندی ہفت روزہ کے بھی بانی ایڈیٹر رہے۔ اس کے علاوہ مختلف اداروں اور سفارتخانوں میں بھی کام کیا لیکن انھوں نے اپنے موقف اور فکر ونظر سے کبھی بھی سودے بازی نہیں کی، وہ اپنے نظریے پر ہمیشہ ڈٹے رہے۔ یعنی ملت کے مفادات کے حق میں آخری دم تک سینہ سپر رہے اور درویشانہ زندگی کو ہی مطمحِ نظر بنائے رکھا۔ مرحوم نے خود اپنے بھی کئی اخبارات ورسائل نکالے لیکن ان سب کا حشر بھی وہی ہوا جو دیگر سنجیدہ اخبارات کا ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح جمعہ، اپنا ہفت روزہ اور بادبان بھی بادسموم کی زد میں آتے گئے۔

مرحوم نے زندگی کی آخری دہائیوں میں اپنی رہائش گاہ کو دانش گاہ میں بدل دیا تھا۔ لوگ جوق در جوق آتے اور ''چشمۂ رحمانیہ'' سے فیضیاب ہوتے۔ دوستوں نے ان کی رہائش گاہ کو مذاقاً ''خانقاہ'' کے نام سے موسوم کر دیا تھا، ان کا ''لنچ ٹائم'' احباب کے لیے دعوت عام تھا جسے کچھ ساتھی لنگر خانہ کہتے اور کچھ لوگوں نے اسے محفوظ صاحب کی ''دعوت شیراز'' کا نام دے رکھا تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ محفوظ بھائی کی دعوت شیراز سے اسلاف کی یاد تازہ ہوتی رہتی تھی۔ چشمۂ رحمانیہ کے ہم مشرب لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو ان کے بہت سے معاملات وخیالات سے اتفاق تو نہیں رکھتے تھے لیکن ان کے اعلام علم تلے ہی چین و اطمینان بھی حاصل کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کی محترم محفوظ الرحمٰن نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں جن صحافتی اقدار کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا ان کا محور ومرکز حقیقی معنوں میں وہ حدیث مبارک ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بہترین جہاد سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔ وہ ساری زندگی ملت کی زبوں حالی پر روتے رہے۔ اس کے غم میں ڈوبے رہے، اس کی تعمیر وترقی کے لیے قلمی جہاد کرتے رہے۔ وہ میدان صحافت کے ایسے بطل جلیل تھے جنھوں وقت کا نہ کوئی حکمراں اور نہ ہی کوئی اور اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکا۔ انھوں نے اپنی دانست میں جو بھی سچ جانا، سمجھا اسے بلا جھجک لکھا اور کہا۔ وہ اپنی تنقید میں بھی لوگوں کو صراط مستقیم دکھانے کا ہی فریضہ انجام دیتے رہے۔ ایسے بے لوث صحافیوں کی تعداد اب نا کے برابر ہے۔ انھیں

بے لوث و بے غرض لوگوں میں مرحوم کا نام نامی سرفہرست ہے۔ وہ اب ہم میں نہیں رہے لیکن میدان صحافت کے شہسوار کے طور پر ہمیشہ ہی زندہ و تابندہ رہیں گے۔ یہ سچ ہے کہ محفوظ بھائی کی وفات سے اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ٹوٹ گئی جس میں مولانا جوہر، مولانا آزاد، مولانا دریابادی، مولانا فارقلیط اور مولانا مسلم وغیرہ شامل تھے۔

محفوظ الرحمٰن اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان کا قلم ان کی شناخت تھا۔ انھوں نے جس طرح اپنی زندگی کی سنگلاخ راہوں کو اپنے ہاتھوں سے تراشا اور صحافت کی پر وقار مگر خار دار وادی میں قدم رکھا اور انتہائی معتبر، منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا وہ ہماری تاریخ صحافت کے اوراق میں چاند تاروں کی طرح ہمیشہ چمکتا دمکتا رہے گا۔

آج جبکہ شعبۂ زندگی کو تاجرانہ سوچ نے پوری طرح مسخر کر رکھا ہے اور زرد صحافت لوگوں کی رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے، مشنری صحافت کا لرزہ براندام ہونا یقیناً تعجب و حیرت کی بات نہیں۔ ایسے طوفان بلاخیز میں بھی آبروئے صحافت محفوظ الرحمٰن نے جنھوں مرحوم کہتے اور لکھتے کلیجہ منہ کو آتا ہے کبھی بھی اور کسی حال میں بھی پیشۂ صحافت کی حرمت و تقدس پر آنچ نہیں آنے دی اور نہ ہی کسی بڑی شخصیت کے سامنے اپنے قلم کو سرنگوں ہونے دیا۔

علامہ حمید الدین فراہی، شبلی نعمانی اور مولانا ابواللیث ندوی کی زمین اعظم گڑھ کے گاؤں نوناری میں پیدا ہوئے محفوظ الرحمٰن سے میرے تقریباً 45 سال پرانے تعلقات تھے، ایک عرصہ تک ہم ایک ہی کنبہ کی طرح ایک ہی گھر میں اس طرح رہتے رہے کہ بیشتر لوگ ہمیں چھوٹے بڑے سگے بھائی سمجھتے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اتنے لمبے اور طویل سفر زندگی میں ہم دونوں کے دلوں میں ذرہ برابر بھی نہ کبھی کوئی میل پیدا ہوا اور نہ ہی کوئی کھٹاس آئی۔ مرحوم، بڑے بھائی، مربی اور مرشد کا کردار اپنی زندگی کے آخری لمحات تک نبھاتے رہے اور اب ان کا یہی کردار و عمل ہم سب کے لیے مشعل راہ بھی ہے اور لائحۂ عمل بھی۔

بہرحال 12 فروری 2010 کے تعزیتی اجلاس میں یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے مرحوم کی یاد میں ہر برس میموریل لیکچر کرنے اور عالمی یوم اردو

کے موقع پر کسی سر کردہ نوجوان صحافی کو محفوظ الرحمٰن ایوارڈ برائے صحافت پیش کرنے کا اعلان کر کے مرحوم کو سچا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ اگر محفوظ الرحمٰن کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کے لیے کسی لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے تو نئی نسل کے لیے یہ عمل بھی ایک اور مفید قدم ثابت ہوگا۔ کیونکہ دن بدن نئی پیڑھی اپنے اسلاف کے کردار و عمل سے ناواقف اور دور بہت دور ہوتی جارہی ہے۔ سیاست، صحافت اور علم وادب کے میدانوں میں ہمارے اسلاف کی بے لوث خدمات کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے لیے کتابیں اور لائبریریاں ہی بہترین اور موثر ذریعہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ اللہ ہمیں عمل کی توفیق فرمائے۔ یہی مرحوم سے سچی عقیدت و محبت بھی ہے اور تقاضائے وقت بھی۔ اللہ مرحوم پر رحمتوں کی بارش کرے اور اس ملت یتیم کو نعم البدل عطا فرمائے۔ میں اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں سر کردہ صحافی جناب سہیل انجم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے محفوظ صاحب کے کارناموں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے میں انتہائی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔ آمین۔

○○

اصول پسند صحافی، اصول پسند انسان

ڈاکٹر سید احمد خاں

محفوظ الرحمٰن صاحب سے میری ملاقات تقریباً بیس بائیس سال قبل اس وقت ہوئی جب تبادلے کے بعد میں دہلی آیا تھا۔ سینئر صحافی ظفر زاہدی صاحب نے ان کا غائبانہ تعارف کرایا تھا اور ہدایت دی تھی کہ میں دہلی میں ان سے ضرور ملوں۔ میں نے پہلی فرصت میں ان سے ملاقات کی اور پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہوگیا۔ رفتہ رفتہ ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور میں ان سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ ہر ملاقات میں ان کی شخصیت کا ایک نیا چہرہ سامنے آتا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ چہرہ زیادہ پرکشش ہے یا پچھلی ملاقات میں جو چہرہ نظر آیا تھا وہ۔ بہر حال یہ ملاقاتیں رنگ لائیں اور میں اہم معاملات خصوصاً ملی مسائل اور اردو کی تحریک کے سلسلے میں ان سے مشورے کرنے لگا اور وہ بھی اپنی بیماریوں کے علاج کے بارے میں میری رائے لینے لگے۔

میں اردو کے سلسلے میں پہلے سے ہی سرگرم تھا۔ ان سے قائم ہونے والے تعلق نے اس سرگرمی میں اور اضافہ کر دیا۔ جب میں نے ان کے سامنے اردو ڈے پروگرام کی بات رکھی اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ہماری تنظیم کے سرپرست بن جائیں تو انھوں نے فوراً ہامی بھر دی۔ شاید ان کو یہ محسوس ہوا ہوگا کہ میں اپنی تنظیموں کے توسط سے جو کچھ کر رہا ہوں اس میں ریاکاری نہیں بلکہ خلوص کارفرما ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ سرپرست بن گئے بلکہ پروگراموں کی ترتیب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ لیکن ان کی یہ شرکت مشوروں اور ہدایت تک محدود رہتی۔ وہ کبھی کسی پروگرام میں شریک نہیں ہوتے۔ ہاں ایک بار ڈاکٹر

عبدالجلیل فریدی پر یادگار مجلہ شائع کیا گیا تھا اس وقت اس کے اجرا کے پروگرام میں انھوں نے شرکت کی تھی۔ باقی کسی اور پروگرام میں نہیں۔ اس وقت میں دہلی میں نیا نیا تھا اس لیے نہ تو یہاں کے معاملات سے واقف تھا اور نہ ہی لوگوں سے۔ محفوظ الرحمٰن صاحب نے اس وقت میری بڑی رہنمائی کی۔ اگر وہ رہنمائی نہ کرتے تو عام طور پر اس قسم کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہنے والوں میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں شاید وہ میرے اندر بھی آجاتیں۔ ان کی وجہ سے میں ان خرابیوں سے محفوظ رہا۔ جیسے بزرگ چھوٹوں کی تربیت اور رہنمائی کرتے ہیں بالکل اسی طرح انھوں نے میری تربیت اور رہنمائی کی۔ انھوں نے بہت سی برائیوں میں گرفتار ہونے سے مجھے بچایا۔ وہ بار بار یہ نصیحت کرتے کہ جو کچھ کرنا ہے اپنے بل بوتے پر کرو۔ یہاں پیسے دے کر عہدے اور ایوارڈ خریدنے والوں کی اکثریت ہے۔ ایسے لوگوں سے بچو۔ میں نے ان کی نصیحت پر عمل کیا اور آج میں اردو کے حقوق کی لڑائی کے سلسلے میں جو کچھ بھی بن پڑتا ہے اپنی بنیاد پر اور اپنی قوت بازو سے کرتا ہوں۔

میں نے انھیں ایک اصول پسند انسان اور اصول پسند صحافی کی حیثیت سے پایا۔ دنیاوی لالچ سے دور اور اپنے اصولوں سے انتہائی درجے تک وابستہ رہنے والا ایسا انسان میں نے نہیں دیکھا۔ وہ ان صحافیوں کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے جو مادی فائدے کے لیے دوسروں کو بلیک میل کرتے ہیں یا خبر چھاپنے کے نام پر لوگوں سے پیسے اینٹھتے اور مراعات حاصل کرتے ہیں۔ وہ اس کے سخت خلاف تھے۔ اسی کے ساتھ ان کے اندر خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اصولوں سے سمجھوتہ نہ کرنا اور خودداری پر آنچ نہ آنے دینا ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے صحافیوں کو دیکھا ہے۔ اردو، انگریزی اور ہندی کے صحافیوں کو، لیکن میں نے ایسا خوددار اور عزت نفس سے پیار کرنے والا صحافی یا انسان نہیں دیکھا۔ ان کی وفات سے جہاں بہت سے لوگوں کو دلی صدمہ پہنچا ہے وہیں میں بھی ایک سرپرست اور ایک فکری مربی سے محروم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

OO

ایسا کہاں سے لائیں

ظفر زاہدی

محفوظ الرحمٰن صاحب کی وفات حسرت آیات سے اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ٹوٹ گئی جس میں مولانا محمد عثمان فارقلیط، محمد مسلم اور جمیل مہدی وغیرہ شامل تھے۔ ان کے ساتھ ملی صحافت کا ایک روشن باب تمام ہوا۔ ان حضرات نے ملت کی سرفرازی، مسلم مسائل کو اس کے صحیح تناظر میں پیش کرنے اور امت کی آبرومندانہ زندگی کے لیے آخری دم تک قلمی جہاد کیا۔

اللہ تعالیٰ نے 'محفوظ بھائی' کو بے پایاں صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ صحافت ہی نہیں، تعلیم یا سیاست کے میدان میں بھی قدم رکھتے تو اسی طرح اپنی خداداد قابلیت کا سکہ جما دیتے۔ پولیٹکل سائنس میں ایم اے تھے، اردو کی طرح انگریزی میں بھی پورا درک رکھتے تھے۔ ڈاکٹر فریدی صاحب کے بیانات اور جلسوں کی کارروائی انگریزی میں بھی بڑی آسانی سے تیار کردیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ ملت کا درد ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو وہ اچھے خاصے مشاہرے کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر اس کے سفارت خانہ سے نکل آئے اور ''سرخ یلغار'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ شاہ فیصل کی شخصیت سے بہت متاثر تھے ان کی شہادت کے بعد ان کی حیات وخدمات پر ایک کتاب میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔

قلندر صفت، یار باش، وضعدار، روپے پیسے کے تعلق سے لاپروا، صحافت اوڑھنا بچھونا،

جیسے اللہ تعالیٰ نے انھیں اسی لیے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ بڑے بڑے مذہبی وسیاسی رہنما ان کے مشورے کے خواہاں، سیاسی امور ومسائل پر صائب رائے رکھتے تھے اور اس کا برملا اظہار کرنے میں کوئی رورعایت نہیں کرتے تھے۔ نو واردان صحافت سے لے کر بڑے صحافی بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ قلم کے بادشاہ تھے۔ آخری بیس پچیس برسوں میں لکھنے کی بجائے، بے تکلف بول کر مضمون لکھواتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے الفاظ صف باندھے کھڑے ہیں۔ تحریر رواں دواں، شستہ وشگفتہ، رعنائی ودلکشی سے معمور و لبریز۔ آج سے چالیس برس پہلے جو زبان لکھتے تھے اسے سہل کرتے جارہے تھے، کہتے تھے اب اتنی گاڑھی اردو، سمجھنے والے کتنے لوگ رہ گئے ہیں، خشک سے خشک موضوع میں ایسی دلآویزی اور کشش پیدا کردیتے کہ وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی۔ گفتگو اتنی شیریں جیسے زبان سے پھول جھڑ رہے ہوں 'وہ کہیں اور سنا کرے کوئی' ان سے لڑ کر بھی مزہ آتا تھا۔ گزشتہ پینتیس، چالیس برسوں میں بہت سے لوگوں سے ملا 'مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی'۔

میزبانی ایسی کہ گھر کے کھانے کا مزہ آجائے۔ ان کی 'دعوت شیراز' بھی بڑے سے بڑے لوگوں کی دعوت پر قربان۔ ان کے قلم کی کاٹ ایسی تھی کہ جو اس کی زد میں آجاتا تلملا کر رہ جاتا۔ ملی معاملات میں پختہ رائے رکھتے تھے اور اس سے کسی قیمت پر سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ ایک اشارے پر راجیہ سبھا کی رکنیت سے لے کر وزارت تک حاصل کرسکتے تھے۔ وی پی سنگھ نے وزیراعظم بننے سے پہلے عام انتخابات کے دوران ان کا ایک مشورہ نہیں مانا تو وہ بیچ راستے میں ان کی کار سے اتر گئے۔ مزاج میں بلا کی تمکنت اپنی صلاحیت اور خدا پر کامل بھروسہ اور توکل کی دین تھی۔ سحرخیزی کی عادت تھی، علی الصباح چہل قدمی کرتے تھے، مگر عمر کے آخری دس پندرہ برسوں میں اپنے گھر میں 'محصور' ہوکر رہ گئے تھے۔

غالباً 1968ء میں روزنامہ 'دعوت' سے روزنامہ 'قائد' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے لکھنؤ گئے تھے۔ اس وقت محمد اکرام نام کے ایڈیٹر تھے۔ کام تو 'محفوظ بھائی' ہی کرتے تھے۔ اخبار مالی بحران سے دوچار ہوا تو اس کا دفتر باقاعدہ الٰہ آباد منتقل ہوگیا۔ وہ بھی وہیں چلے گئے۔ الٰہ آباد میونسپل کارپوریشن کا الیکشن ہونے والا تھا۔ غالباً 1969ء کے اوائل سے روزنامہ

قائد وہاں سے شائع ہونے لگا تھا۔ اس وقت انھیں اخبار کا باقاعدہ ایڈیٹر بنایا گیا۔ اس وقت ان کی عمر 35-34 سال رہی ہوگی۔ وہ دونوں شفٹوں میں خبروں کا ترجمہ بھی کرتے تھے اور اداریہ بھی لکھتے تھے۔

میں نے آج تک کسی اخبار کے ایڈیٹر کو اتنی جانفشانی سے کام کرتے نہیں دیکھا۔ پالنے، پوسنے، ٹریننگ دے کر نوجوانوں کا مستقبل سنوارنے کا بھی شوق تھا، وہ ہم جیسے مبتدی اور نوآموز لوگوں کو ترجمہ کرنا بھی سکھاتے تھے۔ بال بچوں کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ حتی المقدور مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ سگریٹ سے سگریٹ جلا کر 'دھواں دھار' ترجمہ کرتے تھے۔ کبھی کچھ بچا کر نہیں رکھا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ وہ تحریک کے مردِ میدان تھے۔ انھوں نے اپنے قلم کی طاقت سے اخبار اور مسلم مجلس میں جان ڈال دی۔ الٰہ آباد کے مسلم علاقوں میں گھر گھر روزنامہ 'قائد' پڑھا جاتا تھا۔ 6 صفحات کا اخبار 15 پیسے میں فروخت ہوتا تھا۔ میونسپل کارپوریشن کے الیکشن میں چودھری چرن سنگھ کی بی کے ڈی اور راج نرائن کی ایس ایس پی سے مسلم مجلس کا انتخابی سمجھوتہ ہوا۔ الیکشن میں مجلس کے 14 کارپوریٹر منتخب ہوئے جس کی بنیاد پر ڈپٹی میئر کا عہدہ مجلس کو ملا۔

اسی دوران بھیونڈی میں بھیانک فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا جس کی رپورٹ تیار کرنے کے لیے ڈاکٹر فریدی صاحب نے 'محفوظ بھائی' کو بھیونڈی بھیجا تھا لیکن ان کی رپورٹ اخبار کے ایک سب ایڈیٹر نے اٹیچی کا تالا توڑ کر چوری کرلی۔ وہ غالباً کسی سرکاری دفتر کا کارندہ تھا۔ وہ جلد ہی حالات سے بیزار ہوکر دہلی واپس چلے گئے۔ پھر 1973ء میں یوپی اسمبلی کے انتخابات سے قبل ڈاکٹر فریدی صاحب کے اصرار پر ہفت روزہ 'قائد' چند مہینے تک لکھنؤ سے نکالا۔ لیکن یوپی کی فضا انھیں راس نہیں آئی پھر وہ دہلی کے گیسو کے ایسے اسیر ہوئے کہ بقول اقبال سہیل اعظم گڑھ کا ''ذرہ'' نیر اعظم بن کر یہیں ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں اور خامیوں کو معاف فرما کر اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

○○

محفوظ الرحمٰن صاحب کی 'خانقاہ' میں

معصوم مرادآبادی

خودغرضی، مفاد پرستی اور چیرہ دستی کے اس دور میں اگر آپ کو کوئی ایسا گہوارہ مل جائے جہاں پہنچ کر آپ یک گونہ اطمینان اور اپنائیت محسوس کرنے لگیں تو اسے "خانقاہ" نہیں تو اور کیا کہیں گے؟ ہر چند کہ اب ان خانقاہوں کا دور ختم ہوگیا ہے جہاں روحانیت اور خدا پرستی کے دریا بہتے تھے اور بزرگان دین اور صوفیاء اپنے علم وعمل سے بندگان خدا کو فیض یاب کرتے تھے لیکن اگر آج بھی آپ کی تڑپ سچی اور جذبہ پاکیزہ ہے تو ان خانقاہوں سے مشابہ کچھ نشست گاہیں ضرور ایسی مل جائیں گی جہاں بیٹھ کر آپ کو اپنا دل کھولنے کو جی چاہے گا۔ جید صحافی اور دانشور جناب محفوظ الرحمٰن کے انتقال سے سب سے بڑا خلا یہ پیدا ہوا ہے کہ اب دہلی کی اس بھاگتی دوڑتی اور بے مصرف زندگی میں کوئی جگہ ایسی نہیں بچی جہاں بیٹھ کر آپ کچھ دیر کے لیے اطمینان اور سکون کے ساتھ لذیذ چائے اور بسکٹوں کے ساتھ بے خوف ہوکر دل کی باتیں کرسکیں، کچھ سیکھ سکیں اور کچھ نئے خیالات انگیز کرسکیں۔

راقم الحروف کو محفوظ الرحمٰن صاحب کی خدمت میں حاضری کے بے شمار مواقع ملے اور ہر بار ان سے کچھ سیکھنے، سمجھنے اور انگیز کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے پرانی دہلی کی گنجان گلیوں میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کسی نمود ونمائش اور شوق شہرت کے بغیر خاموشی سے بسر کیا۔ انہیں دیکھ کر گزرے زمانے کے ان لوگوں کی یاد تازہ ہوتی تھی جو دنیا میں رہنے کے باوجود اس سے ایک فاصلہ بنا کر رکھتے ہیں ایسا ہی فاصلہ جیسا کہ آتش پرست آگ سے رکھتا ہے۔

انہوں نے دنیا سے محض ایک رسمی رشتہ ہی رکھا اور کبھی خود کو اس کی رنگینیوں، رعنائیوں اور بوقلمونیوں میں گم نہیں ہونے دیا۔ نہ کبھی ذاتی مکان خریدا، نہ گاڑی نہ گھوڑا اور نہ مصاحب۔ ہمیشہ کرائے کے مکان میں ایک مسافر کی طرح رہے اور کسی مالی بوجھ کے بغیر آخرت کا سفر اختیار کیا۔ قناعت کا عالم یہ تھا کہ انھیں پیسوں کی طلب اپنی ضروریات زندگی سے بھی کم تھی۔ اس لیے اکثر تنگدستی کا شکار رہتے تھے لیکن اس معاشی تنگدستی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے موجودہ زمانے کا ایسا کوئی حربہ استعمال نہیں کیا جس سے ان کے ضمیر یا قلم پر ضرب پڑتی۔ وہ ایک بیباک حقیقت پسند صحافی تھے۔ ان کا خمیر جہاں سے اٹھا تھا وہاں ذاتی مفادات اور انسانی خواہشوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ ملت کے مایۂ ناز قائد ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے لے کر مایۂ ناز صحافیوں محمد مسلم اور مولانا محمد عثمان فارقلیط جیسے جید صحافیوں سے اکتساب فیض کرنے والے محفوظ الرحمٰن صاحب کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ انھوں نے زندگی میں کبھی اپنے نظریات اور بنیادی عقائد سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہر چند کہ اپنی معاشی ضرورتوں کے تحت مختلف اور متضاد اداروں سے وابستگی اختیار کی لیکن اس کے باوجود اپنے بنیادی مشرب کو ترک نہیں کیا۔ راہ کی کوئی رکاوٹ، مشکل یا مصیبت ان کے قدموں میں کوئی لغزش پیدا نہیں کر سکی اور انھوں نے تمام زندگی سرخرو ہو کر گزاری۔ محفوظ الرحمٰن صاحب کی خدمت میں ہر حاضری کے وقت ادب اور احترام کے جذبات انگڑائیاں لیتے تھے۔ لیکن وہ اسے تکلف گردانتے تھے اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی پوری طرح گھل مل کر اور اپنی بزرگی اور بے پناہ تجربات کا کوئی رعب ڈالے بغیر دوستی اور شفقت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جب گفتگو کرتے تھے تو طبیعت بڑی سیراب ہوتی تھی۔

محفوظ الرحمٰن صاحب نے ایک ایسے وقت میں آنکھیں موندی ہیں جب وسیع تجربہ، زبان دانی، تحریر کے حسن اور تسلسل کے علاوہ مقصد سے وابستگی رکھنے والے صحافیوں کا اردو میں زبردست قحط پیدا ہو گیا ہے۔ آج اردو صحافت ذہن، ضمیر اور زبان کے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہے اور ان موذی امراض کا علاج ڈھونڈنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ اردو صحافت کے افق پر ایسے مجہول اور گمراہ عناصر اپنا تسلط قائم کر رہے ہیں جنھیں دیکھ کر بعض

اوقات اردو صحافت کا مستقبل مخدوش نظر آتا ہے۔ محفوظ الرحمٰن صاحب دراصل اردو صحافیوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے بڑی قربانیوں اور تمام اذیتوں کے ساتھ زندہ رہنے اور حق بات کہنے کا ہنر سیکھا تھا۔ ان کی تحریر میں جو چاشنی، دلنشینی اور تسلسل موجود تھا وہ ان کے ہم عصر صحافیوں میں صرف پاکستان کے مایۂ ناز صحافی محمد صلاح الدین کا خاصہ تھا جنھیں دہشت گردوں نے شہید کر کے ان کی بیباکی کا انتقام لیا تھا۔ راقم الحروف کو محمد صلاح الدین صاحب سے کئی ملاقاتوں کے دوران اور محفوظ الرحمٰن صاحب سے سیکڑوں ملاقاتوں کے دوران یہ احساس شدت سے ستایا کرتا تھا کہ ان جیسے جید، بیباک اور قلم کی آبرو پر جان نچھاور کرنے والے صحافی اب اردو دنیا میں کہاں پیدا ہوں گے۔ محفوظ الرحمٰن صاحب کے انتقال سے ہندوستان میں اردو صحافت کا منظر نامہ بالکل خالی محسوس ہوتا ہے۔ ہر چند کہ ابھی معدودے چند صحافی ممبئی، حیدرآباد، بنگلور، لکھنؤ، دہلی، کلکتہ، اور پٹنہ میں اس قبیل کے ضرور باقی رہ گئے ہیں، لیکن جیسے جیسے یہ فہرست مختصر ہوتی جارہی ہے، ویسے ویسے صحافت کے ہم جیسے طالب علموں کو اپنے سروں پر شفقت، محبت اور عنایت کے گھنے اور سائے دار درختوں سے محروم ہونے کا احساس بڑھتا چلا جارہا ہے۔

راستو! کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

OO

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا

ریاض قدوائی

جناب محفوظ الرحمٰن ملک کے اعلیٰ پائے کے صحافی اور مصنف ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ انھوں نے نصف صدی تک اردو زبان وصحافت کی تھکے بغیر خدمت کی اور ملی سرگرمیوں میں ایک ممتاز حرکت پذیر شخصیت کی حیثیت سے اپنا نقش چھوڑا۔ اگر ہم ان دونوں کرداروں کو ان کی ذات اور زندگی سے الگ کردیں تب بھی ایک مقناطیسی، ہردل عزیز شخصیت اور ہمدرد انسان کے طور پر ان کی تصویر دوستوں اور شناساؤں کے ذہن سے محو نہیں ہوسکتی۔

محفوظ الرحمٰن کوئی فرشتہ نہیں تھے، وہ انسان تھے، ایک انسان کی کمیوں اور خطاؤں کے ساتھ۔ لیکن ان کی شخصیت اور کردار پر، خصوصاً ان کی زندگی کے آخری تقریباً دس سالہ دور پر نظر ڈالنے کے بعد اپنے آپ سے یہ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا وہ وہی انسان تھے جس کو مولانا حالی نے فرشتے سے بہتر مانا ہے مگر جس کے بننے میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے؟ میں نے ان کو کم وبیش چالیس سال تک دیکھا، ان کی جوانی سے لے کر اس وقت تک جب پچھتر سال کی عمر میں وہ ہم سب سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ اس سانحہ سے ساٹھ گھنٹے پہلے آخری ملاقات تک ان کی ذات خاص کا اتنے قریب سے مشاہدہ کیا جتنا یقیناً ان کے گھر والوں کے سوا کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ اسی طرح ان کی تحریروں کو بھی بنظر غائر اور تنقیدی نگاہ سے دیکھتا رہا اور اس عرصہ میں ان میں جو خصوصیات پائیں ان میں سے چند یہ ہیں: احساس کی شدت،

اپنے معاملے میں بھی اور دوسروں کے لیے بھی، خصوصاً جن سے ان کو تعلق خاطر ہو۔ یہ حساس دل و دماغ ملت مسلمہ کے مسائل اور اس کے کرب کے معاملہ میں ان کی تحریروں میں بھی کارفرما رہتا تھا۔ دوسرے، خودداری اور صحافتی بیباکی۔ تیسرے ان کا تیز روذہن اور نہ تھکنے والی دماغی صلاحیت۔ ان کی فہم و فراست صرف قرطاس و قلم کے ذریعہ ہی نہیں ظاہر ہوئی بلکہ ذاتی معاملہ فہمی میں بھی ہمارے لیے عدیم المثال تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے شریک گفتگو کے ذہن کو پڑھ لیتے تھے اور اس کے مطابق دانشمندانہ گفتگو کرتے تھے۔ چوتھی خصوصیت تھی کسی بھی شخص کو اپنا گرویدہ بنا لینے والا لب و لہجہ، دھیمی آواز اور چہرے کے تاثرات۔ حالانکہ بنیادی اور اصولی سوال پر وہ جارحانہ رویہ بھی اختیار کر لیتے تھے۔

مجھے نومبر 1989ء کے انتخابات سے پہلے کے وہ دن یاد آتے ہیں جب اجودھیا میں آنجہانی راجیو گاندھی کی رضامندی سے کانگریس کے مرکزی و ریاستی اقتدار کے تحت مندر کے سنگ بنیاد (شلانیاس) کا اہتمام کیا جارہا تھا۔ محفوظ صاحب ان چند افراد میں شامل تھے جن کو بذریعہ ہوائی جہاز اجودھیا لے جایا گیا تاکہ شلانیاس کی غیر متنازعہ جگہ ہونے پر حکومت کے اصرار کو جائز ثابت کیا جائے۔ لیکن مرحوم نے ان باتوں کا کوئی اثر لینے کے بجائے ایک ایسی پراثر تنقیدی تحریر سپرد قلم کر کے فوراً شائع کرائی جو اِن کی زندگی کی یادگار تحریر بن گئی۔ سہ روزہ ''دعوت'' کا یہ اداریہ اضلاع میں فوٹو کاپی کرا کے تقسیم کیا گیا۔ حالانکہ کوئی نہیں جانتا تھا، سوائے ''دعوت'' کے عملے اور محفوظ صاحب کے ساتھیوں کے، کہ یہ تحریر کس شخص کی خامہ سوزی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے لکھا کہ جس طرح برسات کی آمد آمد پر لوگ اس کا سامنا کرنے کے لیے پہلے سے تیار ہو جاتے ہیں اسی طرح مسلمان ''اپنے چھان چھپر مضبوط کر لیں'' اور رخنوں کو درست کر لیں۔ 6 دسمبر 1992ء کی گھناؤنی واردات سے 3 سال پہلے لکھے ان الفاظ کی معنی خیزی اپنی جگہ خود واضح ہے۔ عوام سے قطع نظر متعدد اہم شخصیات جو ہندوستان پاکستان وغیرہ سے تعلق رکھتی تھیں صحافت اور ملی سیاست میں ان کے مرتبے اور عمل دخل سے واقف تھیں۔ بہرحال ان کا غیر مفاہمتی رویہ ان کو انتہائی بلندیوں پر پہنچنے سے روکتا رہا۔ ان میں ایک چیز بہت حیرت انگیز تھی کہ وہ اپنے کسی نشانے کی جانب بہت تیز چلتے چلتے اچانک لوٹ

پڑتے یعنی ''یوٹرن'' لے لیتے تھے۔

ان کے رویے بعض اوقات میرے لیے اور دوسرے کچھ قریبی افراد کے لیے ناقابل فہم ہوتے تھے۔ ایسا ایک موقع اس وقت آیا جب (مرحوم امام جامع مسجد) مولانا عبداللہ بخاری کے مقرب خاص کی حیثیت سے ان کی تصویر روزنامہ ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوئی جسے دیکھ کر بہت سے شناساؤں نے ان کو فون کیا کیونکہ یہ قربت بالکل نئی نئی تھی۔ تقریباً اسی روز سے انھوں نے امام صاحب مرحوم کی صحبت سے کنارہ کشی اختیار کر لی جو ہمیشہ برقرار رہی۔ زیادہ تر ان کی ناراضگی ذاتی اسباب کے بجائے اس وقت ہوتی تھی جب کوئی اہم شخصیت اپنے سمت سفر کے تعلق سے ان کا مشورہ قبول نہیں کرتی تھی یا اس پر عمل کرنے سے کتراتی تھی۔ بہت سے قریبی لوگوں کا تاثر تھا کہ محفوظ صاحب تنقید کو برداشت نہیں کرتے۔ یہ کافی حد تک صحیح بھی تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ خلوص دل سے کی جانے والی تنقید کا نہ صرف یہ کہ برا نہیں مانتے تھے بلکہ ایسے لوگوں کی انتہائی قدر کرتے تھے، اس سے زیادہ جتنی وہ دوسروں کی کرتے تھے۔ خود اس راقم کا اپنا تجربہ مدتوں تک یہی رہا۔ وہ نہ صرف اختلاف کو خوش دلی سے قبول کرتے تھے بلکہ متبادل راستہ بھی پوچھتے تھے۔

محفوظ الرحمٰن کی پیدائش اعظم گڑھ کی تحصیل سرائے میر کے نوناری قصبہ میں ہوئی۔ اعظم گڑھ میں ابتدائی تعلیم کے بعد الٰہ آباد اور علی گڑھ یونیورسٹیوں میں ان کی ابتدائی ذہن سازی اور شخصیت سازی ہوئی اور پھر جلد ہی ان کی بیتاب طبیعت انھیں میدان عمل میں لے آئی حالانکہ سیاسیات میں ایم اے کرنے کے بعد وہ بآسانی کسی کالج کے تدریسی شعبہ میں شامل ہوسکتے تھے۔ مرحوم محفوظ الرحمٰن نے جن کو دو سال پہلے اردو اکادمی دہلی نے بہترین صحافی کا ایوارڈ دیا تھا زائد از نصف صدی تک صحافت اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ اپنی زبان کی خدمت ہی کو شعار بنائے رکھا اور اپنی مالی حیثیت بنانے کا یا تو خیال ہی نہیں کیا یا زور قلم دکھانے میں اس کا موقع نہیں ملا۔ محفوظ الرحمٰن اس ملک کے ان معدودے چند اردو صحافیوں میں تھے جنھوں نے ہندوستان کی اعلیٰ ترین سیاسی شخصیات کے علاوہ دوسرے ملکوں کے بھی کچھ سربراہوں و رہنماؤں سے بالمشافہ تفصیلی گفتگو کر کے اس کو شائع کرایا۔ ایسے دور میں جب

موبائل فون، انٹرنیٹ اور کیبل ٹیلی ویژن جیسی سہولتیں نہیں تھیں ان کے بعض اداریوں کو ان کی اپنی کوشش سے نہیں، بلکہ ان کی لاعلمی میں سنجیدہ قارئین نے ہزاروں کی تعداد میں فوٹو اسٹیٹ کرا کے تقسیم کیا ۔وی پی سنگھ، چودھری چرن سنگھ، ایچ این بہوگنا، راج نرائن جیسی متعدد ہستیوں سے بے تکلف تعلقات، کئی ملی شخصیتوں سے قربت رکھنے والے اس شخص نے کوئی برائے نام جائداد یعنی ایک قطعہ زمین تک نہیں خریدا اور نہ کوئی بینک بیلنس اپنے لواحقین کے لیے چھوڑا، نہ اپنی اولاد کو کہیں مقام و مرتبہ دلانے کی کوشش کی۔ حالانکہ اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر مرحوم ایسا کر سکتے تھے۔ انھوں نے سیاسیات میں ایم اے کیا تھا جو کہ ان کے زمانے میں عام نہیں تھا۔ لہٰذا اپنی طبعی ہر دل عزیزی کی بدولت وہ یونیورسٹی کے شعبے میں جگہ پا کر اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اردو صحافت کی خاردار راہوں کو ترجیح دی۔ اس ملک کے باہر بھی ان کے لیے بہترین مواقع موجود تھے۔

روزنامہ ''قائد'' لکھنؤ اور اخبار ''دعوت'' دہلی کے چیف ایڈیٹر رہے۔ علاوہ ازیں ہفت روزہ جمعہ، اپنا ہفت روزہ اور بادبان جدید کی ادارتی ذمہ داری سنبھالی۔ ملک کے ارباب سیاست و قیادت کے علاوہ عالم اسلام کی متعدد اہم شخصیتوں کے انٹرویو لیے جن میں سب سے اہم اخوان المسلمین کے سربراہ ڈاکٹر عمر تلمسانی کی تھی۔ ان کے علاوہ اس فہرست میں ڈاکٹر حسن ترابی، ڈاکٹر فیض المہدی، ڈاکٹر اسماعیل فاروقی، ڈاکٹر سالم عزام سکریٹری جنرل اسلامی کونسل آف یورپ، پروفیسر عبدالرب سیاف، پروفیسر برہان الدین ربانی، جنرل ضیاء الحق، فواد صادق مفتی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، ذوالفقار اللہ، مولانا ابواللیث، چودھری چرن سنگھ، وی پی سنگھ، ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی وغیرہ سے بھی انٹرویوز کیے۔ آپ کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آئیں اور مقبول ہوئیں جن میں فیصل اعظم: حیات اور کارنامے، سرخ یلغار، کویت پر عراق کا قبضۂ غاصبانہ: حقائق اور مضمرات، کسان کا بیٹا سب کا دوست، معاہدہ عمرانی، بھٹو: دوست یا دشمن اور جدید سیاسی اصلاحات قابل ذکر ہیں۔

اردو زبان کو جنت مکانی کا ایک عطیہ یہ بھی ہے کہ ترجمے یا طبع زاد نگارش میں انھوں نے قاموس پیمائی یا لکیر کا فقیر بننے کے بجائے اپنا طرز تحریر پیدا کیا جو اودھ اور اس کے نواح کے

مخصوص مگر مروجہ محاوروں و کہاوتوں سے مزین ہے۔ایسے عوامی اسلوب سے اب اردو اور ہندی صحافت خالی ہوتی نظر آرہی ہے۔جہاں تک متن کا تعلق ہے ان کی تحریر دوسری خوبیوں کے علاوہ توازن سے عبارت تھی جس میں ہم آج بھی ہر قسم کی انتہا پسندی سے گریز، منفی اور sectarian رجحانات کی حوصلہ شکنی اور صرف مثبت فکر دیکھ سکتے ہیں۔ان تحریروں کے بے لاگ و بیباک کردار کو 6 فروری کو ان کے انتقال کے بعد سامنے آنے والی لاتعداد آراء میں سراہا گیا۔

گزشتہ بارہ پندرہ سال سے وہ تمام سرگرمیوں سے از خود کنارہ کش ہو گئے تھے اور دوستوں کے بار بار کہنے پر بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔صرف قلم سے ان کا رشتہ برقرار تھا اور لفظی معنوں میں یہ رشتہ بھی نہیں تھا کیونکہ عرصۂ دراز سے وہ خود لکھنے کے بجائے کسی کو املا بول کر لکھواتے تھے۔بولنے کی ان کی اس قدرت سے متعدد نوآموز صحافی فائدہ اٹھاتے تھے اور اپنے جریدے یا کسی اور اخبار، رسالے کے لیے تیار تحریر کی پکی پکائی ہانڈی لے کر جاتے تھے۔کئی دوسرے نوجوان صحافیوں کی خود سے لکھنے یا فیلڈ رپورٹنگ میں بخوشی رہنمائی کرتے تھے، اس طرح کہ کسی کو نہیں محسوس ہوتا تھا کہ یہ کام ان کے لیے بار ہے۔ان کے ذریعہ تربیت پائے ہوئے کئی صحافی اس وقت کثیر الاشاعت اخباروں و جرائد میں سرگرم کار ہیں اور کئی خود اپنے اخبار و جرائد کو اردو کی خدمت کا وسیلہ بنانے کے علاوہ ذریعۂ معاش بھی بنائے ہوئے ہیں۔ان میں وہ نوجوان بھی ہیں جنھوں نے مختلف اخبارات میں مرحوم کے معاون کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور دوسرے بھی ہیں۔گوشہ نشینی کا دور شروع ہونے کے بعد جب وہ تنظیموں اور تحریکوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور سخت ضرورت پر ہی گھر سے باہر نکلتے تھے، ان کے حلقۂ ملاقات میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ایک طرح سے یہ حلقہ زیادہ مختلف النوع ہو گیا تھا کیونکہ اب محفوظ الرحمٰن کسی ایک سیاسی، ملی یا اخباری ادارے کے نمائندے، کسی ایک مکتب فکر کی علامت نہیں رہے تھے۔ان کی شخصیت ہمہ گیر ہو گئی تھی۔ان کے برتاؤ اور رکھ رکھاؤ میں بھی کئی سال سے بڑی اور خوشگوار تبدیلیاں آئی تھیں جنھوں نے حالانکہ ہم دونوں کو اور زیادہ قریب کر دیا۔لیکن مزاج میں اتنی زیادہ تبدیلی بعض اوقات مجھ کو فکر مند کر دیتی تھی کیونکہ میں

نے سن رکھا تھا اور دیکھا بھی تھا کہ کسی انسان میں حلم اور بردباری، شرافت طبعی اور رواداری عموماً اس وقت غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے جب اس کا آخر وقت نزدیک آرہا ہوتا ہے اور یہ دھندلا سا اندیشہ بالکل اچانک 6 فروری 2010ء کو صحیح ثابت ہوا۔ ہم لوگوں یا اپنے گھر والوں کو کوئی مبہم سا نوٹس دیئے بغیر انھوں نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

OO

تجھ سا کہیں کسے؟

عقیدت اللہ قاسمی

محفوظ الرحمٰن یعنی نہ صرف صحافی بلکہ صحافی ساز، مربیِّ صحافت، اردو صحافت کی عظمت کا نشان وعلامت، آفاق کی بلندیوں سے آفتاب کی طرح فکر ونظر کی تابانیاں بکھیرنے والا۔ وہ ہر چیز کو ملاءِ اعلیٰ والے دل ودماغ سے دیکھتے تھے۔ اس کی تہ وگہرائی تک نظریں پہنچادیتے، جملوں کی نرالی ساخت، الفاظ کا ممتاز ونمایاں انتخاب، خیالات سب سے نرالے، ماضی کی عمیق گہرائیوں کے آئینہ میں مستقبل کی دوریوں تک رسائی رکھتے تھے۔ ان کی رہائش گاہ میں ان کے اپنے لیے مخصوص ہال کو کوئی خانقاہ کا نام دیتا تو کوئی صحافتی دانش کدہ قرار دیتا جہاں صحافیوں کی بھی آمد ورفت رہتی۔ دانشور بھی خوشہ چیں ہوتے، سیاسی لیڈر رہنمائی حاصل کرتے، سماجی مصلح وہاں سے غذا حاصل کرتے، علماء بھی استفادہ کرتے، اساتذہ بھی اکتساب فیض کرتے تھے۔

آنے والے آتے اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق کشکول بھر کر لے جاتے۔ جناب والا سب کے لیے مرجع تھے کہ ہر شعبۂ زندگی اور ہر طبقہ کے ممتاز ونمایاں افراد رجوع کرتے تھے۔ سب کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آنا بلند آہنگ قہقہے لگانا، ہر آنے والے کی خواہش ومراد پوری کرنا محفوظ الرحمٰن صاحب کا مخصوص وصف تھا۔ پہلی بار آنے والا بھی یہی تاثر لے کر جاتا کہ مجھ پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ مجھ سے سب سے زیادہ لگاؤ وتعلق رکھتے ہیں۔ ہر آنے والا یہی سوچتا میرے لیے سراپا انتظار بیٹھے تھے۔ جبکہ آپ کی عظمت ورفعت کے سامنے خود

سراپا ادب واحترام مرعوب ومبہوت بنا بیٹھا رہتا۔ محفل قہقہہ زار تھی۔ علم ودانش اور فکر ونظر کے موتیوں اور لعل وگوہر کی بارش ہوتی رہتی۔

آنے والا کسی بھی شعبۂ زندگی کا ہو اس کا عقدۂ لاینحل چٹکیوں میں حل ہو جاتا۔ خوش مزاجی وملنساری کا کوئی جواب نہ تھا۔ کتنے رسائل واخبارات ان کے دم سے رواں دواں تھے۔ ایڈیٹر صاحبان آتے فلاں موضوع پر ایک مضمون یا تبصرہ درکار ہے، کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں۔ موضوع کا ہلکا سا اشارہ مل جاتا۔ بیڈ پر کبھی ٹانگ لٹکا کر بیٹھ جاتے۔ کبھی تکیہ سے ٹیک لگا لیتے، مخصوص میز کی طرف اشارہ ہوتا اچھا چلیے کاغذ اٹھائیے قلم سنبھالیے، اور لکھیے۔ موضوع کوئی بھی ہو، عنوان کبھی بعد میں دیکھا جاتا کبھی سب سے پہلے وہی زیب قرطاس ہو جاتا۔ مربوط، مدلل، مسلسل ومنظم کلام ہوتا کہ بڑے بڑے اہل قلم کے یہاں بے ترتیبی، بیچ میں الفاظ کا چھوٹ جانا یا بے ربطی ممکن ہے محفوظ الرحمٰن املا کرا رہے ہیں معلوم ہوتا کوئی کتاب پہلے سے سامنے ہے جس سے رواں دواں پڑھے چلے جا رہے ہیں۔ نہ کہیں کوئی کاٹ چھانٹ ہے اور نہ ہی کوئی اوور رائٹنگ۔

لکھنے والا کہتا بس کافی ہو گیا نہ اختتامیہ نہ خاتمہ، اسی جگہ فل اسٹاپ ہو جاتا، کبھی کوئی دوبارہ آتا فلاں مضمون کے لیے چند سطور کی جگہ رہ گئی ہے اتنی سطریں اور لکھا دیجیے، ارشاد ہوتا آخری جملہ کیا تھا ذرا پڑھو تو ___ پیکٹ سے سگریٹ نکلتی اور سلسلہ شروع ہو جاتا۔ معلوم ہوتا خاص طور سے اس موضوع کا مطالعہ کر کے تیار بیٹھے تھے۔ کہتے بس۔ فرماتے ٹھیک ہے بس۔

بات کسی ایک موضوع یا سبجیکٹ کی نہیں، کسی بھی موضوع کی بات کیجیے۔ محفوظ الرحمٰن اس طرح لکھتے لکھاتے گویا یہ ان کا مخصوص موضوع ہے، ماسٹر ڈگری اسی سبجیکٹ پر حاصل کی ہے، یا زندگی اسی کوچۂ یاراں میں گزاری ہے۔ کیا کوئی اس موضوع کا ایکسپرٹ یا استاد علمی موتی بکھیرے گا۔

نہ کسی کا رنگ اپنایا نہ کسی کو اپنا رنگ اختیار کرنے کا موقع دیا۔ آخر محفوظ الرحمٰن جیسی قلم کی جولانیاں کوئی کہاں سے لائے، جس نے چند مضامین پڑھ لیے، چند لائن کا مطالعہ کرتے ہی پکار اٹھتا یہ تو محفوظ الرحمٰن صاحب کا لب ولہجہ ہے، کسی اور کے یہاں ان سے التباس یا اشتباہ کا

شائبہ تک ممکن نہیں۔

کہنے والے کہتے ان کی تو ہر بات میں اتنی گہرائی و گیرائی ہوتی ہے کہ ہر جملے پر پورا مضمون قلم بند کیا جاسکتا ہے۔ان کے یہاں علمی جواہرات کا لامحدود خزانہ ہوتا ہے ان کا اس دور میں کوئی بدل نہیں۔ قلم کے بادشاہ بے بدل، جس زمانہ میں بقلم خود لکھتے تھے۔ قرطاس وقلم پر اس طرح سوار ہو جاتے تھے گویا کسی اکھاڑہ میں اپنے حریف پہلوان کو پچھاڑ کر اس پر سوار ہیں۔ تبصرہ وتجزیہ ہو کہ خبر ونظر، خیالات ونظریات میں بلا کی رفعت وبلندی تھی، پستی تو چھو کر بھی نہیں گزری۔

بلدیو رائے آتے، کسی ملک کے سفارت خانہ کا خبرنامہ پیش کرتے اس کا ترجمہ لکھا دیجیے، خبرنامہ پر سرسری سی نظر ڈالی، اس کو ایک طرف رکھا، چین اسموکر تھے، سگریٹ بین انگشت یا زیر لب ہوتی۔ پتہ نہیں خبرنامہ میں کیا لکھا تھا، کیا نہیں، محفوظ الرحمٰن صاحب نے جو لکھا دیا بلدیو رائے یہی کہتے چلے جاتے میرا کام ہو گیا مجھے تو یہی چاہیے تھا، سفارت خانہ یہی چاہتا تھا اس کا مقصد ومقصود یہی ہے۔

اردو، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں کے اخبارات آتے۔ ہم جیسے نو آموز، ہیچ مداں، صغیرسن وکمسن لوگوں کے مضامین کو بھی بغور پڑھتے جب ملاقات ہوتی سیر حاصل تبصرہ ہوتا خوش آئند رہنمائی ہوتی۔ زبردست حوصلہ افزائی، گویا ایک ایک لائن پڑھتے جا رہے ہیں سب کچھ تازہ ہے، کوئی قابل ذکر بات چھوٹے گی نہیں، تربیت کا نرالا انداز تھا، کبھی کوئی منفی بات نہیں کی، کوئی تنقیص یا حوصلہ شکنی نہیں کی۔

اخبارات کا مطالعہ کب کرلیا آنے والوں کو پتہ نہ چلتا، سارے اخبارات ایک طرف لپٹے ہوئے رکھے ملتے دفتر کی میز ہمیشہ صاف رہتی صرف سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیہ کبھی جیب سے نکل کر اس کی زینت بن جاتیں۔ غضب کا حافظہ، بے بدل تجزیہ بھرپور تبصرہ، وسعت نظر، کہاں سے لائیں جسے تیرا بدل کہیں، کہنے والے نے تو اس طرح کا مصرعہ کہا تھا، لیکن یہاں تو علمی صورت حال یہی ہے۔ نہ کوئی محفوظ الرحمٰن کی تحریر کو کبھی اپنی کہہ سکتا ہے نہ ہی کوئی جاننے والا کسی اور کی تحریر کو محفوظ الرحمٰن کی تحریر کہنے کی غلطی کرسکتا ہے۔ کہاں سے

لائے گا کوئی خیالات کی وہ بلندی ورفعت، نظریات میں وہ گہرائی وگیرائی، تبصرہ وتجزیہ میں وہ تیکھا پن، جملوں کی وہ بناوٹ، الفاظ کی وہ بندش۔

آبائی وطن اعظم گڑھ کے مقامی الفاظ اس خوبصورتی کے ساتھ اپنی بنائی ہوئی مالا میں سمودیتے کہ کہیں کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوتی چاہے خود وہ لفظ کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔اس کے معنی ومطلب معلوم نہ ہوں جملہ کے درمیان اس کا مفہوم روشن وآشکارا ہوتا اور گویا دل ودماغ پر نقش ہوجاتا۔

کسی سفارت خانہ میں رہے یا کلچر ہاؤس میں یا پھر اخبارات کے دفتر میں یا پھر گوشہ نشینی۔فراخ دستی، وسعت قلبی اور کشادہ دلی ان کا شیوہ رہا، اندرونی حالات کیسے بھی ہوں رکھ رکھاؤ میں کبھی کوئی تنگ دستی کی جھلک نہ دیکھ سکا۔بیوی بچے بھی اللہ نے ایسے دیئے جو ہر آنے والے کی خاطر تواضع کے لیے بچھے، فرش راہ نظر آتے، وقت کے حساب سے چائے، ناشتہ یا کھانا ہر وقت ہر شخص کے لیے تیار ملتا، میز یا دسترخوان لگتے ماحضر کی ڈشیں وٹرے سجتیں ہر وقت دسترخوان وسیع رہا۔کھانا تیار کرنے والوں کی نفاست، سلیقہ شعاری، دانش مندی اور شائستگی اسم بامسمیٰ ہوتی ارم کا منظر ہوتا۔محفوظ الرحمٰن صاحب کی خوش مزاجی سے سب محظوظ ہوتے۔

چھوٹوں کو کبھی چھوٹا نہ سمجھا، شفقت وپیار نہیں عزت واحترام کا سلوک رہتا خورد سال اس صورت حال پر ندامت محسوس کرتے ذرا منہ لگے گستاخی کی راہ تک اپنا لیتے۔محفوظ صاحب کے روئے روشن پر کبھی شکن نہ آئی چہرہ وپیشانی کی تابنا کی کبھی گردآلود نظر نہ آئی۔مصنوعی انکساری نے بھی پر مارنے کی جرأت نہ کی تھی۔سب کچھ عین فطری اور نیچرل تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے مخصوص سانچہ میں ڈھالا تھا۔

جس بات کو حق سمجھا، ببانگ دہل کہا ولکھا۔نہ کسی سے مرعوبیت نہ کسی سے چشم پوشی نہ روگردانی، ہاں تنک مزاجی ایسی کہ کسی بڑے سے بڑے شخص کی مکھی ناک پر کبھی نہ بیٹھنے دی۔

دماغ کی ہمہ جہت دوڑ ایسی کہ کسی تنظیم کا معاملہ ہو یا کسی مجلس یا جلسہ کا بیٹھے بیٹھے پورا نقشہ تیار۔خود اسٹیج سے غائب لیکن ہر شہ نشین کا تعین اب جو دیکھے عش عش کرے کہ اس سے

بہتر نگینہ نہیں ہو سکتا۔

محفوظ الرحمٰن صاحب کے کئی معاملے نا قابل فہم ولاینحل معلوم ہوتے تھے جو نہ سمجھ میں آتے تھے اور نہ حل ہوتے نظر آتے تھے لیکن کچھ وابستگان بھی ان پر بے چینی کا احساس اور اظہار کرتے تھے۔ انہی معمولات میں ایک ان کی وفات بھی شامل ہوگئی۔ موذی شوگر اور بلڈ پریشر کی شکایت تھی، صبح سویرے ۶ بجے تکلیف محسوس ہوئی پاس ہی سو رہے فرزند ارجمند دانش رحمٰن اٹھے روز روز کی شکایتوں کی وجہ سے دونوں امراض کے چیک اپ کے لیے مشین ہر وقت پاس ہی رکھتے تھے اور ٹیسٹ وغیرہ بھی اچھی طرح کر لیتے۔ دیکھا بھالا دوا دے دی، آرام محسوس ہوا، ارشاد ہوا جاؤ سب سو جاؤ ایک نیند اور نکال لو۔ عرض کیا گیا چائے بنا لیتے ہیں جلد ہی دن نکل آئے گا، فرمایا نہیں میں بھی آرام کرتا ہوں۔ وقت مقررہ پر ساڑھے سات بجے سب ساتھ چائے پئیں گے اخبار پڑھیں گے، حکم کی تعمیل کی گئی۔ مگر سب وقت پر اٹھ گئے اور محفوظ الرحمٰن صاحب طویل آرام کے سفر پر چلے گئے، وقت مقررہ پر نہ اٹھنے پر دانش میاں کی والدہ نے کہا آج تو ابھی تک نہیں اٹھے دیکھو، ذرا اٹھاؤ۔ دانش میاں نے ہلایا ڈلایا آواز دی، وہاں صرف جسم تھا روح ملاء اعلیٰ کا سفر کر چکی تھی، جان جان آفرین کے سپرد کر چکے تھے۔

ورثاء، اہل خانہ، اعزا و اقارب ہی نہیں، تمام وابستگان اور فیض یافتگان کبھی آبدیدہ ہوتے ہیں کبھی آہیں بھرتے ہیں کبھی سسکیاں لیتے ہیں کوئی گھگی باندھ کر آہ و بکا کرتا ہے۔ اب محفوظ الرحمٰن صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے، آپ کی یادیں تو ہم سے کبھی دور نہیں ہوں گی۔ ہم کبھی آپ کو فراموش نہیں کر سکیں گے۔ طرح طرح سے یادگاریں منائی جاتی رہیں گی۔ آپ کے پڑھائے ہوئے سبق ہم دہراتے رہیں گے۔ یہ تو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم میں سے کوئی محفوظ الرحمٰن بن سکے گا تاہم آپ کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے کی حتی الامکان کوشش تو یقیناً سب ہی کرتے رہیں گے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ بہت سی خوبیاں تھیں......

○○

صحافت کا دبستان

ظفر انور شکر پوری

اس کارگہہ شیشہ گراں میں جو بھی آتا ہے اسے ایک نہ ایک دن جانا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس کا اطلاق بہر حال اور بہر صورت ہو کر رہتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس شان سے رخصت ہوتے ہیں کہ ان کی دائمی جدائی ایک نا قابل فراموش خلاء چھوڑ جاتی ہے۔ اردو کے عظیم صحافی جناب محفوظ الرحمٰن بھی ان میں سے ایک تھے۔ اردو صحافت کی کم وبیش دوسو سالہ تاریخ میں بہت کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھوں نے 50 برسوں تک اس وادی پر خار میں ثابت قدمی سے اپنے قدم جمائے رکھے ہوں اور ظالم کے سامنے اعلائے کلمۃ الحق بلند کیا ہو۔ محفوظ صاحب پچھلی صدی کی ابتدائی دہائیوں کی اس صحافت کے وارث وامین تھے جسے مشن کی صحافت کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں صحافت کے ایک اسکول آف تھاٹ یعنی دبستان تھے۔ وہ پچاس برسوں تک قلم سے چار محاذوں پر چومکھی لڑتے رہے وہ سفید پوشوں کے سیاہ کارناموں کے خلاف جہاں شمشیر بے نیام تھے، وہیں بیورو کریسی، دہشت گردی، تنگ نظری، عصبیت اور ملا کریسی کے خلاف بھی میدان میں ڈٹے ہوئے تھے، وہ اس نسل کے صحافی تھے جو پیٹ پر پتھر باندھ کر ملت کی خوشحالی کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ اسلامیان ہند کے زخموں کی تجارت کرنے والوں کی کلائیاں مروڑ دینے کی سکت بھی رکھتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے، جن کی آہ صبح گاہی اور دعائے سحر گاہی ملت کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے ہوتی تھی۔ صحافت کے میدان میں آنے سے قبل وہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں سیاسیات کے

عارضی لیکچرار تھے۔ اس زمانے میں فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی بھی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ وہ وی پی سنگھ کے ہم جماعت نیتاجی راج نرائن کے چہیتے اور چودھری چرن سنگھ کے دست راست بھی تھے۔ جب چودھری صاحب وزیراعظم بنے تو انھوں نے محفوظ صاحب کو ایک بڑے عہدے کی آفر بھی کی تھی، لیکن محفوظ صاحب نے بڑی خوبصورتی سے ان کوٹال دیا۔ انھوں نے چودھری چرن سنگھ صاحب پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام کسان کا بیٹا، سب کا دوست، تھا جو اردو حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔

آپریشن گولڈن ٹیمپل سے قبل آنجہانی وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی نے دہلی کے بے تاج بادشاہ ایچ کے ایل بھگت (سابق وزیر اطلاعات ونشریات) کے توسط سے دہلی کے کچھ اردو صحافیوں سے ملاقات کی اور یہ جاننا چاہا کہ بھنڈراں والا کی سرکوبی کے لیے اگر فوجی کارروائی کی جائے تو ملک پر اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ اردو کے صرف دو صحافیوں نے پوری قوت کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ ان میں ایک دعوت کے ایڈیٹر محفوظ الرحمٰن صاحب تھے اور دوسرے پرتاپ کے ایڈیٹر کے نریندر تھے۔

ایمرجنسی سے قبل وہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار ''قائد'' کی ادارت فرمارہے تھے۔ یہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کا اخبار تھا جنھوں نے مسلمانوں کی اپنی سیاسی پارٹی مسلم مجلس کی بنیاد رکھی تھی۔ ایمرجنسی کے دوران وہ سوویت یونین کے ترجمان سوویت جائزہ میں بھی کچھ عرصہ تک رہے۔ پولینڈ کے سفارتخانہ میں بھی مترجم کی حیثیت سے رہے اور سرکاری پرچہ ایمپلائمنٹ نیوز کے لیے بھی کام کرتے رہے۔ افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام سرخ یلغار تھا۔ یہ کتاب ملی حلقوں میں ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوئی تھی۔ جماعت اسلامی ہند کے ذمہ داروں نے اس کتاب کے حوالے سے کہا تھا کہ محفوظ الرحمٰن نے اس کتاب کو شائع کرکے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے اخبارات ورسائل بھی نکالے جن میں ہفت روزہ جمعہ، اپنا ہفت روزہ اور بادبان جدید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ کبھی کبھی قلمی نام ابودانش کے نام سے بھی مضامین لکھتے تھے۔

اپنا ہفت روزہ کا بابری مسجد نمبر اور خیانت نمبر بہت مقبول ہوئے تھے۔ جبکہ بہار کی

غربت بے روزگاری اور بہاری مزدوروں کی تذلیل وتوہین پر بادبان جدید کا خصوصی شمارہ شائع کیا تھا، جس میں لالو پرساد یادو، جگن ناتھ مشرا، جابر حسین اور حکم دیو یادو سمیت دو درجن سیاسی رہنماؤں کے انٹرویو شائع ہوئے تھے۔ اسی طرح بھاگلپور فساد کی رپورٹ نہ صرف شائع کی بلکہ اس کے کلیدی مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے بھی اپنی پوری قلمی توانائی صرف کرتے رہے۔ شاہ بانو کیس کے فیصلے نے اسلامیان ہند کو ایک پلیٹ فارم پر آکر احتجاج کرنے کی راہ ہموار کی تھی، یہ مقدمہ ہندوستانی مسلمانوں کی بدنصیبی کی علامت کے طور پر صدیوں یاد رکھا جائے گا۔ اس معمولی مقدمے نے اسلامیان ہند کی سمت سفر کو تبدیل کردیا۔ اس کے بعد ہی بابری مسجد کا تالا کھلا اور سات سال کے اندر ظالموں نے مسجد کو شہید کردیا۔ پھر ملک کے کئی حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور اس کا سلسلہ گجرات کی نسل کشی پر منتج ہوا۔

شاہ بانو کیس کی پیروی بیرسٹر مسٹر دانیال لطیفی نے کی تھی۔ یہ دہلی کے بہت سینئر وکیل تھے، آزادی سے قبل ممبئی میں مسلم لیگ کے قائد محمد علی جناح کے پی اے تھے۔ آزادی کے بعد مسلم لیگ سے الگ ہوکر سپریم کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ شاہ بانو کیس میں ان کا نام اخباروں میں سرخیوں میں آگیا تھا۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ملک گیر تحریک چلائی اور راجیو گاندھی کے عہد حکومت میں بڑی عجلت میں ایک ایسا ایکٹ پاس ہوگیا جس میں کئی خامیاں رہ گئی تھیں۔ اس میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ طلاق اور خلع کو ایک ہی زمرے میں رکھ دیا گیا تھا، جبکہ شرعی اعتبار سے دونوں کی حیثیت الگ الگ ہے۔ خلع عورت اپنی مرضی سے لیتی ہے جبکہ طلاق مرد اپنی مرضی سے دیتا ہے۔ محفوظ صاحب نے اس خامی کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کو بھی عوام کی عدالت میں کھڑا کردیا۔ علماء کی بہت بڑی تعداد اس بات کے لیے محفوظ صاحب سے کبیدہ خاطر ہوگئی تھی لیکن انھوں نے اس کی بالکل پروا نہیں کی۔ وہ ملت کی زبوں حالی کے لیے ملی قیادت کو ہی ذمہ دار ٹھہراتے رہے اور اسے ہی سارے مسائل اور مصائب کی جڑ مانتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ یہی لوگ عام مسلمانوں کو اقتدار کی ڈولی کا کہار بنائے ہوئے ہیں۔

اس واقعہ کے تقریباً 9 سال بعد تبدیلی مذہب کے حوالے سے جسٹس کلدیپ سنگھ کا فیصلہ

آیا تھا، جس میں عرضی گزار سرلا مدگل نے اسلام قبول کر کے دوسری شادی کرنے پر غیر مسلموں پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس فیصلے کے خلاف مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بھی اور دیگر مسلم تنظیموں نے بھی عدالت میں جانے کا فیصلہ کیا تھا، محفوظ صاحب نے اس فیصلے کے تعلق سے بھی ایک نمبر شائع کیا تھا جس میں دانیال لطیفی، پروفیسر طاہر محمود، مشتاق احمد ایڈووکیٹ، ڈاکٹر منظور عالم، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید نظام الدین، قمر کاظمی، مولانا شفیع مونس، ای احمد سلطان صلاح الدین اویسی، ظفریاب جیلانی، مولانا سید محمد ولی رحمانی، مولانا سید اسعد مدنی، غلام محمود بنات والا اور ابراہیم سلیمان سیٹھ جیسے اکابر علماء و سیاستدانوں کے انٹرویو شائع کیے تھے۔ وہ خود کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ بیماری اور عمر کی وجہ سے گھر پر ہی رہتے تھے اور اپنے ہاتھ سے کوئی مضمون بھی نہیں لکھتے تھے بلکہ اپنے معاونین سے تحریر کرواتے تھے۔ راقم الحروف 12 سال تک ان کا محرر رہا ہے اور مذکورہ بالا تمام لوگوں کے انٹرویو بھی اسی نے لیے تھے، ان کے کام کرنے کا ڈھنگ بھی نرالا تھا، پہلے سوالنامہ تیار کرتے اور اسے کچھ سیاستدانوں، کچھ علماء، کچھ ماہرین آئین وقانون اور کچھ دوسرے ماہرین کے پاس انٹرویو کے لیے بھیجتے تھے، بادبان کے ایک ایک شمارے میں 50 سے لے کر 100 لوگوں کے انٹرویو شائع ہوئے تھے۔

دانیال لطیفی صاحب سے انٹرویو کے دوران ایک حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا تھا کہ انھوں نے اپنی ان تمام باتوں سے رجوع کر لیا تھا جو شاہ بانو کو نان نفقہ دلوانے کے سلسلے میں انھوں نے کہی تھیں یا جس کی پیروی کر رہے تھے، وہ خاصے مذہبی نظر آنے لگے تھے، ویسے دلوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے ان کی شکل دیکھ کر محمد علی جناح ضرور یاد آتے تھے، کیونکہ وہ بھی جناح صاحب کی طرح بالکل دبلے پتلے اور لمبے تھے۔

محفوظ صاحب کے دوستوں اور شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ اعظم گڑھ کے نوناری گاؤں کے رہنے والے تھے اور دہلی کے چتلی قبر علاقہ میں کئی دہائیوں سے مقیم تھے۔ سینئر صحافی سعید سہروردی، جلال الدین اسلم، نفیس احمد، ریاض قدوائی، جاوید حبیب اور مولانا اظہر ندوی سے بڑی قربت تھی۔ جبکہ فاروق ارگلی، ماجد رمن، حاجی انیس دہلوی، قاری محمد

میاں مظہری، سلیم شیرازی، اور معصوم مرادآبادی جیسے صحافی انھیں احتراماً استاد کہتے تھے۔ سہیل انجم، ظفر زاہدی، عقیدت اللہ قاسمی، جمیل انصاری اور ظفر انور (راقم) جیسے سیکڑوں صحافیوں کی انھوں نے تربیت فرمائی تھی۔ علماء میں مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا ولی رحمانی، مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، مولانا فضیل احمد قاسمی، مولانا ابواللیث اصلاحی وغیرہ سے ان کے بڑے قریبی مراسم تھے۔ جبکہ مولانا مسعود خاں سابق ایم پی ان کے چچازاد بھائی تھے۔

محفوظ صاحب کا مقابلہ کسی سے نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح گوپال متل پوری زندگی ہی ترقی پسندوں سے لوہا لیتے رہے اسی طرح محفوظ صاحب بھی اکیلے بے ضمیر مسلم قیادت سے لڑتے رہے جو ایثار وقربانی کے حقیقی مفہوم تک سے نا آشنا تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور انھیں خلد بریں میں مقام ممتاز عطا کرے۔ آمین۔

OO

وہ اس مہیب رات میں سحرِ ہلال تھا

بدر کاظمی

کسی ایسی شخصیت پر لکھنا جس سے ذاتی اور دلی تعلق رہا ہو ایک مشکل امر ہے۔ محفوظ بھائی کے تعلق سے لکھتے وقت کچھ ایسی ہی پریشانی کا سامنا ہے۔ تیس پینتیس سال سے زیادہ مدت تک جس شخص کے ساتھ رفاقت وقربت رہی ہو، اس کے بارے میں زبان کھولنا آسان نہیں ہوتا۔

محفوظ الرحمٰن صاحب ایک عظیم دانشور، مدبر و مفکر، ایک صاحبِ طرز ادیب، کہنہ مشق صحافی اور بلند پایہ، خوش عقیدہ اور باصفا انسان اور ایک مشفق و مربی بزرگ اور ایک صاحب فہم وفراست محبّ دوست تھے۔ جس شخصیت میں اتنے گونا گوں پہلو اور موتی کی طرح بے شمار پرتیں پائی جاتی ہوں اس کے بارے میں آسانی کے ساتھ، قطعیت کے ساتھ کوئی آخری بات نہیں کہی جاسکتی...... وہ فطرتاً ماضی پرست تھے لیکن حال سے ان کا تعلق اتنا گہرا اور شعوری تھا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے ذہنی محسوسات میں کسی قسم کی کہنگی اور فرسودگی آئی ہو۔ ''عہد کہن سے ڈرنا کیا'' کے زیر عنوان وہ پاپوش کلچر والوں کو حالات سے پنجہ آزمائی کرنے اور نئے افکار وخیالات کو جاننے سمجھنے اور اس سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیتے رہے۔

محفوظ الرحمٰن صاحب کی عملی، سیاسی، صحافتی، اور علمی زندگی کا آغاز بڑے ہی متلاطم اور لرزہ خیز زمانے میں ہوا تھا۔ 1960ء سے 64-1963ء کے بھیانک فرقہ وارانہ فسادات میں

مسلمانوں کی ہمہ گیر تباہی اور ہلاکت کے خوفناک واقعات پیش آئے تو یہ نوجوان مجاہد اپنے قلم کو تلوار بنا کر مدافعت و چارہ سازی کے لیے میدان عمل میں آ کھڑا ہوا۔ باہمی اختلاف وانتشار اور ذہنی اذیتوں سے کمزور بے حال، منتشر ملّت کی شیرازہ بندی کی خاطر جوش و ہمت کے ساتھ جدو جہد وکوشش میں مصروف ہوگیا۔ سارے ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کو اس نے لکھنؤ میں جمع ہوتے دیکھا، جن میں ڈاکٹر سید محمود، قائد ملت ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، حبیب احمد، ملا جان محمد، الحاج اسمٰعیل صاحب، مولانا ابواللیث ندوی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد مسلم، مولانا علی میاں ندوی...... بقول محفوظ بھائی ''ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں کا پورا مزاج روح عصر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ماضی کی کوکھ سے باہر نکل آیا ہے''۔ اور پھر محفوظ الرحمٰن نے قلم تھام لیا اور ان سے اپیل کی کہ وہ باہمی مناقشوں اور جھگڑوں کو بھول کر مسلمانوں کی آبرومندانہ زندگی کے واحد مقصد پر متحد ہو جائیں اور تاریخ کے ان نازک لمحات میں رہنمائی کے بھولے ہوئے فرض کو انجام دیں۔

انھوں نے مسلمانوں اور مسلم رہنماؤں سے بجا طور پر توقعات وابستہ کیں کہ وہ نازک صورت حال اور تجربات سے سبق لے کر اس ہمہ گیر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار وکمربستہ ہو جائیں گے جو ایک خونخوار اژدہے کی مانند ان کی جانب رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ انھوں نے آزادی کے بعد خلافت تحریک کے خطوط پر مسلم مجلس مشاورت کے نام سے ایک نئی تنظیم کھڑی ہوتی دیکھی جس کے نتیجہ میں ملک بھر میں جہاں مسلمانوں کو ایک امید کی کرن نظر آئی تو دوسری طرف برادرانِ وطن کی بڑی تعداد نے اس تحریک کا گرم جوشی سے استقبال کیا...... لیکن واحسرتا کانگریس نے نقب زنی کی، جمعیۃ علماء نے اپنی تاریخ دہرائی اور متاع کارواں جاتا رہا...... مشاورت جلد ہی باہمی تضاد واختلافات کا شکار ہو کر بکھرنے لگی اور ڈاکٹر فریدی علیہ الرحمہ اس آشیانے کو جلتے ہوئے دیکھنے کے لیے تنہا رہ گئے۔ مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور ایک سیاسی تنظیم مسلم مجلس قائم کی اور محفوظ الرحمٰن صاحب نے مجلس کے ترجمان روزنامہ ''قائد'' کی ادارت سنبھالی...... اس کے بعد وہ ایک عرصہ تک روزنامہ دعوت سے وابستہ رہے اور پھر انھوں نے کئی رسالے نکالے۔ گزشتہ دس بارہ برسوں سے روزنامہ

انقلاب بمبئی اور روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی میں بطور کالم نگار 6 رفروری 2010ء یوم وفات تک لکھتے رہے۔ گزشتہ چالیس برسوں میں ان کے قلم سے جو کچھ بھی نکلا ہے شاید ہی کبھی یکجا ہو کر سامنے آسکے لیکن ان چالیس برسوں میں ان کے قلم کی کاٹ اور تحریر کی دھار میں ذرّہ برابر فرق نہیں آیا، وہ انگریزی میں پڑھتے، مسلسل پڑھتے اور اردو میں لکھتے تھے۔ وہ ہر موضوع پر اس کے فنی، ادبی، اخلاقی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور قانونی نکات کے باریک سے باریک پہلو پر نظر رکھتے اور دلائل و براہین کے ساتھ لکھتے۔ ان کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا، انھیں ہندی، اردو، انگریزی اور فارسی پر یکساں عبور حاصل تھا، ان کا لہجہ حیرت ناک طور پر اتنا یکساں اور اتنا ہموار ہوتا کہ کبھی بھی پستی و بلندی کا فرق پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اردو میں ایک طرز خاص کے موجد اور ایک مخصوص لہجے اور شریفانہ مہذب اسلوب کے مالک تھے۔ وہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، زندگی بھر ''مسلمان'' رہے، اور مسلمانوں کا درد لیے ہوئے ایک بے قرار روح کی مانند زندگی بھر اپنے درد کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے اور صحرا میں اذان دینے کا فریضہ انجام دیتے رہے......

''ہم سے ملیے ہم ہیں بادشاہ گر'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

> ''بادشاہ گر، کتنی دلکش، کتنی سرور انگیز اور کتنی نشہ آور ہے یہ اصطلاح! اور جب یہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے استعمال کی جائے جو زندگی کی دوڑ میں سب سے پچھلی قطار میں کھڑے ہیں جو عملاً کاسہ بدست ہیں، جو صاحبانِ اقتدار کی طرف سے مراعات کی شکل میں اچھالے جانے والے بھیک کے ٹکڑوں کو لپک لینے کو حاصل حیات سمجھتے ہیں، تو یہ اصطلاح کتنی زیادہ عبرت انگیز اور نشتر زنی کی حد تک مضحکہ خیز ہو جاتی ہے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس رخ سے دیکھا جائے تو مسلمان جسے کچھ لوگ بادشاہ گر کہتے ہیں اس کی حیثیت گزشتہ 61 برسوں میں اقتدار کی پالکی ڈھونے والے مزدوروں سے کبھی زیادہ نہیں رہی ہے، یہ کبھی ایک پارٹی کے، کبھی دوسری پارٹی کے، کبھی

تیسری پارٹی کے لوگوں کو اقتدار کی پالکی میں بٹھا کر ایوانِ اقتدار کے دروازے تک پہنچاتا رہا ہے جس کا معاوضہ اسے کچھ مراعات اور ڈھیر سارے خوش کن وعدوں کی شکل میں ملتا رہا ہے۔ اب تک اس نے یہی کچھ کیا ہے...... مسلمان بادشاہ گر ہو، یا نہ ہو وہ اس حیثیت میں ضرور ہے کہ ملک کے نظم ونسق میں، ملک کے سیاسی منظر کی تشکیل میں اس کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کو دوسروں کی طرح اپنی تنظیم قائم کرنے اور اس تنظیم کے سہارے انتخابات میں حصہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ وہ ووٹ دیتے رہنے کے بجائے اپنے لیے ووٹ مانگنے والا بھی بن سکتا ہے اور اسے بننا چاہیے...... اب یہ طے کرنا مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ بادشاہ گر کہلانے کے جھوٹے نشہ کے زیر اثر ذلت ومسکنت کی زندگی جیتے رہیں گے یا حقائق کی ٹھوس زمین پر اپنے پاؤں جمانے اور اقتدار کی پالکی کا کہار بنے رہنے کے بجائے اس پالکی میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کریں گے...... یاد رکھیے جو کاسہ بدست ہوں انھیں ہمدردی تو مل سکتی ہے برابری کا درجہ اور عزت کی زندگی نہیں مل سکتی، وہ لوگ (مسلمان) جو مختلف جماعتوں کے ٹکٹ پر چناؤ میں کامیاب ہوتے ہیں ان کی اوّلین ترجیح ان کی اپنی پارٹیاں ہوتی ہیں (نہ کہ مسلمان) اور دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے''۔

اسی طرزِ فکر پر مبنی ان کے مختلف مضامین ''مسلمانوں کے یہ ناصحان مشفق''، ''جاگ مسافر بھور بھئی''، ''غریب کی جورو سارے گاؤں کی بھاوج''، ''مسلمانوں کی سیاسی جماعت امکان اور اندیشے''، ''ضرورت نئے سیاسی تجربے کی''، ''ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں'' جیسے لاتعداد مضامین انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح احوال اور سیاسی صف بندی پر تحریر کیے...... وہ آخری وقت تک مسلمانوں کے اتحاد واتفاق اور تنظیم کی ضرورت پر زور دیتے رہے تو دوسری طرف ان کے جملہ مسائل پر مدبرانہ بحث اور پُر مغز تحریریں اس بات کی شاہد

ہیں کہ وہ ادب وصحافت پر اخلاق وضمیر کی روشنی قائم رکھنے کے نہ صرف خواہشمند اور دعوے دار رہے ہیں بلکہ انھوں نے اس کے تحفظ وبقا کے لیے بڑے بڑے دستار فضیلت والوں کی ناراضگی اور خطرات جھیلے اور نقصانات اٹھائے، آزمائشوں کو دعوت دی اور آزمائشوں سے کامیاب نکلے لیکن فکر وعمل، ادب وصحافت دین وسیاست کی الگ الگ دنیاؤں میں اخلاق وکردار، ایمان وصداقت کی مشعل کو بجھنے نہیں دیا۔ انھوں نے زندگی بھر قلم کی عظمت وعصمت کی حفاظت کر کے نسل نو کو یہ پیغام دیا کہ قلم اگر تلوار سے تیز نیزے سے زیادہ آبدار اور تیر سے زیادہ خونچکاں نہ ہو تو اس کو ہاتھ میں لینے کی ہمت نہیں کرنی چاہیے۔ اے کاش! وہ ابھی دنیا میں رہتے اور اپنے تجربات ورہنمائی میں اس نسل وعہد کی اصلاح کا فریضہ انجام دیتے...... لیکن مشیت کا فیصلہ یہی تھا...... محفوظ بھائی اب ہمارے درمیان موجود نہیں رہے تو بھی انھوں نے آنے والی نسلوں کے لیے تنِ تنہا اتنا مواد فراہم کر دیا ہے جو ان کے وقیع تر مطالعہ اور تجربات کا نچوڑ ہے۔ اسے جس حد تک بھی یکجا کر دیا جائے تو وہ کسی عہد اور کسی حالت میں فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ وہ لافانی ہیں...... وہ مر نہیں سکتے......

وہ اس مہیب رات میں سحر ہلال تھا

OO

ایک درویش صفت صحافی

محمد عارف اقبال

زندگی کی طویل پُر خار راہوں پر شانِ بے نیازی سے انتھک سفر کرنے والے محفوظ الرحمٰن کی شخصیت عسر اور یُسر کا مرقع تھی۔ ان کی ظاہری زندگی اگرچہ عسر کا شکار رہا کرتی تھی لیکن فکری و ذہنی اعتبار سے ان میں یسر کی شان نمایاں تھی۔ وہ ایک عام صحافی نہ تھے بلکہ ان کا شمار اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی میں ہوتا ہے جس میں مولانا محمد عثمان فارقلیط، محمد مسلم، سلیمان صابر اور جمیل مہدی وغیرہ تھے۔

آزادی، روشن خیالی اور روشن ضمیری محفوظ الرحمٰن کی شخصیت کے اہم اجزا تھے۔ وہ تاحیات بیباک صحافی رہے لیکن ان کی صحافتی زندگی دانشوری سے مشروط تھی۔ معاملاتِ زندگی میں ان کا اپنا نقطۂ نظر تھا جس کی پاسداری عمر بھر کرتے رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ درویشی وقلندری ان کے حصے میں آئی۔ وہ عام صحافیوں کی طرح بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے قائل نہ تھے کیونکہ ''ملت فروشی'' سے انھیں شدید نفرت تھی۔ وہ حق آشنا تھے، تاعمر حق کی تلاش میں رہے اور بالآخر حق الیقین کے ساتھ حق تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔

محفوظ الرحمٰن کی پُر آشوب زندگی میں وہ لمحہ یقیناً ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا جب ان کے ضمیر اور حق شناسی نے انھیں آواز دی اور ''سرخ یلغار'' لکھ کر وہ سرخرو ہوگئے۔ وہ دور ایسا تھا کہ وہ اپنی ذہانت اور صلاحیتوں سے اپنی پُر آشوب زندگی کو خوشگوار بنا سکتے تھے۔ لیکن حمیت اور خودداری کے سبب ظالموں کا ساتھ دینا گوارا نہ کیا۔ سوویت یونین کے حملۂ افغانستان نے

انھیں مضطرب کر دیا۔ حکمراں کی ساحری سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوتا وہ بھی سپر پاور کی ساحری سے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے وقت میں زہد و تقوئ سے مرصع افراد کی بھی پالکی رکھی رہ جاتی ہے اور وہ بے بسی سے ٹک ٹک دیدم کے مصداق نظر آتے ہیں۔ لیکن محفوظ الرحمٰن دل کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کے ان اشعار کا بھرپور ادراک رکھتے تھے کہ:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
جینا وہ کیا جو ہو نفس غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے!

محفوظ الرحمٰن نے اخبار سہ روزہ دعوت، نئی دہلی کی ادارتی ذمہ داری 1982ء میں سنبھالی۔ معروف و ممتاز صحافی محمد مسلم بھی اس اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ محفوظ الرحمٰن ایک منجھے ہوئے صحافی تھے، لہٰذا اس کے معیار کو بہتر رکھنے اور نکھارنے میں وہ ہمہ دم کوشاں رہتے۔ وہ اپنی وضع داری اور خوش اخلاقی میں ہمیشہ نمایاں رہے۔ وہ اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کی طرح اپنے ''نام نہاد ہمدردوں'' سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے، کینہ و بغض سے وہ کوسوں دور رہتے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی عزیمت کے ساتھ اخلاق و کردار کی پختگی ان کی نمایاں خصوصیت تھی۔

محفوظ الرحمٰن صاحب صحافی ضرور تھے لیکن ان کی تحریروں میں عامیانہ صحافتی رنگ ڈھونڈنے سے بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی ہر تحریر میں فکر و دانش کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ وہ لفظ کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کرتے۔ لہٰذا بعد کی تحریروں میں ان کی زبان ذرا سہل ہوگئی تھی کیونکہ نئی نسل کی دشواریوں کو وہ بخوبی محسوس کرتے تھے۔ آخری ایام کے چند برسوں میں انھوں نے بوجوہ لکھنا ترک کر دیا تھا اور اپنے مضامین وہ فی البدیہہ املا کرایا کرتے تھے۔

مرحوم کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے چھوٹوں اور مبتدیوں پر دست شفقت رکھتے اور انھیں محترم تصور کرتے۔ وہ اپنے سے آدھی عمر کے افراد کے مشوروں کو بھی قدر کی نگاہ سے

دیکھتے۔ دین وملت کے ہر کام میں تعاون اور حوصلہ افزائی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ خود نام ونمود سے پیچھے ہی رہتے، البتہ دین وملت کے لیے کام کرنے والے ہر ذرّہ کو آفتاب سے کم نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی ان کا گرویدہ تھا، کیونکہ وہ ہر مسئلہ کا صحیح اور عملی حل تجویز کرتے، مسائل کو کبھی الجھانے کی کوشش نہیں کرتے۔

اللہ رب العزت مرحوم کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین!

○○

ایک بے باک صحافی

حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی

میرے گاؤں ہمئی پور کے قریب واقع موضع نوناری، ضلع اعظم گڑھ میں 4 جنوری، 1938ء کو پیدا ہونے والے محفوظ بھائی سے میری پہلی ملاقات دفترِ دعوت، سوئیوالان، دہلی میں 1973ء کے اوائل میں ہوئی۔ اس وقت وہ جناب محمد مسلم کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے اس روزنامہ کے معاون مدیر تھے۔ میرا تقرر IHMMR، تغلق آباد کے کینسر ریسرچ یونٹ میں نومبر 1972ء میں ہو چکا تھا۔ ملاقاتوں کا سلسل 1974ء تک جاری رہا، کیونکہ میں 1975ء میں سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی اور اب سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے لٹریری ریسرچ یونٹ، علی گڑھ بحیثیت ریسرچ اسسٹنٹ چلا گیا، پھر پٹنہ اور حیدر آباد ہوتے ہوئے 1986ء میں دوبارہ دہلی مراجعت کے بعد جب ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو وہی نرم و شیریں لب ولہجہ، وہی مشفقانہ اندازِ تخاطب، چہرے پر متانت اور آنکھوں میں ذہانت و فطانت کا سمندر عین فطری انداز میں موجزن پایا۔ محفوظ بھائی کے مزاج میں جو شائستگی تھی وہ ان کی اعلیٰ تہذیب وتمدن کی علامت بن گئی تھی۔ ہمنشینوں کو اپنے افکار و خیالات سے متاثر اور قائل کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ بعینہ اپنی تحریروں کے گہرے نقوش قارئین کے دلوں پر بلا تکلف چھوڑتے چلے جاتے تھے۔

الہ آباد یونیورسٹی سے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے صحافتی سفر کا

آغاز کیا تو 44 سال تک نہ تعطل پیدا ہوا اور نہ پائے استقامت میں تزلزل آیا، نہ کسی شخصیت سے مرعوب ہوئے اور نہ نامساعد حالات کے تحت قلم کی حرمت اور فکر ونظر کی آزادی پر آنچ آنے دی۔ روزنامہ قائد (لکھنؤ، الہ آباد)، روزنامہ دعوت (سہ روزہ ایڈیشن) کے مدیرِ اعلیٰ رہنے کا شرف حاصل رہا۔ علاوہ بریں ہفت روزہ جمعہ اور اپنا ہفت روزہ کے علاوہ ماہنامہ بادبان کی ادارتی ذمہ داریاں بھی بڑی خوبی کے ساتھ نبھائیں۔ اردو اور انگریزی پر یکساں عبور رکھنے والے اس آزاد قلم صحافی کو ہندی زبان پر بھی دستگاہِ کامل حاصل تھی، چنانچہ پولینڈ کے سفارت خانہ میں دو سال تک ہندی مترجم کی حیثیت سے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ کم وبیش ایک درجن کتابیں اس پر مستزاد ہیں۔

یوں تو محفوظ بھائی کا رہوارِ قلم تاعمر رواں دواں رہا اور مختلف ملکی وغیر ملکی مسائل پر گہر افشانی کرتا رہا تاہم آخر میں انھوں نے ملی مسائل کو اپنی فکر کا محور بنالیا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اللہ کی رضا اور فکرِ آخرت دامنگیر ہوگئی ہے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا میں ان کے خصوصی مضامین کے علاوہ 'مشاہدہ' کالم میں فکر انگیز مضامین قاری کے ذہن ودماغ پر گہرا اثر چھوڑ جاتے تھے، چنانچہ 23 جنوری، 2009ء بروز جمعہ کی اشاعت میں 'ضرورت نئے سیاسی تجربے کی' کے زیرِ عنوان آپ کے رشحاتِ قلم اپنی مثال آپ بن کر ابھرے، اس میں مسلمانوں کی جس شبیہ کی رونمائی کی گئی تھی اس سے متاثر نہ ہونا، کسی اہلِ دل کے بس کی بات نہیں۔ پھر نصف صدی گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں کی جوں کی توں حالت زار کی عکاسی دوسری قسط میں بڑے درد انگیز انداز میں کی گئی ہے، جو 30 جنوری 2009ء بروز جمعہ کے شمارہ میں شائع ہوئی۔

30 جولائی کے راشٹریہ سہارا میں ''مشاہدہ'' کالم میں مسلم ممالک میں ملازمت کرنے والے مسلمانوں کی زبوں حالی کا دردناک نقشہ کھینچتے ہوئے اسے عالمِ اسلام کے لیے انتہائی ذلت آفریں اور باعث شرم المیہ قرار دیا تھا جس کی ستائش میں راقم نے اپنے تاثرات 6 اگست کو بذریعہ ای۔ میل ارسال کیا تھا۔ اسی طرح 16/اگست کو ان کا ایک مضمون ''نگاہ انتخاب'' شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے عالمی قیادت کی حامل ملت کے بانجھ ہوجانے پر

بڑے گہرے دکھ اور درد کا اظہار کیا تھا۔ اس سلسلے میں بھی راقم نے 16 اگست کو ایک تاثراتی ای میل ارسال کیے تھے۔

دونوں ای ۔میل کا جواب مرحوم نے بروقت تو نہیں دیا، تاہم وسیم احمد اعظمی سے فرمانے لگے کہ شفقت صاحب کی انگریزی بھی بڑی اچھی ہے۔ جس کی توثیق بعد میں بھی ہوئی، چنانچہ عندالملاقات دل کھول کر تعریف کی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس میں میری صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اصاغر پروری اور حوصلہ افزائی کا جذبۂ بیکراں بھی شامل ہے۔

5/فروری 2010ء کو مرحوم کا آخری مضمون 'مشاہدہ' کالم میں نظر نواز ہوا، جس کا عنوان تھا 'امریکہ میں مسلمانوں کی منفی شبیہ' ۔ اگلے دن ملکی اور عالمی منظرنامہ پر گہری نظر رکھنے والے اس بیباک صحافی کے اچانک انتقال کی خبر آل انڈیا یونانی طبی کانگرس کے جنرل سکریٹری حکیم سید احمد خاں نے بذریعہ فون دی۔ دل مسوس کے رہ گیا اور آنکھوں سے اشکہائے عقیدت رواں ہو گئے۔ تدفین دلی گیٹ قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں ہوئی۔

محفوظ بھائی اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں کسی مدرسہ سے فارغ ہوں، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اربابِ مدرسہ ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرتے تھے۔ مدارس کے مسائل پر بھی انھوں نے قلم اٹھایا اور پورے اعتماد اور بیباکی کے ساتھ اپنے نظریات وخیالات کا اظہار کیا۔ ان کی رائے سے اختلاف کی گنجائش تو ہے تاہم ان کا استدلال کہیں سے کمزور یا بے مایہ نہیں نظر آتا۔

ان کے خیالات میں اگر آہنی صلابت موجود تھی تو شاخ گل کی سی لچک بھی تھی۔ چنانچہ تقریباً تین سال سوویت انفارمیشن سینٹر کے اردو مجلہ 'سوویت جائزہ' سے وابستگی کے دوران ضمیر کے خلاف بھی بعض تحریریں صفحاتِ قرطاس پر آئی ہوں گی، جس کے کفارہ کے طور پر انھوں نے ایک کتاب ''سرخ یلغار'' لکھی۔ اسی طرح 'کویت میں عراق کے غاصبانہ قبضہ - حقائق اور مضمرات' نامی کتاب سے بھی ان کے جذبِ دروں کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

ان کی تحریروں کی غرض وغایت کسی پر رعب جمانا، اپنی قابلیت یا دیانت کا لوہا منوانا ہرگز نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سلگتے ہوئے حالات پر بھی قلم اٹھاتے تو متانت اور سنجیدگی ،توازن اور اعتدال سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ان کی یہ کوشش ضرور ہوتی تھی کہ عالمی یا ملکی سطح

پر بربریت، انسانی شرافت، ہمدردی اور قربانی کے جو مظاہرے ہوئے ان کا آئینہ آج کے ظالم حکمرانوں کو دکھا کر شرمسار کر دیں، آئے دن کی بربریت اور وحشیانہ مظالم کے مرقعے دکھا کر لوگوں کے ضمیر کو بیدار کرنا ان کا مشن بن گیا تھا۔ تاکہ انسانیت اور شرافت، مذہب اور محبت پر سے لوگوں کا اٹھتا ہوا اعتماد دوبارہ بحال ہو جائے۔ ملک وملت کے لیے ان کا دل آخری دنوں میں بہت بے چین رہنے لگا تھا۔

محفوظ بھائی کی تحریروں میں گہرا مشاہدہ، حساس طبیعت اور درد انسانیت کی جھلکیاں صاف دیکھی جاسکتی ہیں۔ آخر میں ان کے قلم میں دودھاری تلوار کی کاٹ کے بجائے سرجن کے نشتر کی سی محبت آمیز نرمی پیدا ہوگئی تھی۔ ان کا اندازِ فکر، تجزیہ وتحلیل، تنقید وتنقیح اور اسلوب نگارش ہر جگہ منفرد نظر آتا ہے۔ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوبیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مرحوم کی بیباک اور ٹھوس صحافتی خدمات کے اعتراف میں اردو اکادمی، دہلی نے انھیں ''بہترین صحافی'' کا ایوارڈ دیا تھا۔ نامساعد حالات میں بھی پرورشِ لوح وقلم کا بیکراں جذبہ رکھنے والا یہ مردِ آہن خود اپنے کوائف میں رقمطراز ہے:

> ''یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد سے اب تک لکھنے لکھانے کا ہی کام کر رہا ہوں اور مطمئن ہوں کہ انتہائی نامساعد، حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات کے باوجود کبھی بھی اپنے اللہ سے اور اپنے ملک سے شرمندہ ہونے کی نوبت نہیں آئی''۔

انھوں نے فرش پر بیٹھ کر قوم وملت کے لیے عرش کے خواب دیکھے اور حصولِ مقصد کے لیے ذہن ودماغ اور لوح وقلم سے کم وبیش نصف صدی تک جہاد کرتے رہے۔ نوبت بایں جا رسید کہ وہ اپنی ذات تک سے بیگانہ ہوگئے تھے، نہ بینک بیلنس کی کبھی فکر کی اور نہ کسی منصب کی طمع۔ ان کی اچانک رحلت سے ان کے اہل خانہ تاریکی میں ڈوب گئے۔

محفوظ بھائی نے اپنی تحریروں کی وساطت سے لطافت ونزہت، استحکام اور اپنائیت، حق گوئی وبے باکی کا جو جادو جگایا ہے، اردو صحافت اسے کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

○○

مجاہد صحافی

وصی احمد نعمانی ایڈوکیٹ

یہ یقین کیا جاتا ہے کہ صحافیوں کی زندگی مجاہدانہ ہوتی ہے۔ انھیں پوری زندگی نامساعد حالات سے جوجھتے رہنا ہوتا ہے۔ یہ اپنی ہمت، حوصلہ، پاک طینت، اور نیک نیتی کی وجہ سے بڑے سے بڑے طوفان کے رخ کو موڑ دیتے ہیں۔ ایسے ہی صحافی سماج میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کی زندگی دوسروں کے لیے مشعل راہ بن جاتی ہے۔

جناب محفوظ الرحمٰن صاحب کی زندگی خدا کا عطیہ تھی جسے انھوں نے نہایت پاکدامنی کے ساتھ جیا تھا وہ وقت کے ہزاروں جھونکوں سے کامیابی سے گزرتے رہے۔ ناگفتہ بہ حالات نے بھی ان کے حوصلہ کو متزلزل نہیں کیا۔ صحافیوں کی ٹولی، سیاست کاروں کے کارواں، دانشوروں کی محفل، اہل فکر ونظر کے مکتبوں نے محفوظ الرحمٰن صاحب سے فیض حاصل کیا ہے۔ ملک وسماج میں جب بھی اہم تحریک یا مسئلہ سامنے آتا تھا، ان کو یاد کیا جاتا تھا۔ ان سے مشورے لیے جاتے تھے۔ ہندوستان کے سیاسی مدبر محفوظ الرحمٰن صاحب سے نہ صرف مشورہ طلب کرتے تھے بلکہ اکثر ان سے رہنمائی بھی حاصل کرتے تھے اور مشورے پاکر خوشی واطمینان کا اظہار کرتے تھے۔

جناب محفوظ الرحمٰن صاحب کی مٹی میں مولانا حمید الدین فراہی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابواللیث ندوی جیسے دنیائے اسلام کے عظیم مفکروں کی سرزمین اعظم گڑھ کی ''سوندھی'' خوشبو پوشیدہ تھی، کیونکہ اس دیار کا ہر ذرّہ آفتاب ہوتا ہے۔ اسی لیے محفوظ الرحمٰن

صاحب کی صحافت میں فکر و نظر کی گہرائی، نیت کی پاکیزگی، اور پیشہ ورانہ وقار موجزن رہتا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مسلم جیسی سدابہار شخصیتوں نے ان کی پاکیزہ اور بیباک صحافت کی آبیاری کی تھی اور وہ ان کے نظریات کے حقیقی وارث تھے۔

انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی اگر وہ چاہتے تو اسی ڈگری کے توسط سے آرام و آسائش کی زندگی ڈھونڈ سکتے تھے مگر کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے بس میں نہیں ہوتے۔ کیونکہ خدا پیدائش کے قبل ہی انسان کے جسم میں موجود ایک سو کھرب سیل میں پوشیدہ ''کروموزوم'' میں ہر انسان کی تقدیر لکھ دیتا ہے۔ اور تین کروڑ کیمیائی زبان میں لکھے عنوانات میں انسان کی زندگی کا ہر لمحہ طے کر دیتا ہے۔ یہ خدا کا کرم تھا کہ اس نے محفوظ الرحمٰن صاحب کے کروموزوم قسمت میں ایک بیباک، بے مثال پاک دامن، بے لوث، مدبر، مفکر، دانشور، خدا ترس، ملک و ملت کا قلمی سپہ سالار ہونا لکھ دیا تھا۔ اور محفوظ الرحمٰن صاحب خدا کی اس مرضی پر کھرے اتر کر اللہ کی خوشنودی حاصل کر کے اس سے جا ملے۔ انھوں نے کبھی قلم کو رسوا اور صحافت کو بے وقعت نہیں ہونے دیا اور ایسی زندگی مثال کے طور پر گزاری جو آنے والی ''صحافت'' کی زندگی کے لیے ایک سرمایہ ہے اور آنے والی نسل اس سے فیضیاب ہوتی رہے گی۔

غیر ذمہ دارانہ صحافت اور مصلحت پر مبنی قلمی کارکردگی کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر شنکر دیال شرما، سابق صدر جمہوریہ ہند ''اخبار ورسائل میں جو کچھ چھپتا ہے، قاری اسے مذہبی کتابوں میں لکھی ہوئی بات سمجھ کر پڑھتا ہے اور یہ یقین کرتا ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ غلط ہو ہی نہیں سکتا ہے'' اس لیے صحافیوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داری اس طرح نبھائیں کہ قاری کے اعتماد و یقین کے ''آبگینہ'' کو کسی طرح بھی ٹھیس نہ پہنچے۔ ایسا نہیں کیا گیا تو قاری کے ان پاکیزہ جذبات کی بے قدری ہوگی، محفوظ صاحب نے قارئین کی ہمیشہ نہ صرف قدر کی بلکہ ان کی پاسبانی اور نگہبانی بھی کی۔ اسی لیے ان کا نام نہایت احترام اور وقار کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔

ہندوستان میں اس وقت ایسے بڑے اخبارات موجود ہیں جو کئی کئی جگہوں سے شائع ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر سن کر کافی بھلا لگتا ہے۔ اخبار کی خاص کر اردو اخبار کی اشاعت خوب خوب بڑھ رہی ہے، مگر اس کے معیار، زبان و بیان کی جس قدر پامالی ہوتی جارہی ہے، اس سے لوگوں کے دلوں میں بیزاری پیدا ہوتی جارہی ہے اور ایسے قلم کاروں کے خلاف من میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ آج ایسے مدیر زیادہ ہیں جن کی نظر میں صحافت کا معیار نہیں بلکہ دولت کی چمک دمک اہم ہے۔ ''خبریں'' بنائی جاتی ہیں، خبر رساں پیدا کیا جاتا ہے، اور کبھی کبھی تو حالات ہی ایسے پیدا کیے جاتے ہیں، جو وہ ''خبریں'' پیدا کردیں جو اشاعت کی تعداد بڑھانے میں مددگار ہو۔ ایسے جرنلسٹ یا صحافی اپنا قد تو بڑھا لیتے ہیں مگر صحافت کے معیار کو پست کردیتے ہیں۔ خبریں چھاپنا، فوٹو چھاپنا، سنسنی خیزی، خبروں کے معیار پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ خود صحافی کی مرضی یا مفاد پرستی پر ہے۔ محفوظ الرحمٰن صاحب نے ایسی صحافت کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی ہے۔ اسی لیے جب بھی باوقار اور معیاری اخبارات ورسائل کی صحافت کا ذکر ہوتا ہے تو محفوظ الرحمٰن کی شخصیت مزید مقناطیسی قوت بن کر رہنمائی کرتی ہے۔

ہفت روزہ بادبان، ہفت روز اخبار جمعہ، جناب عبدالجلیل فریدی صاحب کا روزنامہ قائد، جماعت اسلامی کا سہ روزہ دعوت وغیرہ۔ ایسے اخبارات ورسائل ہیں، جنھوں نے محفوظ الرحمٰن صاحب کی بیباکی، رحم دلی، وسیع النظری اور صحافت کے وقار کو خوب خوب پھیلایا۔ اور محفوظ الرحمٰن صاحب بھی اپنی سکت بھر ان اخباروں کے ذریعے ملک وملت کی رہنمائی کرتے رہے۔

مسلم مطلقہ خواتین (تحفظ) ایکٹ 1984ء کے خلاف آپ نے جس شد و مد کے ساتھ آواز اٹھائی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آج یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی کہ یہ ایکٹ کسی طور پر مسلم مطلقہ خواتین کے حقوق کا تحفظ نہیں کرسکتا ہے۔ ہندوستان کے زیادہ تر ہائی کورٹ اور یہاں تک کہ سپریم کورٹ کی قانونی پیچیدگیوں میں پھنس کر یہ ''بے سود'' ایکٹ اور بھی زیادہ پریشان کن ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔

آج ضرورت ہے کہ محفوظ الرحمٰن صاحب کے طرز زندگی کو وہ صحافی اپنا لیں جو انہیں اپنا

قائد سمجھتے ہیں۔ قلم اور زبان کے وقار کو پامال نہ ہونے دیں۔ ورنہ صفوں میں پوشیدہ صحافیوں کے نام پر تو اردو کے رسم الخط کو بدل کر اسے بے لباس کرنے کی پوری سازش ہو رہی ہے۔ اور وقت وقت پر اردو رسم الخط کو بدلنے کی پوری سازش رچی جاتی رہتی ہے۔ اس گروہ میں چھوٹے اخبار بھی شامل ہیں اور بڑے اخبار بھی۔ اردو زبان اپنے لب ولہجہ، لباس، شعار میں زندہ ہے تو محفوظ الرحمٰن جیسے قلمی صوفیوں کی کاوش کا احترام ہوگا ورنہ اپنی وراثت کے حق سے ہم محروم کردیے جائیں گے۔

○○

کچھ یادیں، کچھ باتیں

حکیم وسیم احمد اعظمی

محفوظ الرحمٰن بھائی سے میری پہلی بالمشافہ ملاقات غالباً 1987 کے اواخر میں حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی کے توسط سے ہوئی تھی۔ ویسے میں نے ان کی تحریریں کب سے پڑھنا شروع کیں خود مجھ کو یاد نہیں، البتہ میری پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے وہاں محفوظ بھائی کی تحریروں کو بڑے ادب واحترام سے پڑھا جاتا تھا اور ملکی وملی مسائل پر ان کی بیباک رائے کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ میری ان سے آخری ملاقات تین فروری 2010ء کو ہوئی تھی۔ میں ان کی خدمت میں کبھی بھی حاضر ہو جاتا تھا لیکن جب سے انھوں نے روزنامہ راشٹریہ سہارا میں لکھنا شروع کیا تھا ان کی خدمت میں جمعرات کے روز حاضری سے مجتنب رہتا، کیونکہ اس دن وہ راشٹریہ سہارا میں اپنا کالم لکھتے تھے۔ جب انہیں میری اس خود پر مسلط پابندی کا علم ہوا تو اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ مشفقانہ سرزنش کی، تاہم میں حتی الامکان اس دن حاضری سے احتراز کرتا تاکہ وہ کامل ذہنی اور فکری ارتکاز کے ساتھ اپنا کالم لکھ سکیں۔ تین فروری 2010ء کو بھی اسی لیے ملا تھا کہ چار فروری کو انھیں اپنا کالم لکھنا تھا۔

محفوظ بھائی نے صحافت کو ایک مقدس فریضہ کے طور پر اپنایا تھا۔ وہ پرانی قدروں کے امین اور قدیم روایات کے پاسبان تھے۔ صحافت کو انسانی خدمت کا ایک بڑا وسیلہ خیال کرتے

تھے۔ ملکی، عالمی اور ملی مسائل پر ان کا نقطۂ نظر واضح تھا۔ زاویۂ نگاہ انسانیت کی فلاح کی تلاش تھا، جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہی ممکن تھا۔ ان کی فکر میں کہیں سے بھی الجھاؤ نہیں تھا۔ زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اس لیے اظہار خیال میں روانی، برجستگی اور ایک طرح کا بیساختہ پن تھا۔ بیبا کی ان کی فکر کی دین تھی، اسلامیات کے مطالعے نے ان کی فکر ونظر میں آفاقیت بھر دی تھی۔ وہ مسائل کو عالمی تناظر میں دیکھتے تھے۔

محفوظ بھائی کا ایک بڑا وصف اصاغر نوازی تھا۔ وہ اپنے خوردوں پر شفقت فرماتے اور ان کی باتوں کو بہت توجہ اور سکون سے سنتے اور ان کے مسائل کے حل میں پیش پیش رہتے۔ ان کے اس عمل سے خوردوں کا حوصلہ بڑھتا۔ یہ دراصل ذہنی اور فکری تربیت دینے کا ان کا اپنا انداز تھا۔

محفوظ بھائی کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت اور فراست کی بڑی دولت سے نوازا تھا۔ وہ غیر معمولی یادداشت کے مالک تھے، ان کا علم حاضر تھا، جب وہ عالمی مسائل پر اظہار خیال کرتے تو گویا معلومات کے دریا بہاتے اور آخر میں ان کا تجزیہ بند دریچوں کو کھولتا اور ہم اصاغر بھی اپنے ظرف کے بقدر کچھ پا جاتے۔ محفوظ بھائی ایک صحافی تھے، ان کی نظر دور بین بھی تھی اور باریک بین بھی۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی میں اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں اپنے اصولوں اور موقف سے انحراف نہیں کیا۔ اس راہ میں مصائب بھی آئے اور تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑیں لیکن کبھی بھی پایۂ استقلال میں حرف نہیں آیا۔

محفوظ بھائی نے صحافت کے طفیل بہت سے قومی اور بین الاقوامی رہنماؤں کے ذہن وزندگی میں بھی جھانکا، وہ قومی رہنماؤں میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے۔ وہ ان کو ہندوستانی قوم کا سب سے بڑا بہی خواہ اور ملت اسلامیہ کا ہمدرد تصور کرتے تھے۔ وہ جب بھی مجھے پاتے تو ڈاکٹر فریدی کا تذکرہ ضرور کرتے۔ یہ بھی کہا کرتے کہ اگر ڈاکٹر فریدی کے رہنما خطوط پر ہندوستانی قوم چلتی تو ہندوستان ترقی کی بلندیوں کو کبھی کا چھو چکا ہوتا۔ آئے دن کے مسلکی اختلافات سے کب کی نجات مل چکی ہوتی اور ہندوستان کا عالمی منظر نامہ میں اپنا ایک مقام ہوتا۔

محفوظ بھائی نے نو آموز صحافیوں کو صحت مند اور دیانت دار صحافت کی ہمیشہ تلقین کی۔ ان کو لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ہدایت کرتے۔ نئے لکھنے والوں کی تربیت وہ اس ڈھب سے کرتے کہ ان کو محسوس نہ ہوتا اور وہ غیر شعوری طور پر ان کے بتائے خطوط پر چل پڑتے۔ وہ اپنے خوردوں کی نہ صرف ذہنی اور فکری رہنمائی فرماتے، بلکہ ان کے لیے لوازموں کی فراہمی کی بھی سعی کرتے۔ جنوری 2010ء کی کسی تاریخ میں انھوں نے ایک شخص کے بارے میں مجھے بتایا کہ وہ مدارس اسلامیہ پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں، اس میں ایک باب رسالوں اور جریدوں پر بھی ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ 'اردو طبی رسائل وجرائد' کے نام سے ایک کتاب میں نے بھی مرتب کی ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ انہوں نے اس خواہش کے ساتھ اسے دیکھنا چاہا کہ ممکن ہے موصوف کو اس میں اپنے کام کا کوئی لوازمہ مل جائے۔ اس کے بعد میں چند دنوں ان سے نہ مل سکا تو خبر بھجوائی اور کتاب دیکھنے کی بات کہی۔ میں کم وبیش 160 صفحات پر مشتمل کتاب کا کمپوزڈ میٹر لے کر تین فروری 2010ء کو ان کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ یہ میٹر آپ متعلقہ شخص کو دے دیں۔ وہ حیرت اور شادمانی سے مجھے دیکھتے رہے اور فرمایا: یہ کتاب ابھی چھپی نہیں ہے، آپ نے تین سو اردو طبی رسالوں اور جریدوں کے بارے میں تحقیقی معلومات جمع کر دی ہیں، بہتر یہ ہے کہ پہلے یہ کتاب چھپ جائے، اس کے بعد یہ لوازمہ کسی کو دیا جائے۔ میں نے درخواست کی کہ یہ میٹر اسی صورت میں ان کو مل جائے تو ممکن ہے اس میں سے کچھ اپنے کام کی باتیں تلاش کر لیں۔ انھوں نے دوبارہ حیرت اور استعجاب سے میری طرف دیکھا اور کہا: ڈاکٹر وسیم : آپ کا یہ کام بہت وقیع ہے، آپ نے اس میں بہت زیادہ محنت کی ہے۔ پہلے اس کو چھپ جانے دیجیے۔ لیکن میرے بار بار کے اصرار پر اس کتاب کے رسالوں اور جریدوں کی تفصیلی فہرست والا حصہ لے لیا اور باقی واپس کر دیا اور یہ کہا کہ میں ان دانشور کو یہ اس ہدایت کے ساتھ دوں گا کہ وہ اس کو آپ کے نام سے چھاپیں۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں لکھنؤ آ گیا، پانچ فروری کو ان کا

کالم پڑھا اور چھ فروری کو دن میں ۱۱ بجے ان کے انتقال کی خبر ملی۔ انّا لِلّٰہ وانّا الیہ راجعون۔ محفوظ بھائی نے اپنی تحریروں کے ذریعے صحافت کا جو معیار قائم کیا تھا، ملک اور ملت کی فلاح و بہبود کے جو منصوبے بنائے تھے اور جس کو عملی شکل دینے میں ہمہ تن مصروف رہا کرتے تھے، آج ان کے ہم مزاج خوردوں کو اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ محفوظ بھائی نے صحافت میں حق گوئی اور بیباکی کی جو روش اپنائی تھی اس کو پوری توانائی کے ساتھ اپنانے کی ضرورت ہے۔

○○

جادو قلم صحافی

ڈاکٹر عمیر منظر

محفوظ الرحمٰن صاحب سے ملاقات تو بعد میں ہوئی لیکن ان کے نام سے میں بہت پہلے سے واقف تھا۔ دلّی آنے کے بعد عم محترم جلال الدین اسلم کے توسط سے محفوظ صاحب تک رسائی ہوئی۔ پہلی ملاقات میں صرف ان کی گفتگو سنتا رہا، محفوظ صاحب کا ہنس مکھ چہرہ، دلنوازی کی باتیں، بے ساختہ ہنسی اور بلا تکلف اظہار نے خاصا متاثر کیا۔ یہ عجیب و غریب اتفاق تھا کہ تحریروں کے ساتھ ان کی شخصیت نے بھی گہرا اثر مرتب کیا۔ حالانکہ بالعموم ایسا نہیں ہوتا، محفوظ صاحب سے یہ پہلی ملاقات بہت خوشگوار ثابت ہوئی۔

دلّی آنے کے فوراً بعد ایک دو بار تو پرانی دلّی جانا اچھا لگا لیکن بعد میں سٹی بس کے سفر کے تصور سے ہی دل کانپ جاتا تھا۔ اس کے باوجود متعدد بار صرف محفوظ صاحب سے ملاقات کے لیے پرانی دلّی گیا۔ واپسی پر بار ہا یہ احساس ہوا کہ ہمیں اپنے بہت سے مسائل پر ازسرنو غور کرنا چاہیے۔ ترجیحات بھی طے کرنی چاہئیں۔ نیز کئی دہائیوں سے ہم جن راستوں پر گامزن ہیں کیا ان پر ازسرنو غور کیا جاسکتا ہے۔ ان کی مجلس میں دنیا جہان کے بے شمار موضوعات زیر بحث آتے۔ کبھی کبھی یہ احساس ہوتا کہ کچھ لوگ تو یہاں پوائنٹ لینے آتے ہیں تاکہ وہ محفوظ صاحب کے نکتے کو بڑھا کر مضمون بنا سکیں۔ محفوظ صاحب کے یہاں بے شمار لوگ آتے اور بے شمار معاملات و مسائل پر گفتگو کرتے کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ گھنٹوں بیٹھنے کے بعد بھی گفتگو کا موقع نہ ملتا۔ محفوظ صاحب کی ان گھریلو مجلسوں کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہاں

موجود ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی تھی، لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے لیکن محفوظ صاحب کی رائے خاصی متوازن اور جامع ہوتی۔

مسلم مجلس مشاورت کی تقسیم کے دنوں میں کئی بار جانا ہوا۔ گفتگو بھی ہوئی۔ محفوظ صاحب کا موقف بالکل واضح تھا ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے مسائل اور معاملات پر نظر رکھنے کے بجائے ملی رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد تو ملی انجمنوں اور گروہوں کے عہدوں پر نظر رکھتی ہے۔ ایثار اور خلوص کے بجائے ذاتی مفاد اور مختلف قسم کے عناد نے انھیں جکڑ رکھا ہے ایسے میں ملت کے وسیع تر تناظر میں سوچنے کی مہلت کسے ہے۔ غالباً وہیں کسی صاحب نے یہ لقمہ دیا تھا کہ جامعہ نگر میں تو ملی انجمنوں اور تنظیموں کی کثرت کا عالم یہ ہے کہ ایک ایک کمرے میں آل انڈیا جماعتیں اور تنظیمیں ہیں۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ اور ہندوستانی مسلمانوں کے بعض دوسرے موقر اداروں کے بارے میں کبھی کبھی ان کی رائے سے اختلاف کرتا اور کہتا کہ یہ جو بھی ہیں اور جیسے بھی ہیں بہر صورت ہمارے اجتماعی ملی مفاد کے تحفظ اور شناخت کا نشان امتیاز ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں منفی آراء کے بجائے ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے اور عمائدین کو بہتر مشورے دیے جانے چاہئیں۔ پھر کیا تھا محفوظ الرحمٰن صاحب نے مولانا آزاد سے لے کر آج تک کے علمائے کرام کے اجتماعی رویوں پر جو بصیرت افروز گفتگو کی، وہ سننے کے قابل تھی۔ ایک بار میں نے کہا کہ ان سب کے باوجود آپ مسلم مجلس مشاورت کے اس گروہ کی حمایت کرتے ہیں جس میں علمائے کرام کی کثرت ہے تو بے ساختہ مسکرائے اور کہا کہ بھائی میرا یہی تو معاملہ ہے میں جسے درست سمجھتا ہوں اس کی تائید کرتا ہوں۔

ادھر جب سے راشٹریہ سہارا اردو میں ان کا کالم چھپنے لگا تھا بہت لوگوں کو اس کا انتظار رہتا تھا۔ غالباً انتقال سے کچھ ماہ قبل انھوں نے مسلم قیادت بشمول مسلم پرسنل لاء بورڈ پر ایک کالم لکھا۔ محفوظ صاحب کے لکھنے کا ایک خاص انداز تھا۔ سادہ لفظوں کو بھی وہ اپنے استعمال سے خاصا پر قوت بنا دیتے تھے، طنز کی لہریں تو نہیں لیکن سچ کی کاٹ سے ان کا اسلوب جارحانہ ہو گیا تھا۔ اس کالم کو پڑھنے کے بعد فون پر بہت دیر تک میں گفتگو کرتا رہا۔ کچھ باتوں کی تائید

کے باوجود میں نے اپنا اختلاف بھی درج کرایا۔ ان کا کمال یہ تھا کہ مسکراتے رہے اور کہتے رہے کہ تمھاری باتوں سے میں انکار نہیں کرتا مگر بابری مسجد اور بعض دوسرے ملی مسائل میں کہیں نہ کہیں ہمارے مسلم قائدین کی حالات سے چشم پوشی شامل رہی ہے۔ قائدین کو بہت سے مواقع ملے مگر انھوں نے اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔

آخری دنوں میں میرا جب بھی وہاں جانا ہوا یا اگر فون پر بات ہوئی تو یہ ضرور پوچھتے کہ کیا کر رہے ہو۔ کچھ یافت ہو رہی ہے یا نہیں۔ کوشش کرو ہمت مت ہارنا، اللہ بہت کارساز ہے۔ اپنائیت اور انسانی ہمدردی سے لبریز ان کے یہ جملے ایسے ہوتے کہ ایک دو بار تو صرف انھیں سننے کے لیے ہی فون کیا۔

اس میں شک نہیں کہ محفوظ صاحب ایک عظیم صحافی تھے۔ حالات پر ان کی غیر معمولی نگاہ تھی مگر ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے کالموں میں حالات اور مسائل کا تجزیہ اس طرح کرتے تھے کہ پڑھنے والا صرف حالات سے ہی واقف نہیں ہوتا بلکہ محفوظ صاحب کے طرز اسلوب کا بھی گرویدہ ہو جاتا۔ ایک بار میں نے فون کر کے ایک کالم پر مبارکباد دی (غالباً وہ کالم بی جے پی صدر کے چند بیانات کے تناظر میں لکھا گیا تھا) اور کہا کہ میں نفس مضمون کے بجائے طرز اسلوب کی بطور خاص داد دے رہا ہوں۔ اس موقع پر میں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے کالم تو غزل کی زبان میں سہل ممتنع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہت خوش ہوئے دعائیں دیں۔

ان دنوں چند سطریں لکھنے کے بعد دماغ کا خراب ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ صحافی حضرات کا کیا کہنا۔ چند مضامین کی اشاعت کے بعد وہ خود کو بہت بڑا صحافی سمجھتے ہیں۔ مگر محفوظ صاحب کہ دنیا جن کے قدموں سے لپٹی رہی، دنیا والے لپٹے رہے مگر وہ کبھی غلط فہمی کا شکار نہ ہوئے۔ ان کے قلم میں جادو تھا، بہت کچھ کر سکتے تھے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں کیا اور صحافت کے اس زرّیں اصول سے خود کو الگ نہیں کر سکے کہ معاشرے کو روشنی فراہم کی جائے اور اس کے ذہن کو بیدار کیا جائے۔

OO

بڑی مشکل سے ہوتا ہے...

شاہین

یوں تو اس دنیا میں بڑے بڑے مفکر، ادیب، فلسفی، لیڈر، شاعر، اور خدّامِ خلق آئے اور چلے گئے مگر اس مایۂ ناز صحافی کی بات الگ ہے۔ میں ان کے کسی قریبی رشتہ دار کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے اپنے خیالات پیش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے انھیں اپنے بچپن سے لے کر اب تک بہت قریب سے دیکھا اور ان کے علم وفضل سے بہت فائدہ بھی اٹھایا۔ آج باوجود اس کے کہ اللہ نے ہمیں نیک، خیال رکھنے والے اور اچھے عزیز واقارب اور دوست واحباب دیئے ہیں مگر یہ سب کے سب مل کر بھی ان کی کمی پوری نہیں کر سکتے۔

وہ ایک نہایت نیک، بردبار، ذہین، خداترس، نرم دل، عفو ودرگزر کرنے والے، شفیق، مہربان، سخی، شیریں کلام، خاکسار، لوگوں کو نفع پہنچانے والے، صابر وشاکر، اللہ پر توکل کرنے والے، غریبوں سے محبت کرنے والے، متواضع، مہمان نواز اور نہایت دیندار انسان تھے۔ وہ لوگوں کی اور غریبوں کی مدد اس انداز سے کیا کرتے تھے کہ پانے والے کو یہ احساس کرا دیتے تھے کہ جو کچھ اسے مل رہا ہے وہ گویا کہ اس کا اپنا حق ہے۔ وہ اس طرح دیتے کہ اللہ کے سوا کسی کو خبر نہ لگتی۔

چہرہ کھلی کتاب ہے عنوان کچھ بھی دو
جس رخ سے بھی پڑھو گے مجھے جان جاؤ گے

انھیں جھوٹ ناپسند تھا، وہ اپنے بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر رحم کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی بھی زندگی میں کسی بھی معاملے میں کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ وہ سچے مسلمان تھے ان کی زبان اور ہاتھ سے بلاتفریق لوگوں کو ہمیشہ فائدہ ہی پہنچا۔ وہ جو اپنے لیے پسند کرتے تھے وہی دوسروں کے لیے بھی۔ وہ سب کے ساتھ عمدہ اخلاق سے پیش آتے تھے، جو سچائی دل میں تھی وہی باہر بھی تھی۔ وہ ہر ایک سے اس طرح بات کرتے تھے کہ مخاطب کو لگتا تھا جیسے ہم سے ہی سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ وہ امیر و غریب میں فرق نہیں کرتے تھے۔ کوئی بھی ان کے پاس آئے وہ اس کی تواضع، مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑتے تھے۔ 26 سال کا عرصہ ہم نے ان کے ساتھ گزارا مگر کبھی کوئی ایسی بات ان میں نہیں پائی جو انسانیت کے یا اسلام کے خلاف ہو، یا کوئی ایسی بات جو قرآن و حدیث کی نفی کرتی ہو۔ وہ گھر، پڑوس، رشتہ دار اور اپنے ملنے جلنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے، کوئی ان کے ساتھ کتنا ہی برا سلوک کرے وہ معاف کر دیتے تھے اور اس انسان سے صاف دل کے ساتھ تعلق جوڑے رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ جانے کتنے ضرورت مند، یتیم، غریب اور لاچار لوگوں کی اس طرح سے مدد کی کہ انھیں پھر کسی اور سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ چھوٹے سے چھوٹا تحفہ بھی اتنی خوشی کے ساتھ قبول کرتے تھے کہ دینے والا بھی خوش ہو جاتا تھا۔ وہ کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔ محبت کا جواب اس سے زیادہ محبت کے ساتھ دیتے اور نفرت اور لڑائی جھگڑے کا جواب بھی نرم مزاجی اور شیریں کلامی سے دیتے۔ انھیں لوگوں سے ملنا جلنا پسند تھا۔ اپنے تمام دوستوں میں سب سے زیادہ ممتاز اور ہر دل عزیز وہی تھے۔ آج بھی ان کے دوست واحباب ان کی بہت کمی محسوس کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھتے تھے اور پریشانیوں میں بھی پُرسکون و مطمئن دکھائی پڑتے تھے۔ جو بھی ان سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ قدم قدم پر لوگوں کی بھلائی وخیر خواہی کے متمنی تھے۔

وہ خالی وقت میں اللہ کی قدرت پر غور وفکر کیا کرتے تھے، انھوں نے کبھی کوئی نازیبا، ناشائستہ بات زبان سے نہ نکالی۔ ہمیشہ سب کی دل جوئی کرتے۔ یتیموں کی مدد اس طرح کرتے جیسے کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے سب کچھ کرتا ہے۔ اگر کسی کو دکھ میں دیکھ لیتے تو جب

تک اس کے دکھ کو دور نہ کر دیتے چین نہ پاتے۔ انھوں نے کبھی بھی مال سے محبت نہیں کی بلکہ اسے اللہ کی رضا کے کاموں میں خرچ کیا۔ وہ انسانوں کی قدر کرتے تھے۔ انسانوں سے محبت صرف اللہ کی رضا کے لیے کرتے تھے اور اگر کسی سے ناراض ہوتے تو بھی اپنے رب کی رضا کے لیے۔ جسے بھی دیتے اللہ کی خوشنودی کے لیے۔ وہ اللہ سے ڈرتے بندوں سے نہیں۔

وہ ایک بیباک اور سچ کی پیروی کرنے والے صحافی تھے، ان کے قلم نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا، وہ کسی دنیا پرست، جھوٹے اور مطلبی انسان کے آگے کبھی نہیں جھکتے تھے، چاہے وہ بڑا عہدیدار ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایماندار، دیانتدار، امانت دار اور وفادار انسان تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی اللہ کے سوا کسی کو اپنا کارساز نہیں بنایا۔ انھوں نے دنیاداروں کی طرح مال وجائداد اکٹھا نہیں کی۔ بلکہ جو بھی آیا سب کچھ اپنی جائز ضروریات پوری کر کے باقی سارا مال اللہ کے مستحق بندوں کی اعانت میں لگایا۔ یہی طرزِ عمل تمام زندگی جاری رہا۔ کوئی بھی آج یہ نہیں کہہ سکتا کہ محفوظ صاحب نے فلاں جائداد خریدی اور فلاں جگہ اپنے بیٹے بیٹی کے نام کر دی نہیں! وہ تو دیندار تھے، دنیاداری ان میں ذرّہ برابر بھی نہ تھی۔ انھوں نے اپنے پیچھے اگر کچھ وراثت چھوڑی ہے تو وہ صرف اور صرف ان کا قلم اور ان کی تحریریں ہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہماری دعا ہے کہ یومِ آخرت اللہ انھیں صالحین، صدیقین، شہداء اور انبیاء کی جماعت میں شامل رکھے اور جنت الفردوس میں اپنے حبیب رسولِ عربی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ عطا فرمائے۔ آمین!

○○

باب دوم

محفوظ الرحمٰن

اپنی تحریروں کے آئینے میں

امریکہ میں اسلام اور مسلمان

(نوٹ: محفوظ الرحمٰن صاحب کی زندگی کا یہ آخری مضمون ہے، جو 5 فروری 2010 کو روزنامہ راشٹریہ سہارا میں شائع ہوا تھا، اگلے روز 6 فروری کو ان کا انتقال ہوگیا۔)

امریکیوں کی ایک معتد بہ تعداد اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے واہموں اور ظن وگمان پر مبنی منفی سوچ کی حامل ہے، عیسائیوں، یہودیوں اور بدھسٹوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے تعلق سے ان میں کہیں زیادہ بدگمانی پائی جاتی ہے۔ یہ انکشاف گیلپ سینٹر فار مسلم اسٹڈیز کے ایک تازہ سروے میں کیا گیا ہے جس کے مطابق 53 فیصد امریکیوں کا کہنا ہے کہ اسلام کے بارے میں ان کی رائے کچھ اچھی نہیں ہے۔ ان میں سے 22 فیصد نے انھیں ناپسندیدہ قرار دیا ہے جبکہ 31 فیصد کا کہنا ہے کہ ان کی رائے بہت زیادہ خراب ہے۔ جہاں تک اسلام کے بارے میں جانکاری کا تعلق ہے 40 فیصد امریکیوں کا کہنا ہے کہ ان کی معلومات بہت ہی محدود نوعیت کی ہیں جبکہ 23 فیصد کا کہنا ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں سرے سے کچھ جانتے ہی نہیں۔

امریکہ میں مسلمانوں کے بارے میں یہ عام رائے پائی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کو برداشت نہیں کرتے، ان میں رواداری کے جذبے کا فقدان پایا جاتا ہے۔ 66 فیصد امریکی

اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ مسلمان دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ رواداری کا معاملہ رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے تعلق سے عام منفی رائے کے باوجود اس سروے میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کی 70 فیصد تعداد امن پسند ہے، وہ جنگ وجدال کے بجائے امن چاہتی ہے۔ 30 فیصد امریکیوں کی سوچ اس کے برعکس ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے تعلق سے ایک اچھی بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ ہم جنس پرستی ان کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ 78 فیصد امریکی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ زیادہ تر مسلمان ہم جنسیت کے قائل ہیں۔ یہ بات اگرچہ امریکہ کے ترقی یافتہ روشن خیال عوام کے نزدیک ناپسندیدہ ہی قرار پائے گی اور اسے مسلمانوں کی پسماندگی کی علامت کے روپ میں بھی دیکھا جائے گا، لیکن مسلمانوں کے اپنے نقطہ نظر سے اسے بہرحال مستحسن ہی کہا جائے گا۔ یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ انھوں نے اخلاقی زوال اور جنسی بے راہ روی کے گندے نالے میں اترنے سے اپنے آپ کو بڑی حد تک بچائے رکھا ہے جس میں امریکی اور مغربی سماج گلے گلے ڈوبا دکھائی دے رہا ہے۔ فحاشی، عریانی اور اخلاقی وجنسی بے راہ روی کے اس طوفان بلاخیز کے باوجود اگر مسلم معاشروں نے اپنے آپ کو قابل ذکر حد تک جنسی انارکی کے دلدل میں اترنے سے بچائے رکھا ہے تو ماننا پڑے گا کہ ان کی جڑیں اسلام کی دھرتی میں بہت گہرائی تک اتری ہوئی ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کا رشتۂ وفا بھی اتنا کمزور نہیں ہوا ہے کہ بادِ مخالف کے تند وتیز جھونکے انھیں اپنے ساتھ تنکے کی طرح اڑا لے جائیں۔

مغرب اخلاقی زوال اور جنسی بے راہ روی اور فحاشی وعریانی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے جس تہذیب کو انسانی ترقی کی معراج قرار دیتا ہے وہی ایک نہ ایک دن اس کے گلے کی پھانس بننے والی ہے۔ جن لوگوں نے اپنی سماعتوں اور بصارتوں پر پہرے نہیں بٹھا رکھے ہیں وہ آنے والے وقت کی تصویر کا پیشگی مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں اور چشم سر سے یہ نوشتۂ دیوار بھی پڑھ سکتے ہیں کہ اخلاق باختگی اور جنس زدگی کی دیمک جب کسی معاشرے کو اندر اندر چاٹ کر

کھوکھلا کر دیتی ہے تو اس کے زمین بوس ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگا کرتی ہے۔ فرد کی بے قید آزادی، ہم جنسیت اور مرد و زن کی مبینہ مساوات کے نام پر جو نت نئے طوفان اٹھائے جائے رہے ہیں ان کے جان لیوا تھپیڑوں کا سامنا ایک نہ ایک دن یورپ و امریکہ کو کرنا ہوگا، یہ اس سے بچ نہیں سکتے۔

مسلمانوں اور اسلام کے تعلق سے اہل امریکہ کی منفی سوچ کی صورت گری میں میڈیا کا رول کافی اہم رہا ہے۔ اس سوچ کو مسلم معاشروں میں عورتوں کے ساتھ کی جانی والی مبینہ زیادتیوں اور ان کی زبوں حالی سے متعلق جھوٹی سچی کہانیوں سے تقویت حاصل ہوتی رہی ہے۔ ایک ریسرچ فرم میڈیا ٹینر (Media Tenor) کا جو کلیدی مسائل کے تعلق سے میڈیا کی کوریج کا تجزیہ کرتی ہے، کہنا ہے کہ امریکہ کی ٹیلی وژن نشریات میں اسلام کا ذکر بار بار آتا ہے اور اس کا بڑا حصہ منفی نوعیت کا ہوتا ہے۔ میڈیا ٹینر نے جنوری تا اگست 2009 کے 8 مہینوں میں جن نشریات کا تجزیہ کیا ان میں 36 فیصد کا تعلق اسلام سے رہا ہے جو زیادہ تر منفی نوعیت کا رہا ہے۔ میڈیا ٹینر کے تجزیہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسلام کے بارے میں جو مواد بھی نشر کیا گیا اس کا دو تہائی حصہ مسلمانوں کو دہشت گردی، انتہا پسندی کے ساتھ جوڑنے سے رہا ہے۔ یہ پرانی بیماری ہے جو امریکی ذرائع ابلاغ، امریکی صحافیوں اور امریکی دانشوروں کو مسلمانوں کے تعلق سے حقائق کے صحیح ادراک سے ہمیشہ روکتی رہی ہے۔ مسلمان خواہ کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائے کہ دہشت گردی اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے، مٹھی بھر لوگ جو اسلام کے نام پر دہشت گردی کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں، انھیں نہ عام مسلمانوں کی تائید و حمایت حاصل ہے نہ مذہبی قیادتوں کی۔ یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں جو محسوس یہ ہوتا ہے کہ مفادات حاصلہ کے لیے کام کر رہے ہیں۔

امریکی دانشوروں اور صحافیوں کے لیے ہی نہیں بلکہ انتظامیہ کی اونچی اونچی کرسیوں پر براجمان لوگوں کے نزدیک بھی یہ بنیادی حقیقت لائق توجہ قرار نہیں پا رہی ہے۔ امریکی عوام کو

اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے منفی سوچ کی راہ پر ڈالنے والی دوسری بہت ہی اہم چیز مساوات مردوزن کے تعلق سے امریکی نظریہ اور مسلم معاشروں کے بارے میں یہ مفروضہ ہے کہ عورتوں کو ان سماجوں میں غلاموں سے بھی بدتر حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ امریکی اخبارات میں چھپنے والی تصویروں کے ایک سروے میں 73 فیصد عورتوں کو بے بسی کے حالات سے دوچار دکھایا گیا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے بارے میں چھپنے والی تصویروں میں عورتوں کو زیادہ تر مظلوم دکھایا جاتا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں ان کا تناسب 6 گنا زیادہ یعنی 42 فیصد ہے۔

عورتوں کی بے بسی اور مردوں کی بالادستی کی کہانیاں اکثر و بیشتر امریکی میڈیا سے نشر ہوتی رہتی ہیں اور کوئی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ ان میں سچائی کا عنصر کس حد تک ہے۔ ان کہانیوں کو گھڑنے والے کون ہیں؟ اور یہ کیوں گھڑی جارہی ہیں؟ یہ کہانیاں کیوں گھڑی جارہی ہیں، اس کا جواب بہت ہی سادہ سا اور آسان ہے۔ ان کا مقصد امریکی عوام کو اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے مسلسل گمراہ کرتے رہنا ہے تاکہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج ہمیشہ برقرار رہے۔ یہ کون لوگ کررہے ہیں؟ ظاہر ہے یہ وہی لوگ ہوسکتے ہیں جنھیں اسلام سے ازلی دشمنی ہے۔ اور امریکہ میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان کی گرفت مالیاتی اداروں اور میڈیا کے علاوہ امریکی زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی کافی مضبوط ہے۔ امریکی انتظامیہ اور دیگر ادارے بھی ان کی گرفت سے آزاد نہیں ہیں۔ یہ ہر جگہ ہیں اور اپنا کام پوری مستعدی سے اور منصوبہ بند ڈھنگ سے انجام دے رہے ہیں۔

جہاں تک مردوزن کے باہمی روابط اور مسلم معاشروں میں ان کی حیثیت کا تعلق ہے، گیلپ ہی کے ایک اور سروے میں 35 مسلم ملکوں کے حالات کے تجزیہ کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاچکا ہے کہ زیادہ تر ملکوں کی غالب اکثریت یہ مانتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کو مساوی قانونی حقوق ملنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر سوڈان میں 78 فیصد اور سعودی عرب میں 84 فیصد مرد اور 86 فیصد عورتیں یکساں قانونی حقوق کی وکالت کرتی پائی گئیں۔

ان ناقابل تردید حقائق کے برعکس اہل امریکہ کو میڈیا کے ذریعہ یہ بتایا جارہا ہے کہ عورتوں کی حیثیت غلاموں جیسی ہے۔ ان کی آزادی پوری طرح سلب کرلی گئی ہے وہ مظلومیت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور یہ جھوٹ جو لوگ پھیلا رہے ہیں وہ اتنے طاقتور اور اثر ورسوخ والے ہیں کہ کسی میں بھی ان کے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ صورت حال اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک کہ میڈیا پر صلیبیوں اور صہیونیوں کی گرفت برقرار رہتی ہے۔

5/فروری 2010

○○

یہ رونا دھونا، یہ سینہ کوبی کب تک

مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ان کی بے وقعتی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ان کی یہ شکایت بڑی حد تک درست ہے۔ مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ ایوان اقتدار کے گلیاروں میں ان کی موجودگی نہ ہونے کے برابر ہے، قانون ساز اداروں میں، سرکاری، غیر سرکاری ملازمتوں اور کاروبار میں انھیں وہ حصہ نہیں مل پایا ہے جو از روئے انصاف انھیں ملنا چاہیے تھا۔ اور ان کی اس شکایت کو بھی کسی زاویے سے بے وزن نہیں کہا جا سکتا۔ مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ ان کے دکھوں کے مداوا، ان کے مصائب کے ازالہ کے وعدے تو انتہائی فراخ دلی کے ساتھ کیے جاتے ہیں، خاص کر انتخابات کے دنوں میں، لیکن عمل کا خانہ اکثر خالی رہتا ہے۔ وعدوں کی کشت زار بے حسی کی گرم ہواؤں میں جھلس جاتی ہے۔ امیدوں کی نرم رو آبجو وعدہ فراموشی اور بے ضمیری کے ریگ زاروں میں سر پٹک پٹک کر دم توڑ دیتی ہے۔

بہت پہلے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے اپنی تاسیس کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ مسلمان شریک سلطنت ہیں، وہ برابر کے شہری ہیں اور انھوں نے کسی کے حق میں خط غلامی نہیں لکھ رکھا ہے۔ یہ اعلان بڑا حوصلہ افزا تھا۔ پھر ہوا یہ کہ مشاورت کے اس وقت کے ذمہ داروں نے معاہداتی سیاست کا نعرہ دیا جس کی بنیاد ان مطالبات پر رکھی گئی جو ان کے نزدیک ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی صلاح و فلاح کے ضامن تھے۔ مشاورت نے اپنا 9 نکاتی منشور جاری کیا اور اعلان کیا کہ جو جماعتیں یا جو افراد اسے قبول کرلیں گے، انھیں مسلمانوں کی تائید و حمایت حاصل ہو جائے گی۔ کئی پارٹیوں نے اور کئی امیدواروں نے انفرادی طور پر مشاورت

کے عہد نامے پر دستخط کیے اور ان میں سے تقریباً 25 افراد لوک سبھا کے لیے منتخب بھی ہو گئے۔ اور بات یہیں پر ختم ہو گئی۔ ان لوگوں نے مشاورت کے عہد نامے کا پاس ولحاظ کرنا تو دور رہا اس کی جانب سے منعقد کی جانے والی خیر مقدمی تقریب میں بھی شرکت گوارا نہیں کی۔

مشاورت کی معاہداتی سیاست کا یہ حسرت ناک انجام اس لیے ہوا کہ جو لوگ اس کی تائید وحمایت سے چن کر آئے تھے وہ مشاورت سے کہیں زیادہ اپنی اپنی پارٹیوں کے فیصلوں کے پابند تھے۔ علاوہ ازیں انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ مشاورت قوت نافذہ سے قطعی طور پر محروم ہے۔ اور یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ کسی معاہدے کا احترام اس صورت میں ہی ممکن ہو سکتا ہے جب دونوں فریق اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ ایک دوسرے کو اس پر عمل کرنے پر مجبور کر سکیں۔ مشاورت اس پوزیشن میں نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے ساتھ جو عہد و پیمان کیے گئے تھے وہ کاغذ کی زینت ہی بنے رہے۔

مشاورت کے اس ناکام تجربے کے بعد بھی متعدد بار مطالبات کی فہرست پیش کی گئی اور ہمارے سیاست دانوں نے انھیں مانا بھی اور ان پر عمل کرنے کا وعدہ بھی کیا، لیکن چناؤ کے بعد اس وعدے کو بھول گئے۔ ان وعدوں پر ان کے عمل نہ کرنے کا سبب بھی یہی تھا کہ انھیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ مسلمان انھیں عمل پر مجبور کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

اب پھر یہی ہونے والا ہے۔ اس بار مطالبات کی فہرست تو پس منظر میں ہے، زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ بی جے پی کا راستہ روکنے کے لیے مسلمان اپنی اجتماعی قوت کسی ایک سیکولر پارٹی یا سیکولر پارٹیوں کے کسی ایک محاذ کی جھولی میں ڈال دیں۔ بظاہر بات خاصی معقول نظر آتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جو سیکولر پارٹی یا سیکولر پارٹیوں کا جو محاذ اقتدار میں آئے گا وہ اس بات کو یاد بھی رکھ سکے گا کہ اسے مسلم ووٹ سیکولرزم کے نام پر ہی ملے تھے۔ اور ایک سوال اس سے آگے کا یہ بھی ہے کہ کیا بی جے پی کی راہ روکنے کی ذمہ داری تنہا مسلمانوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔ آخر انہی سے یہ مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے کہ

وہ اقتدار میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے بجائے ان لوگوں کی پالکی کے کہار بن جائیں جو بی جے پی کو ایوان اقتدار میں داخل ہونے سے روکنا چاہتے ہیں۔ آخر 1947 کے بعد کانگریس اور 1970 کے بعد سے دوسری سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کرنے، ان کے مسائل ومصائب کو کم کرنے اور ملکی اقتدار میں ان کے شایانِ شان انھیں حصہ دلانے کے بجائے مسلسل انھیں آر ایس ایس اور بی جے پی جیسی جماعتوں کے خوف میں مبتلا کر کے ہی ان کے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کیوں کرتی رہی ہیں؟ آخر مسلمان خوف کی نفسیات کے کب تک اسیر رہیں گے اور کب تک ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہیں گے جنھوں نے انھیں عملاً دوسرے درجے کے شہری کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان کے مسائل ومصائب کا حل خود ان کے سوا کوئی اور تلاش نہیں کر سکتا۔ زندگی کی رزم گاہ میں جو لوگ بیساکھیوں کے سہارے داخل ہوتے ہیں اور دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلتے رہنے کو ہی سیاسی تدبر کی معراج قرار دے لیتے ہیں وہ کبھی بھی کامیابی وکامرانی کی منزل مراد سے ہم آغوش نہیں ہو سکتے۔ بیشتر حالات میں گریہ وزاری اور سینہ کوبی ہی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ یہ وہ نوشتۂ دیوار ہے جسے جو بھی چاہے آسانی سے پڑھ سکتا ہے، لیکن افسوس کہ مسلمان اسے پڑھنے سے ہمیشہ گریزاں رہے ہیں۔ وہ ان بازی گروں اور صاحبانِ جبہ ودستار کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے ہیں جو انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر کبھی اس باڑے میں اور کبھی اس باڑے میں پہنچاتے رہے ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ مسلمان اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں کہ ان کی بے وقعتی میں دن بدن اضافہ کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ ان کو قومی زندگی میں وہ مقام کیوں نہیں مل پایا ہے جو ان سے کہیں زیادہ پریشان حال طبقوں کو مل چکا ہے، یا ملنے جا رہا ہے۔ کیا اس کا سبب یہی اور صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی اجتماعی قوت کو خود اپنے لیے کبھی استعمال نہیں کیا؟ کیا اس کی وجہ یہی نہیں ہے کہ وہ اب تک صرف دوسروں کی سیاست کرتے رہے ہیں۔ آج دلت اور

پسماندہ طبقات اس لیے سرخرو بھی ہیں اور تمام سیاسی پارٹیوں کی توجہ کا مرکز بھی بنے ہوئے ہیں کہ انھوں نے اپنی اجتماعی قوت کو سیاسی قوت میں تبدیل کرنے کا گر سیکھ لیا ہے۔ انھوں نے یہ بات جان لی ہے کہ کسی جمہوری ملک میں عزت کا مقام انھیں ہی ملتا ہے جو اپنی اجتماعی قوت کو استعمال کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان یہ گر کب سیکھیں گے؟ انھیں آخر قیامت کی کس گھڑی کا انتظار ہے؟ انھیں آخر یہ کون اور کب بتائے گا کہ عزت و وقار کی زندگی انھی کو ملتی ہے جو اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دیتے ہیں اور کسی جمہوری ملک میں کسی گروہ کے اندر یہ اہلیت اس صورت میں ہی پیدا ہو سکتی ہے، جب وہ بیساکھیوں کی تلاش کا سلسلہ ختم کر دے، اور خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ لے۔ جو لوگ اپنے مصائب و مسائل کے لیے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہراتے اور دست طلب دراز کرتے رہنے کو ہی اپنا شعار بنا لیتے ہیں ان کے حصے میں محرومی و مایوسی ہی آتی ہے۔ چشم گریاں لوگوں سے بھیک کے ٹکڑے وصول کرنے میں مددگار تو بن سکتی ہے اس کے سہارے نہ تو عزت و احترام کی فضا بنائی جا سکتی ہے، نہ حقوق کی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ جب تک مسلمان اپنے آپ کو سیاسی سطح پر منظم نہیں کریں گے، جب تک قانون ساز اداروں میں ان کی نمائندگی کرنے والے لوگ معقول تعداد میں موجود نہیں ہوں گے، جب تک وہ وعدہ شکن اور ناانصافی پر مصر عناصر کو سبق سکھانے، انھیں اقتدار کے گلیاروں سے بے دخل کر دینے کا ماحول بنا دینے کی اہلیت اپنے اندر پیدا نہیں کریں گے، اور اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ جب تک وہ رونے دھونے، شکوہ شکایت اور سینہ کوبی کی روش پر گامزن رہیں گے نہ ان کی حرماں نصیبی ختم ہوگی، نہ ان کے مسائل و مصائب کے انبار میں کمی واقع ہوگی۔ یہ نوشتۂ دیوار ہے اور اگر مسلمان اس نوشتۂ دیوار کو چشم سر سے پڑھنے سے گریزاں رہیں گے تو وہ وقت بھی آ سکتا ہے (خدا کرے ایسا نہ ہو) جب زمانے کی ایک ایک ٹھوکر، وقت کی مسلسل مار انھیں ہر ہر قدم پر اسے پڑھنے پر مجبور کر دے، لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ اب بھی وقت ہے کہ مسلمان خواب خرگوش سے بیدار ہو جائیں، ملک کے سیاسی

افق پر تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو پہچانیں، اپنے آپ کو سیاسی طور پر منظم کریں، دیگر مظلوم ومحروم طبقات کے ساتھ اپنے سیاسی رشتے استوار کریں اور ان بیساکھیوں کو چھوڑ دیں جن کا وہ اب تک سہارا لیتے رہے ہیں۔ دعویٰ شاہین صفت ہونے کا اور عادات واطوار کرگسوں جیسے، یہ تضاد ختم ہونا چاہیے۔

25/اپریل 2008

○○

دریوزہ گری کے سوا اور راستے بھی ہیں

ڈنمارک اور کئی دوسرے یورپی ملکوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کے انتہائی قابل اعتراض خاکوں کی اشاعت کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوگیا ہے۔ ڈنمارک کے اخبار یولاند پوستن میں 13 فروری 2008 کو ایک خاکے کی اشاعت کے بعد اب تک 17 اخبارات ان کی باز اشاعت کا اہتمام کر کے اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ان میں ڈنمارک کے تین، سویڈن کے دو اور ہالینڈ و اسپین کے پانچ اخبارات بھی شامل ہیں۔ اور بات اب ان قابل اعتراض اور انتہائی دل آزار خاکوں کی اشاعت تک ہی محدود نہیں رہ گئی ہے۔ ہالینڈ کے ایک دریدہ دہن سیاستداں کرٹ ویلڈ رز نے قرآن کریم کے خلاف پندرہ منٹ کی انتہائی اشتعال انگیز فلم بنائی ہے جسے وہ ریلیز کرنے پر مصر ہے۔ علاوہ ازیں ایک امریکی مصنف رابرٹ اسپینسر نے ''عدم برداشت پر مبنی مذہب اور اس کے بانی کی حقیقت'' کے نام سے ایک آتش گیر کتاب تحریر کی ہے اور امریکہ کے ہی ایک ہفت روزہ ''ہیومن ایونٹس (Human Events) نے جھوٹ کی اس پوٹ کو مفت تقسیم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

ایک طرف اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر کیچڑ اچھالنے اور اسلامیان عالم کی دلآزاری کا یہ قبیح سلسلہ ہے جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے اور دوسری طرف مسلمان ہیں کہ عملاً انگاروں پر لوٹ رہے ہیں، وہ اپنے آپ کو پوری طرح بے بس پا رہے ہیں ان کے لیڈر آتش بار بیانات دے کر اور خیالی رزم گاہوں میں کشتوں کے پشتے تعمیر کر ڈالنے کے عزم بالجزم کے ساتھ اپنے عافیت کدوں میں آنے والے پر تعیش دنوں کے منصوبے بنانے میں مصروف

ہو جاتے ہیں۔ ان طالع آزما لوگوں کے لیے اہانت رسول ﷺ کے واقعات کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ یہ انھیں زبانی جمع خرچ کے ذریعہ اپنا قد مزید بڑھاتے چلے جانے کا نادر موقع فراہم کر دیتے ہیں۔

اسلامی ملکوں کی سب سے بڑی تنظیم اسلامی کانفرنس کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس کے پاس بھی شاید اسلامیان عالم کا دل دکھانے والوں کے پاس کاسہ بدست جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچا ہے۔ اس کے لیڈر بھی گرم گرم تقریریں کرتے ہیں اور آخر میں درخواست کرتے سنائی دیتے ہیں کہ یہ سلسلہ بند کر دیا جائے۔ کیا واقعتاً اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے؟ یہ درست ہے کہ یورپ میں اظہار خیال کی آزادی بذات خود ایک غیر رسمی قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہاں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تنقیدی اور کسی حد تک توہین آمیز مواد کی اشاعت بھی ممکن ہو جاتی ہے۔ ویٹی کن اور پوپ کی شدید مخالفت بھی وہاں عیسائیت کے حوالے سے قابل اعتراض فلموں کی ریلیز نہیں رکوا سکتی۔ دو سال پہلے میل گبسن کی فلم ''پیشن آف کرائسٹ'' ریلیز ہوئی، جس میں حضرت مسیح کے خلاف یہودی سازشوں کو پہلی بار منظر عام پر لایا گیا تھا۔ اسرائیل اور امریکہ کی یہودی لابی نے اس پر بڑا شور مچایا اور اس فلم کو یہود مخالف قرار دے کر ریلیز رکوانے کی کوشش کی مگر اس طاقتور لابی کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پیشن آف کرائسٹ امریکہ بھر میں ریلیز ہوئی اور اس نے اچھا خاصا بزنس کیا۔ اسی طرح کچھ عرصہ پہلے ''ڈاونچی کوڈ'' نامی فلم پر پوپ اور دنیا بھر کے عیسائی پادریوں نے اعتراضات کیے مگر ان کی مہم بھی ناکام رہی۔

اظہار خیال کی آزادی کا احترام ضرور کیا جانا چاہیے اور اس معاملے میں مسلمان بھی دوسروں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ لیکن اسے مطلق آزادی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ خود اقوام متحدہ کا عالمی منشور بھی اظہار خیال کی آزادی کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی عائد کرتا ہے کہ اس آزادی کو نفرت انگیز مواد کی ترویج و اشاعت کے لیے استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ یورپ کے وہ ممالک جو آج پیغمبر اسلام ﷺ کے دل آزار خاکوں کی اشاعت میں پیش پیش ہیں، ہولوکاسٹ کے معاملے میں اس سے بالکل مختلف رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یورپ کے دس

ملکوں نے ہولو کاسٹ کو جھٹلانا خلاف قانون قرار دے رکھا ہے۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جرمانہ کے علاوہ قید کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ ان یورپی ممالک میں جرمنی، آسٹریا، فرانس، رومانیہ اور بلجیم، سوئزرلینڈ، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، لتھوانیا اور سلوواکیہ شامل ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک برطانوی مورخ واشنگٹن ارونگ کو آسٹریلیائی قانون کے تحت 3 سال کی سزا سنائی جاچکی ہے۔

ہولو کاسٹ سے متعلق مغربی ملکوں کا رویہ اور موجودہ قانون مسلمانوں کے لیے بھی ایک نظیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تنظیم اسلامی کانفرنس کو چاہئے کہ وہ ان کے سامنے کاسہ بدست جانے اور رحم کی بھیک مانگنے کے بجائے اقوام متحدہ اور یورپی یونین کے توسط سے توہین رسالت کو عالمی سطح پر قابل تعزیر جرم کا درجہ دلانے کی کوشش کرے۔ اس سے انکار نہیں کہ یورپی ممالک کی نگاہوں میں جو مقام اسرائیل کا ہے وہ مسلم ملکوں کا نہیں ہے لیکن انکار اس سے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم ملکوں کی نمائندگی کرنے والی اسلامی کانفرنس اگر پوری قوت کے ساتھ اہانت رسول ﷺ کو تعزیری جرم کا درجہ دلانے کی کوشش کرے تو اس کی اس کوشش کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔ لیکن اس سے پہلے مسلم ملکوں کو اپنے یہاں توہین رسالت ﷺ کو لانگ آرم اسٹے چیوٹ (Long Arm Statute) کا درجہ دینا ہوگا۔ اس قانونی اصطلاح کے مطابق اگر کسی جرم کو لانگ آرم اسٹے چیوٹ کے تحت لا دیا جائے تو اس کا مرتکب خواہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کیوں نہ ہو متعلقہ ملک کا مجرم سمجھا جائے گا۔ متعلقہ ملک باضابطہ طور پر اس کی حوالگی کا مطالبہ کرسکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر انٹرپول کی خدمات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

لانگ آرم اسٹے چیوٹ کا قانون امریکہ کی تقریباً تمام ریاستوں میں نافذ ہے۔ ابتدا میں اس کے ساتھ ایک لازمی شرط یہ بھی تھی کہ متعلقہ ملزم کے خلاف اس کے ملک یا اس کی ریاست سے باہر قانونی چارہ جوئی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ریاست سے برائے نام ہی سہی کوئی تعلق ضرور رکھتا ہو لیکن انٹرنیٹ کے چلن کے ساتھ یہ شرط تقریباً معدوم سی ہو کر رہ گئی ہے۔ زپّو مینوفیکچرنگ بنام زپوڈاٹ کام (1992) میں سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں یہ گنجائش نکلتی ہے کہ ٹیوب یا انٹرنیٹ کی سہولت کے بعد ذاتی یا شخصی رابطہ ضروری نہیں رہ گیا ہے۔

50 سے زیادہ مسلم ممالک اگر اپنے یہاں توہین رسالت کو لانگ آرم اسٹے چیوٹ کا درجہ دے دیں تو اس کا ایک نتیجہ اس صورت میں بھی نکل سکتا ہے کہ یہ قانون اپنے آپ بین الاقوامی قانون کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر یوروپی ملکوں کے لیے اہانت رسول ﷺ کی کانٹوں بھری راہ پر چلنا کچھ آسان نہیں رہ جائے گا۔ چند قدم چل کر ہی ان کے تلوے لہولہان ہو جائیں گے اور سارے کس بل نکل جائیں گے۔

ہم اگر اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو صاف دکھائی دے گا کہ امریکہ نے دہشت گردی کو اور اسرائیل نے صامیت دشمنی کو عملاً لانگ آرم اسٹے چیوٹ کا درجہ دے رکھا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں ملک دنیا کے کسی بھی ملک سے اپنے مبینہ مجرموں کی حوالگی کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ امریکہ نے دنیا کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں بے گناہوں کو اس قانون کے تحت گرفتار بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اغوا کر کے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اپنے عقوبت خانوں میں مبتلائے عذاب کر رکھا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی دونوں ہی سطحوں پر ہم سلیقے کے ساتھ قانون کے ہتھیار استعمال کرنے اور صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے بجائے یا تو شکوہ وشکایت اور سینہ کوبی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں یا پھر شعلہ بار بیانات کے ذریعہ مخالفین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دونوں ہی حربے ہمیشہ ناکام ہوتے رہے ہیں اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے کیونکہ دنیا اس کی بات سنتی ہے جسے اپنی بات کہنے کا سلیقہ آتا ہو افسوس کہ ہم نہ صرف یہ کہ اس سلیقے سے محروم ہیں بلکہ ہمارے اندر اتنی سکت بھی نہیں ہے کہ ہم پوری قوت سے اپنے مطالبے کا حق بجانب ہونا ثابت کر سکیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ دنیا ہمارے دعوے کی معقولیت کو تسلیم نہ کر لے۔

28/مارچ 2008

○○

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ایک غیر ملکی اخبار نے اپنے مسلم نامہ نگار کے حوالے سے پونے میں مسلم خواتین کے ایک اجتماع سے متعلق ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے جس میں ان کی فکرمندیوں کے مختلف دائروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انڈین مسلم ویمن فار ایجی ٹیشن (Indian Muslim Women for Agitation) نامی اس تنظیم کی 5 اگست کو منعقد ہونے والی یہ تیسری سالانہ کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس کا بنیادی رخ تو مسلمانوں کی عام دینی اور سماجی تنظیموں کے رویہ سے عام بیزاری کا رہا لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے مسائل بھی اٹھائے گئے جن کی زد عام طور پر غریب مسلمانوں پر پڑتی ہے۔ کانفرنس میں یہ بات برملا کہی گئی کہ مسلمانوں کی دینی اور سماجی تنظیمیں حقیقی معنوں میں ملت کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ یہ عملاً یا تو سرکار دربار کی نمائندگی کرتی ہیں یا مفادات حاصلہ کی۔ انھیں بوجوہ میڈیا کا بھرپور تعاون حاصل رہتا ہے، بیشتر حالات میں انھیں میڈیا کی تخلیق بھی کہا جاسکتا ہے۔

کانفرنس کے شرکاء کی اس رائے سے صدفی صد اتفاق تو مشکل ہے لیکن اگر مبالغہ کے پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کی قیادت کی دعویدار تنظیمیں اکثر و بیشتر ملت کے سواد اعظم کی توقعات پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ وہ گروہ جس کے ہاتھوں میں عملاً حکومتوں کو بنانے اور بگاڑنے کی قوت مرکوز ہو، جسے نظر انداز کر کے یا جس کی مخالفت مول لے کر کسی بھی سیاسی پارٹی کے لیے ملک کی بیشتر ریاستوں یا دہلی کے ایوان اقتدار میں اپنی موجودگی بنائے رکھنا ایک دشوار امر نظر آتا ہو اس کے افراد اگر

اجتماعی اور انفرادی دونوں ہی سطحوں پر بیچارگی، کسمپرسی، استحصال، محرومی اور ظلم و جبر کے نہ صرف یہ کہ شکار ہوں بلکہ وہ اس صورت حال پر کسی حد تک قانع بھی نظر آنے لگے ہوں اور عملاً یہ مان کر چلنے لگے ہوں کہ اس ملک میں وہ کوئی مثبت، باوقار اور اپنے شایان شان رول ادا کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں رہ گئے ہیں تو ملی اور دینی قیادت اس صورت حال کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتی۔ جو ملت سماجی تحفظ کے سائبان سے محروم لوگوں کے لیے سائبان بن سکتی تھی وہ اگر خود اپنے سروں پر سائبان نہ ہونے کا شکوہ کرتی اور دوسروں سے سائبان مہیا کرنے کی التجا کرتی نظر آتی ہو تو اس کی ذمہ داری کلی طور پر نہ سہی بڑی حد تک ہماری اس مذہبی، سماجی اور سیاسی قیادت پر ہی عائد ہوتی ہے جس کی نظر ہمیشہ اپنے گروہی اور نجی مفادات پر ہی رہی ہے جو مسلمانوں کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے اپنا سیاسی قد بڑھاتی اور سرکار دربار میں رسائی کی نت نئی راہیں تلاش کرتی رہتی ہے۔ اگر مسلم خواتین کی یہ کل ہند تنظیم مذہبی قیادت سے بیزاری کا اظہار و اعلان کرتی ہے تو اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہماری دینی قیادتیں اپنے عمل اور بے عملی دونوں ہی کے ذریعہ وہ فضا، وہ ماحول بنانے میں معاونت کرتی رہی ہیں جو خواتین کو ان حقوق سے محروم رکھنے میں مددگار رہا ہے جو اسلام نے انھیں عطا کیے ہیں۔ انھوں نے مساوات مرد و زن کے اسلامی مفہوم کو کچلا کر رکھ دیا ہے۔ ان حالات میں اگر خواتین کی کوئی تنظیم ان کے خلاف انگشت نمائی کرتی ہے تو اس کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

کانفرنس میں مندوبین نے اپنی اپنی ریاستوں میں عام مسلمانوں کو درپیش مسائل کی نشاندہی کی کوشش بھی کی۔ مثال کے طور پر گجرات کی ایک خاتون نے بڑے ہی دکھ کے ساتھ یہ انکشاف کیا کہ فرقہ وارانہ قتل و غارت کے بعد بیواؤں کی ایک بڑی تعداد انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ان کی کسمپرسی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کچھ ہندو تنظیمیں انھیں 500 روپے اس شرط کے ساتھ دے رہی ہیں کہ وہ ان کے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کریں۔ اگر یہ سچ ہے تو اس سے زیادہ اندوہناک، اس سے زیادہ دل شکن، اس سے زیادہ لرزہ خیز، اس سے زیادہ شرم ناک اور اس سے زیادہ تشویش انگیز کوئی اور خبر ہو

ہی نہیں سکتی۔ وہ ملت جو زکوٰۃ، خیرات، فطرہ اور صدقات کی مد میں ہر سال مجموعی طور پر تقریباً 500 کروڑ روپے نکالتی ہو اس کی بہو بیٹیاں اگر 500 روپے کے لیے ہندو دیوی دیوتاؤں کی پرستش پر مبینہ طور پر اپنے آپ کو مجبور پائیں تو اس سے بڑا المیہ کیا کوئی اور ہو سکتا ہے؟ 500 کروڑ کی اس مجموعی رقم کا تقریباً 80 فیصد حصہ ان مدرسوں پر خرچ کیا جاتا ہے جو عملاً 4 فیصد طلباء کی تعلیمی ضرورتیں ہی پوری کرتے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ اس کے جواز پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور ان لوگوں کی حق تلفی کا سلسلہ بند کیا جائے جو صحیح معنوں میں اس کے مستحق ہیں۔

گجرات کی اسی ریاست سے ایک اور خبر بھی ملی ہے جو اول الذکر خبر سے کچھ کم اذیت ناک اور اپنے مضمرات کے اعتبار سے کچھ کم تشویش انگیز نہیں ہے۔ معاصر انڈین ایکسپریس نے اپنے 7 اگست کے شمارے میں صفحہ اول پر ایک 3 کالمی خبر شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ریاست کے مختلف علاقوں میں بریلوی اور دیوبندی مناقشہ پھر پوری قوت کے ساتھ سر اٹھانے لگا ہے۔ خبر کے مطابق راج کوٹ سے تقریباً 30 کلومیٹر دور گونڈل میں اسپیشل ریزرو پولیس کا ایک کمانڈنٹ جب ایک مسجد میں نماز ادا کرنے گیا تو اسے یہ کہہ کر مسجد سے نکال دیا گیا کہ اس عبادت گاہ کے دروازے دیوبندیوں پر پوری طرح بند ہیں۔ اسی طرح کا سلوک اس سے قبل ایک پولیس سب انسپکٹر اور ایک جج کے ساتھ بھی کیا گیا تھا جو ایک اور مسجد میں نماز پڑھنے گئے تھے۔ صورت حال کتنی افسوس ناک بلکہ شرمناک بن چکی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سوراشٹر، کچھ کے علاقے میں بہت سی مسجدوں پر ایسے بورڈ لگا دیے گئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ یہ مسجدیں صرف اہل سنت والجماعت کے لوگوں کے لیے مخصوص ہیں۔ دیوبندی یا دوسرے کسی مسلک کے لوگوں کو ان میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

یہ سب کچھ گجرات کی اس ریاست میں ہو رہا ہے جہاں چند سال قبل ارباب حکومت کی مجرمانہ چشم پوشی اور بیشتر حالات میں ایڈمنسٹریشن اور پولیس کی مبینہ طور پر سرگرم اعانت کے ساتھ قتل و غارت کا وہ ہولناک ڈراما اسٹیج کیا گیا تھا جو اپنی مثال آپ ہے، جہاں شرپسندوں نے بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کو قتل کرتے وقت یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ دیوبندی ہیں یا بریلوی، شیعہ ہیں یا سنی، جہاں مسلمانوں کے گھروں کو ان کی بستیوں کو، ان کی عبادت

گاہوں کو جلاتے اور مسمار کرتے وقت بلوائیوں نے یہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی کہ یہ مکانات، یہ بستیاں، یہ عبادت گاہیں بریلویوں کی ہیں یا دیوبندیوں کی، شیعوں کی ہیں یا سنیوں کی۔ لیکن آج جب کہ فرقہ وارانہ قتل وغارت کے زخم پوری طرح مندمل بھی نہیں ہوئے ہیں اور ہزاروں لوگ اپنے آبائی ٹھکانوں سے دور انتہائی اذیت ناک حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، اب بریلوی اور دیوبندی کا سوال وہ لوگ خود اٹھا رہے ہیں جنھیں اغیار بھی ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب پر ایمان لانے والا مسلمان سمجھتے ہیں اور واقعتا ایسا ہی ہے بھی۔ ہم اول وآخر مسلمان اور صرف مسلمان ہیں، اس سے الگ نہ تو ہماری کوئی پہچان ہوسکتی ہے اور نہ اس ملک میں ہمارا کوئی مستقبل۔ خدا کرے یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں آجائے جو ملت کی وحدت پر کاری ضرب لگانے پر تلے ہوئے ہیں۔

10/اگست 2007

○○

یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کو بعد از خرابی بسیار ہی سہی اس دکھتی حقیقت کا احساس بہرحال ہو چلا ہے کہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ لولے، لنگڑے اور ہر اعتبار سے اپاہج قانون کے ذریعہ اس نے مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کی راہ روکنے کی جو کوشش کی تھی وہ عملاً بے نتیجہ ثابت ہو رہی ہے۔ 19 مئی 1986 کو مسلم خواتین (تحفظ حقوق بعد از طلاق) قانون 1986 کی منظوری کے بعد جب بورڈ کے لائق احترام اراکین اپنی اس فتح عظیم پر پھولے نہیں سما رہے تھے، ماہرین قانون اور اہل نظر پر یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ یہ آہنی ڈھال جسے ناقابل تسخیر قرار دیا جا رہا ہے آزمائش کے وقت کاغذی پیرہن ہی ثابت ہوگی۔ اور عملاً ایسا ہو بھی رہا ہے۔ اس قانون کا بنیادی نکتہ یا اصل محور یہی ہے کہ مسلم مطلقہ خواتین کے لیے نان ونفقہ یا گزارہ کا جو انتظام کیا جائے گا وہ لازماً 3 ماہ کی عدت کی مدت پر ہی محیط ہوگا۔ اس مدت کے ختم ہو جانے کے بعد سابق شوہر پر مطلقہ بیوی کی کفالت کے تعلق سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔

1985 میں سپریم کورٹ کی آئینی بینچ نے شاہ بانو کیس میں قرآن کریم کی آیات مقدسہ 241 اور 242 کے حوالے سے یہ فیصلہ دیا تھا کہ مسلم پرسنل لاء کے تحت سابق شوہر اپنی مطلقہ بیوی کی کفالت یعنی نان ونفقہ کی فراہمی کا اس وقت تک پابند ہے جب تک کہ وہ خود کفیل نہیں ہو جاتی یا عقد ثانی نہیں کر لیتی۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس فیصلے کے خلاف ملک گیر مہم چلائی اور اس مہم کے بطن سے ہی 1986 کے اس قانون نے جنم لیا جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا

گیا تھا کہ شاہ بانو کیس کا فیصلہ عملاً بے اثر ہو کر رہ گیا ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے عمائدین نے ملّت کو یہ باور کرانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا کہ انھوں نے شریعت میں مداخلت کا چور دروازہ جو ملک کی سب سے بڑی عدالت کے ایک فیصلے کے ذریعہ کھلا تھا ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کی یہ خوش فہمی یا فسوں طرازی بہت دنوں تک برقرار نہیں رہ سکی۔ 2001 میں سپریم کورٹ کی ایک آئینی بینچ نے دانیال لطیفی بنام یونین آف انڈیا میں بہت ہی دوٹوک لفظوں میں یہ کہا کہ عدالت کی آئینی بینچ نے 1985 میں جو فیصلہ سنایا تھا وہ ہر اعتبار سے درست تھا۔

مذکورہ کیس میں 5 رکنی آئینی بنچ نے 28 ستمبر کو اپنا فیصلہ سناتے ہوئے 1986 کے قانون میں مسلم خواتین کو ضابطہ فوجداری کی دفعہ 125 سے رجوع کرنے کے حق سے محروم کر دینے کو نہ صرف یہ کہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کا معاملہ قرار دیا بلکہ اسے آئین کی دفعہ 14 اور 15 کے مغائر بھی بتایا۔ علاوہ ازیں اس فیصلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سابق شوہر کے بجائے معقول اور اچھے گزارہ کے لیے مطلقہ کو اپنے اعزہ واقارب یا وقف بورڈ پر انحصار کرنے کی جو بات 1986 کے قانون میں کہی گئی ہے وہ اس امر کی مظہر ہے کہ یہ قانون ضابطہ فوجداری کی دفعہ 125 کا بدل نہیں ہے۔

دانیال لطیفی بنام یونین آف انڈیا کے فیصلے کی رہی سہی کسر جون 2007 میں جسٹس ارجیت پسایت اور جسٹس ڈی کے جین نے اقبال بانو بنام اسٹیٹ آف اتر پردیش میں پوری کر دی۔ فاضل بینچ نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ ”1986 کے قانون میں سابق شوہر پر دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں (1) وہ اپنی مطلقہ بیوی کے لیے اس کی رہائش کھانا، کپڑا اور دیگر ضروریات کے پیش نظر معقول اور اچھا انتظام (reasonable and fair provision) کرے۔ (2) اور نان ونفقہ کا انتظام کرے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ 1986 کا قانون جو شاہ بانو کے فیصلے کی قائم کردہ نظیر کے اثرات کو کالعدم اور غیر موثر کرنے کے لیے بنایا گیا تھا وہ فی الواقع اس میں مضمر معقولیت پسندی کو قانونی شکل (codify) دے رہا ہے“۔

متعدد ہائی کورٹوں نے بھی اپنے فیصلوں میں یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی ہے کہ مسلم

مطلقہ خاتون اگر وہ مفلوک الحال ہے تو سابق شوہر سے تاحیات گزارہ پانے کی حق دار ہے۔ مثال کے طور پر کلکتہ ہائی کورٹ نے شکیلہ پروین کے کیس میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ مطلقہ کو عدت کے دوران ہی اتنا کچھ دے دیا جائے کہ وہ زندگی بھر کے لیے کافی ہو۔ جسٹس پانی گرہی نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ مسلم مطلقہ خاتون کے لیے گزارہ کا بندوبست عدّت کی مدّت تک ہی محدود نہیں ہوگا۔ اس کا تعین اس کی مستقبل کی ضرورتوں کے پیش نظر کیا جائے گا۔ اس فیصلے کے تحت 1986 کے قانون کی دفعہ 3(1)(A) کا دائرہ وسیع کردیا گیا ہے تاکہ طلاق کے بعد مطلقہ انتہائی عسرت کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوجائے یا وہ سڑکوں پر نہ آجائے۔ ممبئی ہائی کورٹ نے بھی 11 جولائی 2000 کے اپنے ایک فیصلے میں کہا ہے کہ شوہر اپنی مطلقہ بیوی کے لیے عدّت میں ہی گزارہ کا ایسا معقول اور اچھا بندوبست کرنے کا پابند ہے جو زندگی بھر کے لیے یا اس وقت تک کے لیے کافی ہو جب تک کہ کسی اور سبب سے وہ اس کی حقدار نہ رہ جاتی ہو۔

اقبال بانو مقدمے میں فاضل بینچ نے ایک اور اصول بھی وضع کیا ہے کہ 1986 کا قانون مسلم مطلقہ پر ہی لاگو ہوگا یعنی اس قانون کا اطلاق اس مطلقہ پر ہوگا جسے اس کے شوہر نے قرآنی احکامات طلاق کے تحت طلاق دی ہو۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ طلاق تین بار دی گئی ہو ایک ماہ کے فصل سے یعنی تین طلاقیں دی گئی ہوں جن میں آخری واپس نہ لی جاسکتی ہو باقی کی دو قابل رجوع ہوں۔ علاوہ ازیں ان تین مہینوں کے دوران طرفین کے نامزد کردہ افراد کے ذریعہ سمجھانے بجھانے اور ثالثی کا فریضہ بھی انجام دیا گیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ایک نشست میں تین طلاق کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔ اس سے قبل متعدد ہائی کورٹ بھی ایک نشست میں تین طلاق کو قانونی طور پر تسلیم کرنے سے انکار کرچکے ہیں۔ مثال کے طور پر ممبئی ہائی کورٹ کی اورنگ آباد بینچ نے اپنے ایک فیصلے میں طلاق کی قانونی حیثیت کے تعلق سے کہا ہے کہ طلاق کا نہ صرف یہ کہ کوئی معقول سبب ہونا چاہیے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ شوہر اور بیوی کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ثالث باضابطہ طور پر افہام وتفہیم کی کوشش بھی کریں۔ اس طرح کی کسی کوشش کے ناکام ہوجانے کے بعد ہی طلاق

موثر قرار پائے گی۔ اسی طرح کی بات صدیق النساء کے کیس میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے بھی کہی ہے۔

مذکورہ بالا فیصلوں میں یہ بات پوری طرح واضح کردی گئی ہے کہ ایک نشست میں تین طلاق کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوگی اور اگر طلاق کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوگی تو ظاہر ہے 1986 کے قانون کے تحت دادرسی بھی ممکن نہیں ہوگی۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اب تک اس طرح کے کسی فیصلے کو چیلنج نہیں کیا ہے اور قرائن یہ بتاتے ہیں کہ چیلنج کرنے کی صورت میں بھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ چنانچہ دانائی کا تقاضا یہی ہوسکتا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ ایک نشست میں تین طلاق کی روایت کو دیس نکالا دے دے۔ ویسے اس کا امکان بھی کم ہی نظر آتا ہے۔ بورڈ پر احناف کی بالادستی کے پیش نظر یہ بات ممکن نظر نہیں آتی۔ جولائی 2004 میں کانپور میں بورڈ کا جو اجلاس ہوا تھا اس کی کارروائی کو اس معاملہ میں بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔

سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے متعدد فیصلوں نے مسلم خواتین (تحفظ حقوق بعداز طلاق) قانون 1986 کی تمام دفعات خاص کر دفعہ 3 اور اس کی ذیلی دفعات کو عملاً بے اثر کر کے رکھ دیا ہے۔ علاوہ ازیں ان فیصلوں میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ مطلقہ خاتون کے لیے معقول اور اچھے گزارہ کا انتظام صرف عدت کی مدت کے لیے ہی نہیں بلکہ زندگی بھر کے لیے کرنا ہوگا۔ اب ان فیصلوں کے بعد 1986 کے قانون میں کیا کچھ بچا بھی ہے جسے بچائے رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ بورڈ نے سپریم کورٹ سے رجوع کرنے اور 1986 کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے یا عدالتوں کو غیر ضروری مداخلت سے باز رکھنے کے لیے ترمیمی بل لانے کی جو بات کہی ہے اس میں نہ تو کوئی وزن ہے اور نہ اس کی پشت پر عزم وارادہ کی بے لچک قوت ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ اب تک کیوں نہیں کیا گیا۔ آخر کس چیز کا انتظار تھا۔ بورڈ کے ذمہ دار آخر پچھلے دس برسوں تک خواب خرگوش کے مزے کیوں لیتے رہے؟ کیا انھیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے فیصلے ایک ایک کر کے 1986 کے قانون کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا اعتبار بھی مٹی میں مل رہا ہے؟

امر واقعہ یہ ہے کہ پرسنل لا بورڈ خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہے اس کے پاس پانے کے لیے اب سستی شہرت کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اور رہ بھی نہیں سکتا کیونکہ ریت کی جو دیوار اس نے تعمیر کی تھی اس کا ڈھے جانا یقینی تھا۔ 1986 کے قانون کی جو درگت بنی ہے اس سے مفر نہیں تھا۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ارباب بست وکشاد اگر اب بھی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں اور مسلمانوں کو اندھے جذبات کے کسی اور سیلاب میں دھکیلنے کی کوشش نہیں کرتے تو ملت پر یہ ان کا احسان عظیم ہوگا۔

20/جولائی 2007

○○

مطالبات اور اپیلوں کا زنگ خوردہ آہنی حصار

مسلمانوں کی اپنی تنظیمیں خواہ وہ علاقائی سطح کی ہوں یا قومی یا عالمی سطح کی، عام طور پر یا تو مطالبے کرتی ہیں یا اپیلیں جاری کرتی ہیں یا اظہار تشویش کے ساتھ یہ طے کر لیتی ہیں کہ ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ مطالبے وہ دوسروں سے کرتی ہیں۔ اپیلیں کبھی خود سے لیکن بیشتر حالات میں دوسروں سے ہی کی جاتی ہیں اور تشویش بھی ان حالات و واقعات پر ظاہر کی جاتی ہے جو ان کے اپنے خیال میں دوسروں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اپنے آپ سے یہ کبھی کوئی مطالبہ نہیں کرتیں اور اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ان کے کرتا دھرتا یہ مان کر چلتے ہیں کہ مسلمانوں کے مصائب و مسائل کے لیے کلی طور پر دوسرے ہی ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ اپنے طرز عمل میں، اپنی سوچ میں، اپنے رویہ میں تبدیلی مسلمانوں کو نہیں بلکہ دوسروں کو پیدا کرنی چاہیے اور یہ تبدیلی مطالبات اور اپیلوں کے ذریعہ ہی آئے گی۔ یہ تنظیمیں یہ مان کر چلتی ہیں کہ جب وہ کسی بات پر گہری تشویش ظاہر کرتی ہیں تو دوسروں کو اپنی غلط روی کا احساس ہو جاتا ہے، ان کے مردہ ضمیر بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی روش یا تو تبدیل کر لیتے ہیں یا اس کے تعلق سے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہماری یہ تنظیمیں اور ان کے اعلیٰ دماغ کبھی یہ دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ ان کے مطالبات اور ان کی اپیلوں کو دوسرے کس حد تک سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ ان پر عمل درآمد کا تناسب کیا ہے؟ اور جن لوگوں نے اپنے دل و دماغ، اپنے ذہن و ضمیر کے دروازے حق و انصاف کی آواز کے لیے سختی سے بند کر رکھے ہوں، ان سے ظلم و جبر کی راہ ترک کر کے حق

وانصاف کی ڈگر اختیار کرنے کی اپیل عملاً وقت اور صلاحیت کے ضیاع کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مگر جن لوگوں نے شکوہ سنجی اور سینہ کوبی کو ہی اپنا شعار بنا رکھا ہو جو رزم گاہ حیات میں دشمنوں کی کلائی مروڑ دینے کے عزم وحوصلہ کے ساتھ اترنے کے بجائے بیساکھیوں کو ہی اپنا سب سے کارگر ہتھیار تصور کرتے ہوں جو کشکول بدست ہوں اور قدرت کی عطا کردہ دولت فراواں کے باوجود عملاً دوسروں کے دست نگر ہوں وہ اپیلوں اور مطالبات کی شکل میں دوسروں سے رحم کی بھیک مانگنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟

مطالبات، اپیلیں اور اظہار تشویش، مسلم تنظیموں کے یہی تین ہتھیار ہیں جنھیں وہ مسلسل استعمال کرتی رہتی ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ ان کی دھار کب کی کند ہو چکی ہے۔ اس کی تازہ مثال اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے وزرائے خارجہ کا تین روزہ حالیہ اجلاس ہے جس کی شاہکار قرار دادوں کو، جس کے شرکاء کی فکر گہر بار کو تین عنوانات کے تحت سمیٹا جا سکتا ہے اور ان تینوں میں سے ایک کا تعلق مطالبے سے، ایک کا اپیل سے اور ایک کا اظہار تشویش سے ہے۔

مطالبہ کیا گیا ہے کہ غیر ملکی فوجیں عراق سے نکل جائیں۔ تنظیم اپنے اس مطالبہ میں حق بجانب ہے۔ مگر یہ مطالبہ کچھ نیا تو نہیں ہے۔ امریکہ اور اس کے حلیف ملکوں کی فوجوں کے عراق میں داخل ہونے کے بعد سے یہ مطالبہ مسلسل سامنے آتا رہا ہے۔ مگر کیا امریکہ نے کبھی بھی اسے کسی بھی درجے میں لائق اعتناء سمجھا؟ اور کیا اسلامی کانفرنس کی تنظیم یا کسی ملک یا ملکوں کے گروپ نے جارح ملکوں سے دوٹوک انداز میں کہا کہ اگر عراق میں ان کی فوجیں انسانی حقوق، شہری آزادیوں کو ہی نہیں بلکہ عراق کے اقتدار اعلیٰ کو بھی اپنے وزنی بوٹوں سے بدستور روندتی رہیں تو وہ خاموش نہیں رہیں گے، وہ اپنے طور پر کوئی جوابی قدم ضرور اٹھائیں گے؟ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہمارا معاملہ اس ملازم جیسا رہا ہے جس نے اپنے مالک سے اپنی تنخواہ میں اضافہ پر اصرار کیا اور جب مالک نے یہ جاننا چاہا کہ اگر تنخواہ نہ بڑھائی جائے تو وہ کیا کرے گا؟ ملازم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جواب دیا کہ وہ موجودہ تنخواہ پر ہی کام کرتا رہے گا۔ ہم بھی اپنے مطالبات پر اس ملازم ہی کی طرح اصرار کرتے ہیں اور اسی کی طرح موجودہ ''تنخواہ'' پر کام کرتے رہتے ہیں، اسے آپ چاہیں تو بے حسی کا نام دے سکتے ہیں یا مسلم ملکوں

کی مجبوری کہہ سکتے ہیں، ایسی مجبوری جو خود ان کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ یہ صورت حال جب تک ختم نہیں ہوگی، عراق سے غیر ملکی فوجوں کی واپسی جیسے لاحاصل مطالبے دہرائے جاتے رہیں گے۔ جن سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بندۂ مومن جس کی آہ سحر گاہی سے کبھی شبستان وجود لرز اٹھتا تھا وہ اب ماضی کا افسانہ بن چکا ہے۔ اذانیں اب بھی مسجدوں کے میناروں سے بلند ہوتی ہیں مگر روح بلالی عنقا ہے۔

عراق سے غیر ملکی فوجوں کی واپسی کے مطالبے کے ساتھ ساتھ یہ اپیل بھی کی گئی ہے کہ اسرائیل کے بائیکاٹ اور اس پر عمل درآمد سے متعلق اصول طے کیے جائیں۔ یہ اپیل کس سے کی گئی ہے؟ ان اصولوں کی نشاندہی کون کرے گا؟ اور اگر دنیا کے ایک کروڑ سے زائد مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی اسلامی کانفرنس کی تنظیم نے یہ اپیل اپنے آپ سے کی ہے تو پھر اسے آج تک انتظار کس بات کا رہا ہے؟ کیا اسرائیل نے اہل فلسطین، لبنان اور دوسرے پڑوسی ملکوں کے ساتھ عارضی طور پر ہی سہی، کبھی بھی کوئی ایسا رویہ اپنایا ہے جسے کھینچ تان کر بھی منصفانہ کہا جا سکتا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہی ہے تو پھر اس کے ''بائیکاٹ اور اس پر عمل درآمد'' کے اصول طے کرنے میں یہ غیر معمولی تاخیر کیوں برتی گئی؟ اور بائیکاٹ صرف اسرائیل کا ہی کیوں؟ اسرائیل تو اپنے آپ میں امریکہ کی سرپرستی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔ بائیکاٹ تو اسرائیل کے ساتھ ساتھ امریکہ کا بھی کیا جانا چاہیے۔ بلاشبہ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ لیکن زندہ قومیں یا وہ قومیں جو قوت حیات کے ساتھ ساتھ عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنے کے عزم و حوصلے سے بھی معمور ہوں کبھی بھی کسی ''ٹیڑھی کھیر'' کو خاطر میں نہیں لاتیں خواہ وہ کتنی ہی ٹیڑھی کیوں نہ ہو۔ جب ہم قوت حیات سے معمور تھے، جب ہم میں جوش بھی تھا، جذبہ بھی تھا، لگن بھی تھی اور یہ احساس بھی تھا کہ اس دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کے مشن کی ذمہ داری بھی ہم پر ہی ہے تو ہم نے پسپائی کے امکان کو ختم کرنے کے لیے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی کشتیاں بھی جلائی ہیں اور تپتے صحراؤں کے سینوں کو بھی روندا ہے اس بات کا خیال کیے بغیر کہ اس کے نتیجے میں ابتلا و آزمائش کے نت نئے دروازے بھی کھل سکتے ہیں۔

اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے وزرائے خارجہ کا یہ تین روزہ اجلاس ادھورا رہ جاتا اگر اظہار تشویش کا خانہ خالی رہتا۔ چنانچہ اس اجلاس میں حسب روایت اس بات پر گہری تشویش بھی ظاہر کی گئی کہ ''اسلام فوبیا'' میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے نتیجے میں یوروپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک اور ان کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے واقعات میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ تشویش بجا ہے یوروپ کے ملکوں میں اسلام کچھ لوگوں کے ذہنوں پر کابوس بن کر سوار ہو گیا ہے۔ انھیں نقاب سے ڈر لگنے لگا ہے، عورتیں اگر اپنے سروں پر اسکارف اور مرد عمامہ باندھتے ہیں تو ان کی نیند اڑ جاتی ہے، انھیں اپنی تہذیب وثقافت ہی نہیں بلکہ اپنی آزادی اور آزادروی بھی خطرے میں پڑتی دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور اب تو مسجدوں کے مناروں سے بھی انھیں ڈر لگنے لگا ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق سوئیزرلینڈ میں اپوزیشن کی سب سے بڑی پارٹی یہ تحریک شروع کرنے جا رہی ہے کہ حکومت قانون کے ذریعہ مسجدوں میں مناروں کی تعمیر پر روک لگا دے کیونکہ ان سے مسلمانوں کے سیاسی عزائم کا اظہار ہوتا ہے۔

یورپ میں ''اسلام فوبیا'' نت نئی شکلیں اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس پر تشویش بجا ہے۔ لیکن مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ تشویش کا اظہار کر دیا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ''اسلام فوبیا'' کا توڑ کرنے کے لیے کچھ معقول قدم اٹھائے جائیں۔ پریس، پلیٹ فارم اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ باضابطہ طور پر مہم چلائی جائے۔ خود یوروپ کے مختلف ملکوں میں جو مسلمان مقیم ہیں وہ اپنے طرز عمل سے یہ بتانے اور جتانے کی کوشش کریں کہ اسلام کے نام پر، اسلامی شعائر کے حوالہ سے جو مہم چلائی جا رہی ہے اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اسلامی کانفرنس کی تنظیم اگر اظہار تشویش کے ساتھ ساتھ عملی تعاون کا کوئی نقشہ بھی ترتیب دے لے تو اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کرنے کا کام یہی ہے۔ لیکن ہماری تنظیمیں خواہ وہ علاقائی ہوں، قومی ہوں یا عالمی، مطالبات، اپیلوں اور اظہار تشویش کے حصار سے باہر نکلنا تو دور رہا اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتیں۔ ہمارے اپنے ملک میں اس کی بہترین مثال مسلم پرسنل لاء بورڈ ہے۔

اپنے آپ کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم کہنے والے اس بورڈ کے بھی کیسۂ عمل میں مطالبات، اپیلوں اور اظہار تشویش کے سوا اور کچھ بھی قابل ذکر نہیں ہے۔ مطالبات جو اکثر نا قابل التفات قرار پائے ہیں، اپیلیں جو پادر ہوا ثابت ہوتی رہی ہیں اور اظہار تشویش کی روایت جس پر توجہ دینے والے کم ہی رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اصلاح معاشرہ کی قرارداد ہر خصوصی اجلاس میں پاس ہوتی رہی لیکن آج تک اس سلسلے میں نہ تو کوئی عملی پروگرام وضع کیا گیا نہ کوئی ملک گیر مہم چلائی گئی۔ شرعی عدالتوں کی بات بڑے زور و شور کے ساتھ کی گئی لیکن چند شہروں کے علاوہ ان کا وجود کہیں نہیں ملتا۔ بورڈ کی مساعی سے مطلقہ عورتوں کے حقوق سے متعلق ایک لولا لنگڑا قانون بنایا تو گیا لیکن مختلف عدالتوں کے ذریعہ اس کی جو تعبیر و تشریح سامنے آئی اس نے عملاً اس قانون کی روح کو کچل ڈالا اور بورڈ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ بروقت عدالتوں سے رجوع کر کے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔

25 مئی 2007

OO

آخراس ڈھونگ کی ضرورت کیا ہے؟

یکم اگست کو سپریم کورٹ کی ایک 3 رکنی بینچ نے جسٹس سری کرشنا کمیشن رپورٹ سے متعلق ایک رولنگ دیتے ہوئے کہا ہے ”کہ کسی کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر تعزیری کارروائی ممکن نہیں ہے۔ اس طرح کی کسی بھی کارروائی کو ضابطہ فوجداری کے مندرجات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ ہم ریاست کو (کمیشن کی) سفارشات پر عمل کرنے کی ہدایت نہیں دے سکتے۔ جسٹس سری کرشنا کمیشن کی حیثیت ایک سفارش کرنے والی اتھارٹی کی ہے۔ ریاست کریمنل معاملات میں اس کی سفارشات پر عمل درآمد کی پابند نہیں ہے“۔

چیف جسٹس کے جی بالاکرشنن، جسٹس آر۔وی۔ رویندرن اور جسٹس دل ویر بھنڈاری پر مشتمل فاضل بینچ کی اس رولنگ کے بعد یہ سوال بجاطور پر اٹھایا جاسکتا ہے کہ جب ریاستی حکومتیں فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق تحقیقاتی کمیشنوں کی رپورٹوں کی بنیاد پر قصوروار افراد کے خلاف قانونی کارروائی کی پابند نہیں ہوسکتیں تو پھر اس طرح کا کوئی ڈھونگ رچانے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ کمیشن کیا صرف اس لیے قائم کیے جاتے ہیں کہ مظلوموں کے برہم جذبات کو وقتی طور پر آسودہ کیا جاسکے اور انھیں یہ جھوٹی آس دلائی جاسکے کہ کمیشن کی رپورٹ آنے کے بعد ظالموں کو بخشا نہیں جائے گا۔ اب تک تحقیقاتی کمیشنوں کی رپورٹوں کا مصرف کچھ اسی طرح کا رہا ہے۔ ان کی رپورٹیں آہنی الماریوں میں بند کردی جاتی ہیں اور بیشتر معاملات میں مظلوموں کو یہ پتہ تک نہیں چلتا کہ ان میں کیا کچھ لکھا ہوا ہے اور ان کی اہم سفارشات کیا ہیں۔ 1990 میں جب تحقیقاتی کمیشن قانون نے کمیشنوں کی رپورٹوں کو قانون

ساز اداروں کے سامنے پیش کرنا اور ان کے ساتھ عمل در آمد (ATR) منسلک کرنا ضروری قرار دے دیا تو اس کے بعد بھی بیشتر معاملات میں اس پر عمل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

1978 میں کانپور کے فسادات کی تحقیقات کے لیے ہائی کورٹ کے ایک جج مسٹر پارکھ کی سربراہی میں ایک یک نفری کمیشن قائم کیا گیا تھا جس نے اپنی رپورٹ میں فسادات کے لیے پی اے سی کو خاص طور پر ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس وقت اتر پردیش میں کانگریس کی حکومت تھی جس نے انتہائی خاموشی کے ساتھ اس رپورٹ کو سرد خانے کی نذر کر دیا، نہ قصورواروں کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی نہ کسی بھی گوشے سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ اس ضمن میں کانپور کے فسادات سے متعلق ماتھر کمیشن کی رپورٹ کو بھی لیا جاسکتا ہے۔ کمیشن نے 1993 سے 1997 تک 200 گواہوں کے بیانات قلم بند کرنے کے بعد ایک جامع رپورٹ مرتب کی اور مئی 1998 میں اسے حکومت کے حوالے کر دیا۔ رپورٹ میں فسادات کے لیے بھارتیہ جنتا پارٹی اور ریاستی حکومت کے ایک وزیر کو بھی قصوروار ٹھہرایا گیا تھا۔ کلیان سنگھ حکومت نے نہ تو اس رپورٹ کو اسمبلی میں پیش کیا اور نہ اس کے تعلق سے عمل در آمد رپورٹ تیار کرنے کی کوئی ضرورت محسوس کی اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کسی نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا نہ اپوزیشن نے نہ مسلمانوں کی کسی تنظیم نے۔

مثالیں تو بے شمار ہیں انھیں گنانے کی نہ تو کوئی خاص ضرورت ہے نہ کوئی حاصل۔ صورت حال کتنی افسوس ناک کتنی تشویش انگیز کتنی مایوس کن، کتنی دل شکن رہی ہے اس کا ہلکا سا اندازہ بھاگلپور اور میرٹھ وملیانہ سے متعلق رپورٹوں کے ساتھ کیے جانے والے سلوک سے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہاشم پورہ اور ملیانہ سے متعلق گیان پرکاش کمیٹی نے اگست 1987 میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ بعد ازاں جسٹس گروشرن لال سریواستو کی سربراہی میں ایک اور کمیٹی قائم کی گئی جس نے اگست 1989 میں اپنی رپورٹ حکومت کے حوالے کر دی۔ ان دونوں رپورٹوں میں مبینہ طور پر مسلمانوں کے قتل کے لیے پی اے سی کے کچھ نوجوانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ ان دونوں رپورٹوں کو صیغہ راز کی دستاویز قرار دے کر ہمیشہ کے لیے

الماریوں میں بند کر دیا گیا۔ یہ رپورٹیں حکومت کی تحویل میں اس وقت بھی رہیں جب ملائم سنگھ یادو وزیر اعلیٰ تھے اور اس وقت بھی جب وزیر اعلیٰ کی کرسی پر مایاوتی اور کلیان سنگھ کا قبضہ تھا۔

335 صفحات پر مشتمل بھاگلپور رپورٹ میں بھی اس وقت کے بھاگلپور رینج کے انسپکٹر جنرل آف پولیس گنگا پرساد دھورے پر بالواسطہ طور پر مسلمانوں کے خلاف فضا بنانے اور ایس پی کے ایس دویدی پر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ رپورٹ میں مسلمانوں کی ہلاکتوں، لوٹ مار اور آتش زنی کے لیے آر ایس ایس، وشوہندو پریشد اور بی جے پی کے ساتھ پولیس کی سانٹھ گانٹھ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں بھاگلپور کے فسادات سے ہی متعلق ایک اور تحقیقاتی رپورٹ بہار کے اس وقت کے ڈائرکٹر آف انڈسٹریز اے کے سنگھ نے بھی تیار کی اور اس رپورٹ میں بھی پولیس کے ذمہ داروں اور وشوہندو پریشد، بجرنگ دل اور بی جے پی پر فسادات کی آگ بھڑکانے کے الزامات عائد کیے گئے تھے۔ یہ دونوں رپورٹیں ریاستی وزارت داخلہ کی کسی آہنی الماری میں بند ہیں جنھیں کچھ عرصہ بعد دیمک چاٹ جائے گی یا یہ کسی ردی فروش کے حوالہ کر دی جائیں گی۔ یہ دونوں رپورٹیں اس وقت حکومت کے حوالہ کی گئیں جب وزیر اعلیٰ کی مسند پر لالو پرساد یادو براجمان تھے۔

یہ تو رہی کچھ تحقیقاتی کمیشنوں کے حوالے سے مختلف حکومتوں کے رویہ کی بات جو عملاً ایک جیسا رہا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس حمام میں ساری جماعتیں ساری تنظیمیں ساری حکومتیں عملاً بے لباس رہی ہیں۔ اب رہی سہی کسر جسٹس سری کرشنا کمیشن کے حوالے سے سپریم کورٹ کی تازہ رولنگ نے پوری کر دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب صورت حال اس طرح کی ہی ہے تو پھر تحقیقاتی کمیشنوں کا ڈھونگ مزید رچاتے رہنے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ اور دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ ان کمیشنوں کو مفید، موثر اور کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کمیشنوں کی روایت کو اگر برقرار رکھنا ہے تو اس دوسرے سوال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جانا چاہیے۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کمیشن آف انکوائری ایکٹ کی ذیلی دفعہ 3(4) کو منسوخ کر دیا جائے جس کے تحت ریاستی حکومتوں کو تحقیقاتی

کمیشنوں کی رپورٹوں کو کلی یا جزوی طور پر مسترد کر دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس کی جگہ ایک نئی دفعہ شامل کی جائے جس کے تحت ریاستی حکومتوں کو کمیشنوں کی رپورٹوں کو ریاستی اسمبلیوں میں رکھنے اور ان کی سفارشات پر عمل درآمد کا پابند کیا جائے۔ علاوہ ازیں تحقیقاتی کمیشنوں کو باضابطہ طور پر عدالتی کمیشنوں کا درجہ دیا جائے۔ کمیشن آف انکوائری ایکٹ میں ترمیم کر کے ان کمیشنوں کو وہ تمام اختیارات دیے جائیں جو عدالتوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ انھیں یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی اس حیثیت میں مجرموں کی نشاندہی کے علاوہ ان کے خلاف لازمی عدالتی کارروائی کی ہدایت بھی دے سکیں۔ ان ترمیمات کے بغیر تحقیقاتی کمیشنوں کی حیثیت ایک خوبصورت کھلونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگی۔ ایک ایسا کھلونا جو مظلوموں کو بہلانے، پھسلانے کے کام آتا رہا ہے۔

2 اگست 2007

○○

امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

ریاض میں عرب لیگ کی 19 ویں چوٹی کانفرنس کو اگر عرب اتحاد، عرب یکجہتی اور عرب وقار کی بحالی کی جدوجہد کی راہ میں ایک اہم سنگ میل کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ یہ کانفرنس اس اعتبار سے پہلے کی کانفرنسوں سے خاصی مختلف رہی ہے کہ اس کے انعقاد سے قبل مختلف سطحوں پر کافی تیاری کی گئی تھی۔ سعودی فرماں روا شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے پہلے متعدد عرب لیڈروں سے باضابطہ ملاقات کر کے متعلقہ مسائل پر گفتگو کرنے اور اتفاق رائے کی فضا تیار کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہے۔ علاوہ ازیں ان کی مساعی کے نتیجہ میں مکہ میں فتح اور حماس کے لیڈروں کی ملاقات ہوئی اور دونوں گروپ قومی حکومت قائم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس حکومت میں دونوں گروپوں کو متناسب نمائندگی حاصل ہے۔

فلسطین میں قومی حکومت کے قیام کو اگر عرب چوٹی کانفرنس کی پیشگی تیاریوں کے آئینے میں دیکھا جائے تو اسے بلاشبہ ایک غیر معمولی کامیابی اور دوررس مضمرات کی حامل ایک زبردست حکمت عملی کا ہی نام دیا جائے گا۔ 2002 کی بیروت کانفرنس میں جب شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے بحیثیت ولی عہد مملکت ''زمین کے بدلے امن'' کا منصوبہ پیش کیا تھا تو بین الاقوامی سطح پر اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔ امریکہ، اسرائیل اور یورپی ملکوں نے اگر اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا تو خود فلسطین کے ذمہ داروں کا رویہ بھی مایوس کن رہا تھا انھوں نے اسے شمہ برابر بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ بڑی دلچسپ صورت حال تھی۔ جن کے

درد کا درماں تلاش کیا جا رہا تھا انھیں نہ طبیب پر اعتماد تھا نہ اس کے نسخہ پر۔ چنانچہ سب کچھ وقتی طور پر دریا برد ہو گیا۔ اسی کے ساتھ عربوں کی بے وقعتی، فلسطینیوں کی حرماں نصیبی اور اسرائیل کی چیرہ دستیوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ فلسطینی تل تل کر مرتے رہے لیکن عالمی ضمیر نے کبھی کوئی کھٹک محسوس نہیں کی۔ دنیا کا سب سے بڑا چودھری قصر ابیض میں نت نئی سازشوں کے جال بنتا اور اسرائیل کے خون آشام حکمرانوں کی مسلسل پیٹھ تھپتھپاتا رہا، انسانیت خاک بسر پا برہنہ کونوں کھدروں میں منھ چھپاتی اور انسانی بہیمیت پر خون کے آنسو روتی رہی۔ لیکن کسی کا دل نہیں پسیجا اور یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ کیونکہ جو لوگ طاقت اور صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں، جو اپنے نجی اور گروہی مفادات کے ترازو میں ہی ہر چیز کو تولتے ہیں اور جن کے یہاں دیانت، اخلاق، مروت اور انسانیت کو کھوٹے سکوں جتنی بھی اہمیت حاصل نہیں ہوتی وہ ظاہر ہے مظلوم، مجبور، بے سہارا اور حصول انصاف کے لیے کاسہ سر سے کہیں زیادہ دست کشکول پر تکیہ کرنے والوں کے ساتھ نہ تو انصاف کر سکتے ہیں نہ ان کا چھنا ہوا حق انھیں واپس دلا سکتے ہیں۔

لیکن اب صورت حال کچھ بدل سی گئی ہے۔ عرب اتحاد اور عرب یکجہتی کو ریاض چوٹی کانفرنس میں ایک نئی طاقت ملی ہے۔ اس کانفرنس میں شریک عرب زعماء نے شاہ عبداللہ کو ببانگ دہل یہ کہتے سنا کہ عرب عوام کو اگر ہم پر اعتبار نہیں رہا اور وہ اپنے خوش حال مستقبل سے بھی مایوس نظر آتے ہیں تو اس کا سبب ہم اور صرف ہم ہیں کیونکہ ہم نہ اپنے مستقل اختلافات پر قابو پا سکے اور نہ اتحاد کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ یہ بڑی تلخ بات تھی اس طرح کی باتیں وہ لوگ کیا کرتے ہیں جنھیں اپنی حکومتوں کا، اپنے حکمرانوں کا مخالف سمجھا جاتا ہے۔ اب پہلی بار یہ بات کسی لاگ لپیٹ کے بغیر وہ شخص کہہ رہا تھا جو خود بھی عرب قیادت کا ایک اہم حصہ تھا۔ اس کی اس حق گوئی پر نہ کوئی احتجاج ہوا نہ کسی نے دبے سروں میں بھی اختلاف کیا نہ چہروں پر کوئی شکن پڑی۔ دل سے جو بات نکلی تھی وہ دلوں تک پہنچ گئی اور دلوں میں گھر کر گئی۔ اسے اگر آپ چاہیں تو عرب حکمرانوں کے ذہن و مزاج میں نمایاں تبدیلی کا نام دے سکتے ہیں یا چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب انھیں یہ احساس ہو چلا ہے کہ پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی، یہ احساس بڑی بیش قیمت چیز ہے اور عرب چوٹی کانفرنس کی فکری کارگاہ میں ڈھالا

جانے والا یہی وہ انتہائی موثر ہتھیار رہے جسے عرب امن منصوبہ کی حمایت میں پوری قوت کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر پوری دنیا میں 2002 کے مقابلے میں اس بار عرب منصوبہ کو کہیں زیادہ لائق توجہ سمجھا گیا۔ امریکہ اور یورپی یونین نے محتاط انداز میں اس کا خیر مقدم کیا، انھوں نے پہلے کی طرح اسے پہلی ہی نظر میں مسترد نہیں کیا۔ یہ کچھ کم اہم بات نہیں ہے۔ اسرائیل کا رویہ بھی خاصا بدلا بدلا سا ہے۔ 2002 میں جنگ باز ایرل پیریز وزیر اعظم تھے۔ فلسطینیوں کی دشمنی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ انھوں نے عرب امن منصوبے کو یہ کہہ کر بڑی حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا تھا کہ اس کی قدر و قیمت اس کاغذ کے برابر بھی نہیں ہے جس پر یہ لکھا گیا ہے۔ لیکن اب ایہود اولمرٹ وزارت عظمیٰ کی مسند پر براجمان ہیں۔ ان کے تعلق سے کسی خوش فہمی کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے غالباً حالات کے شدید دباؤ کے تحت امن منصوبے کے تعلق سے وہ رویہ اختیار کیا ہے جو ایرل پیریز کے رویے سے کسی حد تک مختلف ہے۔ انھوں نے یکم اپریل کو جرمن چانسلر اینجلا مارکل کے ساتھ ایک مشترک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے تمام عرب سربراہوں کو ملاقات کی دعوت دے ڈالی۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے پناہ گزینوں کی وطن واپسی کے تعلق سے انتہائی سخت موقف کا اظہار بھی کیا۔ ظاہر ہے عربوں کے لیے اولمرٹ کی یہ پیشکش قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

ریاض چوٹی کانفرنس میں عربوں نے اپنا متفقہ موقف اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا۔ کانفرنس نے جو قرارداد منظور کی ہے وہ اس بات کی مظہر ہے کہ پوری عرب دنیا فلسطینیوں کی جدوجہد کی غیر مشروط تائید وحمایت کرتی ہے، فلسطینیوں کے حقوق اور فلسطینی اقتدار اعلیٰ سے کم تر کوئی اور چیز اس کے لیے قابل قبول نہیں ہوگی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہی اس نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بنیادی شرط یہ رکھی ہے کہ اسرائیلی فوج 1963 کی سرحدوں پر واپس لوٹ جائے۔ فلسطین کی آزاد وخود مختار ریاست کو تسلیم کرے اور تمام فلسطینی پناہ گزینوں کو اسرائیل میں اپنے گھروں کو واپس لوٹنے کا حق دے۔ یہ تینوں

چیزیں باہم مربوط ہیں ان میں سے کسی ایک کو مسترد کرنے کا مطلب پورے منصوبے کو مسترد کرنا ہوگا۔ البتہ مختلف سطحوں پر ان پر بات چیت ہو سکتی ہے لیکن سربراہوں کی سطح پر اولمرٹ اور دوسرے لوگوں سے بات چیت صرف اس صورت میں ہی ممکن ہے جب اسرائیل اصولی طور پر عرب منصوبے کو اس کے واضح اور نا قابل تنسیخ خط و خال کے ساتھ تسلیم کر لے۔

امریکہ اور اسرائیل اب تک قیام امن کی ان تجاویز کو ہی روبکار لانے پر آمادگی ظاہر کرتے رہے ہیں جن کے تحت فلسطینیوں کے حقوق کو بدستور پامال کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل ہو سکیں۔ اوسلو، میڈرڈ، شرم الشیخ اور کئی دوسرے شہروں میں جن سمجھوتوں پر اسرائیل نے دستخط کیے ان پر صرف اتنا ہی عمل کیا جتنا کہ اس کی لوٹ کھسوٹ اور جبر و ظلم کی روایت کو تقویت پہنچاتے رہنے کے لیے ضروری تھا۔ سوال یہ ہے کہ رعایتوں کا مطالبہ صرف فلسطینیوں سے ہی کیوں کیا جائے؟ رعایتیں تو دونوں فریق ایک دوسرے کو اس لیے دیتے ہیں کہ کسی متفقہ حل تک پہنچا جا سکے۔ اس ضمن میں عرب چوٹی کانفرنس کا پیغام بہت ہی واضح ہے اور وہ یہ کہ یکطرفہ رعایتوں کا اب سرے سے کوئی سوال نہ تو اٹھایا جائے گا نہ اس پر عمل ہوگا۔ عرب کانفرنس نے اپنا منصوبہ پوری طرح دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ پوری عرب دنیا کی آواز ہے۔ پوری عرب دنیا اس کی پشت پر ہے۔ اگرچہ یہ بات کہی نہیں گئی ہے تاہم اس منصوبے کے بین السطور میں اس دہکتی حقیقت کی تپش کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اگر امریکہ اور اسرائیل نے اسے مسترد کر دیا تو تشدد اور قتل و غارت اس خطے کا مقدر بن جائے گا۔ یہ ایک ایسی آگ ہوگی جس کی لپٹوں سے تل ابیب بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

عرب چوٹی کانفرنس نے اس بار ایک قدم اور آگے بڑھ کر ایک ورکنگ گروپ بھی قائم کیا ہے جو اسرائیل، اقوام متحدہ، یورپی یونین، امریکہ اور روس کے نمائندوں سے مل کر عرب منصوبے پر گفت و شنید کرے گا۔ اس ورکنگ گروپ کے ممبروں کو 11 رکنی عرب لیگ کمیٹی سے لیا جائے گا جو عرب سربراہ کمیٹی کے ذریعہ قائم کی گئی ہے۔ اس میں اردن اور مصر کے نمائندے بھی شامل ہیں جنھوں نے اسرائیل کو تسلیم کر رکھا ہے۔

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ریاض چوٹی کانفرنس اس اعتبار سے بہر حال کامیاب رہی ہے کہ اس کے دوران آپس میں افہام وتفہیم کے مراحل بھی خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیے گئے اور نیتوں اور عزائم کی سطح پر عرب سربراہ ایک دوسرے کے کافی قریب بھی آئے۔ سرد مہری کی برف بھی پگھلی اور ایک روڈ میپ کی صورت گری بھی عمل میں آئی۔ سربراہ کانفرنس تو بلاشبہ کامیاب رہی لیکن اصل مرحلہ ابھی باقی ہے۔ اس کا تعلق بین عرب تعلقات میں یکجہتی کو ایک مستقل عنصر کی جگہ دلانے سے ہے۔ چنانچہ کانفرنس کے بعد ریاض اور دوسری راجدھانیوں میں فطری طور پر جو سوال پوچھا جارہا ہے وہ یہی ہے کہ ریاض کے بعد کیا ہوگا؟ اس ضمن میں فلسطین کے علاوہ عراق اور لبنان کا تذکرہ خاص طور پر کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک عراق کا تعلق ہے یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ عراق کو اہل عراق کے حوالہ کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ ایسا نہیں ہے جو انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہو۔ اس ضمن میں اس بات پر بھی خاص طور پر توجہ دی جانی چاہیے کہ عربوں کو وہ مقام یقینی طور پر حاصل ہو جو انھیں قومی زندگی کے مختلف دائروں میں ملنا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی مفاہمت کے عمل کو تیز رفتار، ہمہ گیر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے آئین کی اختلافی دفعات پر نظر ثانی کی جائے، بعث پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کے خلاف جو مہم چلائی جارہی ہے اس کا ازسرنو جائزہ لیا جائے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے موثر راستے تلاش کیے جائیں۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ قومی مفاہمت کی کسی قابل بھروسہ شکل کے ابھرنے سے پہلے اگر امریکی فوج واپس چلی گئی تو تباہی و بربادی کے نئے دروازے کھل جائیں گے۔ عراق کی صورت حال بہت ہی پیچیدہ ہے۔ یہاں کامیابی حاصل کرنا کچھ آسان نہیں ہوگا۔ لیکن کوشش تو بہر حال کی ہی جانی چاہیے، خاص طور پر مسلکی تشدد پر ہر ممکن طور پر بند باندھنا بے حد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں عرب ممالک اور ایران کو باہم مل کر کوئی مناسب راستہ تلاش کرنا چاہیے۔

اس سے شاید ہی انکار کیا جاسکے گا کہ سارے مسائل کا اب بھی معقول ومناسب حل تلاش نہیں کیا جاسکا ہے لیکن انکار اس سے بھی نہیں کیا جاسکتا کہ عرب افق پر جو سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے وہ چھٹنے لگے ہیں اور سرد مہری کی برف پگھلنی شروع ہوگئی ہے۔ شام کے

صدر نے شاہ عبداللہ سے تبادلہ خیالات کے بعد بظاہر اکیلے چلنے کا رویہ ترک کر دیا ہے اور اس بات کی قوی امید ہے کہ ان کے اس تبدیل شدہ رویہ کی جھلک لبنان کے حالات میں بھی نظر آئے گی۔ چوٹی کانفرنس نے ایک قرارداد میں لبنان کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اعادہ کیا ہے۔ اس میں حکومت کی سیاسی اور معاشی تائید وحمایت کی بات بھی کہی گئی ہے تا کہ لبنان کے قومی اتحاد، استحکام، سلامتی اور اقتدار اعلیٰ کو قابل بھروسہ تحفظ فراہم کیا جاسکے۔ قرارداد میں حکومت لبنان کے تجویز کردہ 7 نکاتی منصوبے کی تائید وحمایت بھی کی گئی ہے۔

عرب چوٹی کانفرنس نے شام پر عائد پابندیوں کو کلی طور پر مسترد کرنے کے علاوہ عرب آزاد تجارتی زون کی توسیع کی وکالت بھی کی ہے۔ اپنی ایک قرارداد میں کانفرنس نے پرامن مقاصد خاص طور پر بجلی کی پیداوار میں اضافہ کے لیے ایٹمی توانائی کے استعمال پر زور بھی دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پورے خطے کو نیوکلیائی ہتھیاروں سے پاک رکھنے کی بات بھی کہی ہے۔ اس کا اطلاق ظاہر ہے ایران پر نہیں ہوتا کیونکہ وہ یہ بات بار بار دوہراتا رہا ہے کہ اس کا ایٹمی پروگرام پرامن مقاصد کے حصول کے لیے ہی ہے۔

3 اپریل 2007

○○

مسلمانوں کی سیاسی جماعت

امکانات اور اندیشے

جماعت اسلامی کی قیادت میں استعمار مخالف محاذ کی تشکیل کو ہر زاویے سے ایک بہت اچھی خبر ہی کہا جائے گا۔ اس خبر کی افادیت واہمیت اس صورت میں اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ مذکورہ محاذ کو بائیں بازو کی پارٹیوں، خاص کر سی پی ایم اور سی پی آئی کا سرگرم تعاون حاصل ہوگا۔ اسے آپ چاہیں تو اجتماع ضدین کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹیاں اور جماعت اسلامی ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوسکتی ہیں یہ بات پہلے کبھی سوچی بھی نہیں جاسکتی تھی لیکن اب یہ ایک حقیقت بنتی دکھائی دے رہی ہے۔ جماعت اسلامی نے اقامت دین (یہ معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا) کے جس نصب العین کو حرز جان بنا رکھا ہے اس کا دائرہ سیکولر جمہوریت کے اثبات اور سیاست کو شجر ممنوعہ کی فہرست سے خارج کرنے سے لے کر کمیونزم کی نظریاتی اساس سے نمائشی اختلاف کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹیوں سے تعاون اور ان کے شانہ بشانہ چلنے کے عزم محکم تک وسیع ہو چلا ہے۔ یہ ایک خوش آئند علامت اور ہندوستانی مسلمانوں کے حوالے سے ایک فال نیک ہے۔ جماعت اسلامی نے یہ راستہ نصف صدی میں طے کیا ہے۔ اسے یہ حقیقت سمجھنے میں 50 سال سے بھی زیادہ لگ گئے کہ کسی کثیر مذہبی سماج میں سیکولر جمہوریت ہی تعمیر وترقی کی ضامن بھی بن سکتی ہے اور اسی کے ذریعہ مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان قرار واقعی توازن بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ جماعت اسلامی کی قیادت

نے عملاً اس بنیادی حقیقت کو تسلیم بھی کر لیا ہے اور سیاست میں باقاعدہ حصہ لینے کے فیصلے کے ذریعہ عملاً اس کی توثیق بھی کرنے جارہی ہے۔ اس صورت میں ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی اپنی ایک سیاسی جماعت بھی مل جائے گی اور ایک ایسا پلیٹ فارم بھی جس کے ذریعہ وہ دوسروں سے برابری کی سطح پر بات کر سکیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے۔

بظاہر یہ تصویر بڑی دل آویز دکھائی دیتی ہے۔ 15 کروڑ مسلمانوں کی اجتماعی آواز تو بہر حال ہونی ہی چاہیے، انھیں اس پوزیشن میں بھی ہونا چاہیے کہ وہ اپنے حقوق کا تحفظ کر سکیں اور اپنی مخصوص شناخت کو ختم کرنے کی منظم کوششوں کا مقابلہ بھی کر سکیں۔ یہ ایک بڑا کام ہے۔ اس کے لیے دوراندیشی کی بھی ضرورت ہے اور لگن کی بھی۔ اس مجوزہ جماعت کے قائدین کو بھی اور کارکنوں کو بھی ایثار پیشہ، بے غرض اور خود شناس و خودنگر ہونا چاہیے اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو اور انکار اس سے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت مسلمانوں کی جو دینی اور سیاسی پارٹیاں موجود ہیں وہ اس معیار مطلوب پر کھری نہیں اترتی ہیں۔ جہاں تک دینی جماعتوں اور دینی حلقوں کا تعلق ہے یہ بڑی حد تک ''پاپوش کلچر'' کے زیر اثر ہیں۔ ان کے یہاں بلندی کے مدارج طے کرنے کے لیے ''روحانی قربت'' اولین شرط کی حیثیت رکھتی ہے جو اکثر و بیشتر کفش برداری کی صلاحیت سے نسبتاً زیادہ آسان طریقے سے حاصل ہوتی ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ اس کی نمایاں ترین مثال ہے جس کے دروازے ابھی تک یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شعبۂ قانون کے ممتاز مسلم اساتذہ اور ماہرین عمرانیات پر بند ہیں حالانکہ مسلم پرسنل لاء کے معاملے میں کسی گمنام مکتب کے مولوی کے مقابلے میں ان کی رائے زیادہ باوزن بن سکتی ہے۔ اس پاپوش کلچر کے نتیجے میں تشکیل پانے والا یہ بورڈ کیا کچھ کر سکا ہے اس کا اندازہ مسلم مطلقہ خواتین سے متعلق قانون سے لگایا جا سکتا ہے جسے بلاشبہ ہندوستان کی کتاب قانون میں درج سب سے زیادہ لغو، بے مصرف اور سوراخ در سوراخ قانون کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اسے قانون کا نام دینا عملاً قانون کا مذاق اڑانا ہے۔ یہ اس پاپوش کلچر کا ہی کرشمہ ہے کہ ڈاکٹر طاہر محمود جیسے ماہر آئین و قانون جنھیں قانون دانوں کے بین الاقوامی اجتماعات میں انتہائی عزت و احترام کے ساتھ سنا جاتا ہے، جن کی نکتہ سنجی اور نکتہ شناسی کو قانونی

حلقوں میں سراہا جاتا ہے، جنھیں انگریزی زبان پر عبور حاصل ہے، دین وملت سے جن کا قلبی لگاؤ ہمیشہ جگ ظاہر رہا اور جن کی کتابوں کے حوالے خاص کر مسلم پرسنل لاء کے معاملے میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے فیصلوں میں ملتے ہیں وہ پرسنل لاء بورڈ کی نگاہ میں ناقابل التفات قرار پائے ہیں اور فیصلہ کن پوزیشن انھیں حاصل ہے جو قانون کی الف ب سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ مثالیں اور بہت سی ہیں اور معاملہ صرف مسلم پرسنل لاء بورڈ کا ہی نہیں اس پاپوش کلچر کی زد میں دوسری دینی جماعتیں ہی نہیں بلکہ وہ بڑے بڑے مدرسے بھی ہیں جنھیں دین کا قلعہ کہا جاتا ہے اور جن کے قلعہ داروں میں اکثر جوتیوں میں دال بٹتی دکھائی دیتی ہے۔ جماعت اسلامی بھی بتدریج اس پاپوش کلچر کی گرفت میں آتی جارہی ہے۔ سید مودودیؒ کی سب سے بڑی دین یہ تھی کہ انھوں نے شخصیت پرستی پر انتہائی بے رحمی کے ساتھ کلہاڑا چلا دیا تھا۔ اگرچہ اس معاملے میں وہ کافی دور تک نکل گئے تھے اور معیارِ حق کی بحث کے حوالے سے ان پر شدید حملے بھی کیے گئے تھے لیکن اسے ان کا کارنامہ تو بہر حال کہا جائے گا۔ افسوس کہ جماعت نے ہی انھیں سب سے بڑا بت بنا لیا۔ وہ جو شخصیت پرستی کا سب سے بڑا مخالف تھا اسے ہی اس کے ماننے والوں نے معیارِ حق قرار دے لیا اور یہ مان کر چلنے لگے کہ جو کچھ ان کی زبان اور قلم سے نکلا ہے وہی سچ ہے وہی لائقِ عمل اور دین ودنیا کی فلاح کا ضامن ہے۔ چنانچہ آج بھی جبکہ جماعت اسلامی بلاشرکت غیرے زندگی کے تمام گوشوں میں دین کے نفاذ اور طاغوت کے اخراج کے موقف سے بڑی حد تک ہٹ چلی ہے اور حکومت الٰہیہ کے بجائے سیکولر جمہوریت کے نظریہ کو اپنا لیا ہے اور سیاست کے تالاب میں اتر پڑنے کی تیاری کر رہی ہے، علامہ مودودیؒ کی کتابوں کے ذریعہ ہی لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہے۔ یہی لٹریچر ان کا ذہن بھی بناتا ہے اور ان کی تربیت بھی کرتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو جماعت کے ایک یکسو، خالص سیاسی جماعت بننے کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ سید مودودیؒ کی کتابیں جو ذہن بناتی ہیں یا بنا سکتی ہیں وہ سیکولر اور جمہوری ذہن نہیں ہو سکتا۔ زبان سے سیکولر جمہوریت کی تعریف وتوصیف اور ذہنی طور پر اسے پوری طرح قبول نہ کرنے کی صورت میں وہ کارکن اور لیڈر نہیں مل سکیں گے جو سیکولر جمہوریت کے معاملہ میں پوری

طرح یکسو ہوں، جو یہ مان کر چلتے ہوں کہ مسلمان اپنے مسائل ایک جمہوری ڈھانچے میں ہی حل کر سکتے ہیں اور اس کے لیے انھیں منظم ہو کر جدوجہد بھی کرنی چاہیے۔ دوہری سوچ اور دوہری شخصیت کے حامل پوری یکسوئی کے بجائے نیم دلانہ اقدامات ہی کر سکتے ہیں ان کی سوچ ان کے عمل سے ہم آہنگ نہیں ہوگی تو ظاہر ہے ذہنی انتشار اور سماجی خلفشار میں اضافہ ہی ہوگا۔

جماعت اسلامی اگر ایک باوقار اور مضبوط سیاسی پارٹی کا رول ادا کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنے کاڈر کو پڑھانے کے لیے نیا لٹریچر بھی تیار کرنا ہوگا اور ان کی تربیت کا نئے خطوط پر اہتمام بھی کرنا ہوگا۔ ایک ایسا لٹریچر تیار کرنا ہوگا جو یہ بتا سکے کہ کثیر مذہبی معاشروں میں اقلیتیں کس طرح اپنے لیے معقول، مناسب اور پروقار مقام حاصل کر سکتی ہیں جو یہ بھی بتا سکے کہ دینی سرگرمیوں کی اپنی حدود کیا ہیں اور دین و سیاست کا صحیح رشتہ کیا ہے۔ یہ لٹریچر اپنے قارئین کو یہ بھی بتا سکے کہ اصل چیز سماج کی تطہیر و اصلاح اور فرد کی صحیح خطوط پر تربیت ہے نہ کہ اقتدار پر قبضہ۔ جماعت اسلامی کو ابھی ایک اور لمبا ذہنی سفر طے کرنا ہے جس کے دوران اسے ان بہت سے مفروضوں سے دامن جھٹک لینا ہوگا جنھیں وہ عین حقیقت بلکہ عین دین سمجھ بیٹھی ہے۔

ان ساری دشواریوں کے باوجود موجودہ حالات میں جماعت اسلامی دوسری جماعتوں کے مقابلے میں کسی حد تک قابل قبول ہو سکتی ہے بشرطیکہ ہم یہ مان لیں کہ جو جماعتیں موجود ہیں انھی کے ملبے کے سہارے مسلم سیاست کا ڈول ڈالنا ہے۔ کیا واحد راستہ یہی ہے؟ کیا اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے؟

دنیا کی ہر تحریک، ہر تنظیم کی اپنی ایک خاص زمین ہوا کرتی ہے جس پر وہ کھڑی ہوتی ہے جس کے اندر وہ اپنی جڑیں پھیلاتی ہے۔ یہی زمین اس کی طاقت و توانائی کا اصل سرچشمہ ہوا کرتی ہے۔ مسلمانوں کی مجوزہ کل ہند سیاسی تنظیم کی یہ زمین ''ہندوستانی مسلمان'' ہیں۔ اس زمین پر کھڑے ہو کر یہ تنظیم پورے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے کام بھی کر سکتی ہے اور مسلمانوں کو کاروبار مملکت میں ان کا قرار واقعی حصہ بھی دلا سکتی ہے۔ یہ زمین گزشتہ 61 برسوں

سے کھلی آنکھوں سے مردان کار کی راہ دیکھ رہی ہے لیکن یہ انتظار ختم ہوتا دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ آزادی کے بعد منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے منظم اور فعّال جماعت جمعیۃ علماء ہند تھی جس نے آزادیٔ کامل کا نعرہ اس وقت بلند کیا تھا جب کانگریس اس عنوان سے سوچنے تک کے لیے بھی تیار نہیں تھی۔ استخلاصِ وطن کے لیے اس کے رہنماؤں اور کارکنوں نے جو قربانیاں دی تھیں انھیں بلا شبہ ہماری ملّی تاریخ کا ایک ولولہ انگیز باب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مسلم لیگ کے ہاتھوں شکست اور ملک کی تقسیم کے بعد اس نے سیاست سے دور رہنے کا فیصلہ کر لیا اور عملاً کانگریس کی تابع مہمل بن کر رہ گئی۔ اس نے مسلمانوں کو کانگریس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جو ان کا جی بھر کر استحصال کرتی رہی۔ وہ مسلمانوں کو فرقہ پرستوں کا ہوّا دکھا کر ان کے ساتھ وہ سب کچھ کرتی رہی جو شاید بدترین قسم کے فرقہ پرست بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کانگریس کے اس طرز عمل کے نتیجے میں جمعیۃ علماء کی ساکھ بھی خراب ہوئی اور کانگریسی مسلمانوں کو بھی حقارت اور شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

دوسری بڑی جماعت مسلم لیگ تھی جس کے تمام بڑے لیڈر پاکستان سدھار گئے تھے ان کے پاس ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے بارے میں سوچنے کے لیے نہ تو وقت تھا اور نہ شاید ان کے نزدیک اس کی کوئی ضرورت ہی باقی بچی تھی۔ تقسیم کے بعد جنوبی ہند کے علاوہ پورے ملک میں عملاً مسلم لیگ کا نام ونشان مٹ چلا تھا۔ مدراس کے غیر منقسم صوبے میں الحاج اسماعیل صاحب مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے مسلم لیگ کو اس کے پرچم اور نام کے ساتھ زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حالات کے انتہائی ناگفتہ بہ ہونے کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ انھوں نے دوسری چیزوں کے علاوہ کانگریس کی اس تجویز کو بھی ماننے سے انکار کر دیا کہ لیگ کے امیدوار کانگریس کے ٹکٹ پر چناؤ لڑیں۔ ابتدائی ناکامیوں اور محرومیوں کے بعد کیرلا میں حالات بدلے۔ مسلم لیگ کی قیادت کو اس کی استقامت کا صلہ ملا۔ انڈین یونین مسلم لیگ کو جسے پنڈت نہرو نے مردہ گھوڑا کہا تھا اسے خود آگے بڑھ کر کانگریس کو گلے لگانا پڑا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مسلم لیگ کو کیرلا میں نظر انداز کر دینا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ یہ ریاست کی سیاسی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہے۔ فرقہ پرستی کے حوالے سے کم از کم

کیرلا میں اسے مطعون کرنا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن ملک کی دوسری ریاستوں خاص کر شمالی ہندوستان میں یہ اپنی توسیع میں ناکام رہی ہے۔ ممبئی میں کبھی اس کے دو ممبر اسمبلی ہوا کرتے تھے لیکن اب اس کی یہ زمین سماج وادی پارٹی نے اس سے چھین لی ہے۔

اتر پردیش میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کی قیادت میں مسلم مجلس کی تشکیل کے بعد مسلم لیگ کو یہ موقع ملا تھا کہ وہ شمالی ہندوستان میں اپنے پاؤں پسار سکے لیکن اس کے لیڈروں کی تنگ نظری اور اس غلط فہمی کے نتیجے میں یہ موقع ضائع ہوگیا کہ مجلس کو جو مقبولیت حاصل ہورہی ہے اس کا اصل سبب وہی ہیں۔ انھوں نے اس غلط فہمی کے نتیجے میں کہ مسلمان مسلم لیگ کے نام کا دیوانہ ہے، اتر پردیش میں مسلم لیگ قائم کرنے کا اعلان کردیا اور مغربی یوپی سے تعلق رکھنے والے مجلس کے چند لوگوں کے سہارے اس تحریک کا عملاً گلا گھونٹ دیا جو بتدریج اتر پردیش کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے میں خاصی کامیابی حاصل کر چلی تھی مسلم لیگ کے قائدین کی ہٹ دھرمی اور ان کے اس بے جا اصرار کے نتیجے میں کہ مسلم مجلس کا نام بدل کر مسلم لیگ رکھ دیا جائے مسلم مجلس سے کہیں زیادہ نقصان مسلم لیگ کو پہنچا جسے اتر پردیش ہی نہیں بلکہ پورے شمالی اور مغربی ہندوستان سے عملاً بے دخل ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ چند شہروں میں چند لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اپنے طور پر مسلم لیگ کو زندہ کررکھا ہے۔ لیکن ان کا اپنا نہ تو کوئی سیاسی وزن ہے نہ حیثیت نہ آواز نہ تنظیمی ڈھانچہ۔ چنانچہ اب 61 سال بعد بھی مسلم لیگ عملاً کیرلا کی ایک تنظیم بن کر رہ گئی ہے۔ یہ تنظیم آزادی کے بعد کل ہند سطح کا کردار نہ کبھی حاصل کر سکی تھی نہ آج دور دور تک اس کا کوئی امکان پایا جاتا ہے۔

جہاں تک مسلم مجلس کا تعلق ہے ڈاکٹر فریدی کی رحلت کے بعد یہ انتشار اور بے عملی کا شکار ہوگئی۔ مشرقی اتر پردیش اور ریاست کے مغربی حصے میں بھی مجلس کے سرگرم لوگ ہیں اور تنظیمی ڈھانچہ بھی کسی حد تک بچا ہوا ہے لیکن زندگی کی حرارت اور سرگرم جدوجہد کا حوصلہ تیزی کے ساتھ مفقود ہوتا جارہا ہے۔ اگر کچھ ایثار پیشہ، بے غرض اور دردمند افراد آگے بڑھ کر ڈاکٹر فریدی مرحوم کی اس وراثت کو سنبھال لیتے ہیں تو اتر پردیش کی حد تک کافی کچھ کام ہوسکتا ہے

اس کے پرچم تلے مسلمان منظم ہو سکتے ہیں اور مسلمانوں کی کل ہند پارٹی کی تشکیل میں یہ اپنے طور پر ایک اہم رول بھی ادا کر سکتے ہیں۔

آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو منظم کرنے کا پہلا بڑا کام مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل کی صورت میں ہوا۔ جمعیۃ علماء ہند کو چھوڑ کر ملک کی تقریباً تمام قابل ذکر جماعتوں اور ممتاز شخصیتوں نے باہم مل کر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے نام سے ایک ایسا پلیٹ فارم تشکیل دیا جو اپنی مثال آپ تھا۔ یہ نئی تنظیم مایوسی اور محرومی کے گھپ اندھیروں میں امید کا روشن چراغ بن کر اسلامیان ہند کو ایک نئے حوصلہ، نئی امنگ سے روشناس کرانے کے علاوہ انھیں بے سمتی کی دہشت سے نجات دلانے کے ایک بہت ہی طاقتور اور نو بہ نو امکانات کے حامل سلسلۂ عمل کا نقطۂ آغاز بھی بن کر ابھری تھی۔ اس کے قائدین نے خود اعتمادی، خودنگری پر مبنی ایک نئی سوچ بھی دی تھی اور مسلمانوں کو یہ بتانے کی کوشش بھی کی تھی کہ ان پر ملک کے تمام باشندوں کی اصلاح اور ان کی صلاح وفلاح کو حتی الوسع یقینی بنانے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے اور برادران وطن کی خاصی بڑی تعداد نے مجلس مشاورت کے پیغام کو دل کے کانوں سے سنا اور اس کے قائدین کی ہر آواز پر لبیک کہا۔ چشم فلک نے وہ دن بھی دیکھا کہ مشاورت کا وفد جہاں بھی گیا ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیلاب امنڈ پڑا، لوگوں نے ان کی راہوں میں آنکھیں بچھا دیں اور دیکھتے دیکھتے ان علاقوں کی فضا بھی خاصی بدل گئی جنھیں فرقہ واریت کے کھولتے کڑھاؤ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ مشاورت کی تشکیل میں کلیدی رول ادا کرنے والی کچھ قد آور شخصیتوں کے انتقال کے ساتھ ہی ہندوستانی مسلمانوں کے اس مشترک اور معتبر ادارہ پر ان لوگوں نے قبضہ کر لیا جن کے نزدیک اس ادارے کی حیثیت ان کی دستار فضیلت میں نصب ایک اضافی کلغی کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ انھوں نے اس پلیٹ فارم کو ملت کی خدمت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اسے اپنے سیاسی، سماجی اور دینی قد کو بلند سے بلند تر کرتے چلے جانے کا ذریعہ بنا لیا۔ انھوں نے مجلس مشاورت کی روح کو عملاً کچل ڈالا، اس کے پیغام کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ قاعدوں، ضابطوں کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا اور ادارے کے آئین کو عملاً ردی کی ٹوکری میں ڈال

دیا گیا پھر نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ جب سیّد شہاب الدین اور ان کے کچھ ساتھیوں نے مشاورت کو قاعدے ضابطے کے ساتھ چلانے اور جماعت کے آئین کے تحت باضابطہ انتخابات کرانے پر اصرار کیا تو مشاورت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ایک ٹکڑے پر پاپوش کلچر کے لوگوں نے قبضہ کرلیا اور سیّد شہاب الدین دوسرے دھڑے یعنی اصل مشاورت کے باضابطہ طور پر صدر منتخب ہو گئے جو عملاً مسلم مجلس مشاورت کی بچی کھچی وراثت سنبھالے ہوئے ہے۔ (اب دونوں دھڑے متحد ہو گئے ہیں)۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہندوستانی مسلمان ہی وہ زمین ہیں جس پر ان کی مجوزہ سیاسی تنظیم کو کھڑا ہونا ہے۔ یہی وہ زمین ہے جس میں اسے ممکنہ گہرائی تک اپنی جڑیں اتارنی ہیں اور یہی وہ زمین ہے جسے اس تنظیم کو اپنی قوت حیات کو یقینی بنائے رکھنے کا وسیلہ بنانا ہے۔ یہ زمین اور مجوزہ مسلم جماعت، دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور یہی دونوں کی صحت وتوانائی کو بنائے رکھنے کی بنیادی شرط ہے۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ یہ زمین پہلے ہی کی طرح آج بھی اپنے دامن میں شادابی و زرخیزی کے بے پناہ امکانات سمیٹے ہوئے ہے۔ اب بھی سب وشتم کی وقفہ وقفہ کے ساتھ یلغار کے باوجود اس زمین سے اٹھنے والے وہ بہت سے افراد جنھیں سازگار مواقع حاصل ہو جاتے ہیں نہ صرف یہ کہ اپنے لیے معقول و مناسب جگہ بنا لیتے ہیں بلکہ ان میں کچھ تو اوج ثریا پر پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں جن کے نشان پا زندگی کے مختلف میدانوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج کا ہندوستان مسابقت کا ہندوستان ہے۔ اس میدان میں مسلمان دوسروں سے صرف اس لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ انھیں مناسب مواقع نہیں مل پاتے ہیں حالانکہ وہ عزم وحوصلہ، ذہانت اور محنت کے معاملے میں اوروں سے کم نہیں ہیں۔

چنانچہ مسلمانوں کی مجوزہ کل ہند سیاسی پارٹی کو دوسری چیزوں سے کہیں زیادہ مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والے مواقع پر توجہ دینا ہوگی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے باضابطہ طور پر تین ونگ بنائے جائیں جنھیں آپ چاہیں تو معاشی، قانونی اور سیاسی ونگ کا نام دے سکتے ہیں۔ معاشی ونگ کا بنیادی کام روزگار کے مواقع کی فراہمی پر نظر رکھنا ہوگا۔

سرکاری اور غیر سرکاری زمروں میں ملازمتوں کا حصول اس کے لیے ضروری جانکاری اور تربیت کے اہتمام کے علاوہ اس کی ذمہ داری کے دائرے میں یہ دیکھنا بھی شامل ہوگا کہ سرمایہ کاری کے جو نو بہ نو امکانات ابھر کر سامنے آتے ہیں ان سے مسلمان کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسے اس بات پر بھی نظر رکھنی ہوگی کہ مختلف پروگراموں کے تحت سرکاری سطح سے جو سہولتیں دی جارہی ہیں یا دی جاسکتی ہیں ان سے مسلمان کس حد تک فائدہ اٹھا رہے ہیں یا اٹھا سکتے ہیں۔ اقلیتوں کے نام پر جن مراعات کا ڈھنڈورہ پیٹا جارہا ہے اس کی اصل حقیقت کیا ہے یہ دیکھنا بھی اسی کا کام ہوگا۔ مجوزہ پارٹی کا یہی ونگ (بازو) مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے ریزرویشن کے امکانات اور اس کی ضرورت کا جائزہ بھی لے گا اور اس کے حوالے سے کوئی جامع پروگرام مرتب کرنے کا پارٹی کو مشورہ بھی دے گا۔

پارٹی کے دوسرے بازو کا تعلق قانونی امور سے ہوگا۔ یہ بازو نہ صرف یہ کہ مختلف قوانین اور مسلمانوں پر ان کے مبینہ اثرات پر نظر رکھے گا بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی اشتعال انگیزی کو مجاز اداروں کی نظر میں لانے کی کوشش بھی کرے گا۔ قانونی چارہ جوئی کے ذریعہ وہ ان معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرے گا جنھیں اگر سڑکوں پر لایا گیا تو بہت ہی خراب نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہی بازو ممکن حد تک مسلم پرسنل لاء خاص کر طلاق سے متعلق مسائل کو بھی سلجھانے کی کوشش کرے گا۔ قانونی اور سیاسی دونوں ہی سطحوں پر یہ اس مسئلے کا کوئی معقول حل تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ طلاق کے بعد مسلم مطلقہ خواتین کی جو درگت بنتی ہے وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اس مسئلے پر فوری اور خصوصی توجہ دی جائے۔ افسوس کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ اس معاملے میں ایک عضو ناکارہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس سے اب کسی خیر کی توقع وابستہ کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہوگا۔

مجوزہ پارٹی کے تیسرے عضو کا تعلق سیاسی امور سے ہوگا۔ اس کے ذمہ دار دوسرے دونوں بازوؤں کے ذمہ داروں سے مل کر یہ طے کریں گے کہ آئندہ پانچ برسوں کے لیے پارٹی کی اپنی پالیسی اور پروگرام کیا ہوگا۔ اس ضمن میں دوسری چیزوں کے علاوہ یہ بات بھی زیر غور آسکتی ہے کہ پارٹی کی تشکیل کے بعد جو پہلا الیکشن ہو اور اس کے بعد بھی پانچ سال تک

وہ من حیث الجماعت چناؤ میں حصہ نہیں لے گی۔ اس مدت کے دوران وہ اپنی ساری توجہ کارکنوں کی تربیت اور ملک وملت کی فلاح کے لیے وقف اپنے ایجابی پروگرام سے عوام کو روشناس کرانے پر صرف کرے گی۔ چناؤ کے معاملے میں وہ مرکز میں کسی ایک پارٹی کے ساتھ اپنی چند شرائط کے تحت سمجھوتہ کرے گی اور دیانت داری کے ساتھ اس معاہدے کو نبھانے کی کوشش کرے گی۔ اس صورت میں چناؤ کے بعد اسے یہ اندازہ بھی بخوبی ہو جائے گا کہ ان شرطوں کو دوسرا فریق کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ بھی وہی رویہ اپنایا جاتا ہے جو ماضی میں مسلم مجلس مشاورت کے ساتھ اپنایا گیا تھا تو اسے معاہداتی سیاست سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لینا ہوگا۔ اس صورت میں اس کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی ہی نہیں رہ جائے گا کہ وہ انتخابی میدان میں اپنے پرچم پروگرام، منشور اور چناؤ نشان کے ساتھ اترے خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ کسی مسلم جماعت کے انتخابی میدان میں اترنے کی صورت میں اگر بی جے پی یا کسی اور فرقہ پرست جماعت کو فائدہ ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ اس ملک میں سیکولرزم کو بچائے رکھنے کی ذمہ داری صرف مسلمانوں کی نہیں ہے۔ یہ پورے ملک کی ضرورت ہے اور اسے بچائے رکھنے کی ذمہ داری کسی ایک مذہبی گروہ کی نہیں بلکہ سب کی ہے۔

مسلمانوں کی مجوزہ سیاسی جماعت کو دوسری سیاسی جماعتوں سے ٹکراؤ کے بجائے مفاہمت کی پالیسی پر عمل کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کے وسیع تر مفادات کی نگرانی کے لیے ضروری ہے کہ وہ افہام وتفہیم کی راہ پر گامزن رہے۔ اختلافات کو مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرے۔ اشتعال انگیزی کا جواب اشتعال انگیزی سے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کی بہرصورت حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں یہ جماعت وجود میں کس طرح آئے گی؟ 60 سال تک اگر کوئی صحیح معنوں میں کل ہند جماعت قائم نہیں کی جاسکی تو کیا اب یہ ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر تلاش کی جاسکے گی۔ میرے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں بلکہ انتہائی ضروری بھی ہے۔ حالات کے بھنور نے ہمیں جہاں لاکر پٹک دیا ہے وہاں اس کے سوا کوئی اور کوئی چارہ باقی ہی نہیں بچا ہے کہ ہم اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کی کوشش کریں۔ ہمیں اس بنیادی

حقیقت کو مزید نظر انداز نہیں کرتے رہنا چاہیے کہ مانگے تانگے کی بیساکھیوں کے سہارے نہ تو دوڑ کا کوئی مقابلہ جیتا جا سکتا ہے نہ بھیک کے ٹکڑوں کے سہارے عزت کی زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ دوڑ کے مقابلے وہی جیتتے ہیں جنھیں اپنے آپ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے جو اس کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رہتے ہیں جو دوسروں کی طرف مدد کے لیے نہیں دیکھتے۔

مجوزہ کل ہند جماعت کی تشکیل کے لیے موجودہ سیاسی اور دینی تنظیموں پر انحصار کرنے کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اولاً تو یہ لوگ خلوص نیت کے ساتھ کبھی اکٹھا نہیں ہوں گے اور اگر ہو گئے تو اکٹھا رہ نہیں سکیں گے۔ یہ اپنی پرانی روش سے دستبردار نہیں ہو سکتے اور یہ پرانی روش منزل مراد تک لے جانے کے معاملے میں دو قدم بھی ساتھ نہیں دے سکے گی۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی عمارت کی تعمیر کے لیے نئے تعمیراتی ساز و سامان پر انحصار کیا جائے۔ جس طرح کے افراد اس جماعت کے لیے مطلوب ہیں وہ کمیاب تو ہیں نایاب نہیں ہیں انھیں دیکھ پانے والی چشم بینا چاہیے۔ یہ لوگ مل بھی جائیں گے اور اکٹھا بھی ہو جائیں گے، انشاءاللہ۔

12 ستمبر 2008

OO

سول سروسز کے نتائج پر سینہ کوبی کب تک؟

ہر سال یہی ہوتا ہے۔ سول سروسز کے نتائج کی اشاعت کے ساتھ ہی مسلم امیدواروں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مجموعی آبادی کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے کہ کامیاب مسلم امیدواروں کی جو تعداد ہے وہ ان کی مجموعی آبادی کے تناسب سے بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر 2007 کے نتائج کے حوالے سے کہا جارہا ہے کہ 1734 کامیاب امیدواروں میں صرف 27 امیدوار مسلمان ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی کامیابی کی شرح محض 3.67 فی صد ہے جسے مسلمانوں کی مجموعی آبادی کے پیش نظر کم از کم 15% ہونا چاہیے تھا یعنی مسلم امیدواروں کی مجموعی تعداد 100 کے قریب ہونی چاہیے تھی۔ یہ نیک نیت حضرات بیتے برسوں کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ کامیاب مسلم امیدواروں کا تناسب یا تو کچھ گھٹا ہے یا اس میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ یہ لوگ کامیاب مسلم امیدواروں اور مسلمانوں کی مجموعی آبادی کے تناسب کے حوالے سے بالواسطہ طور پر یہ بتانے اور جتانے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ دوسرے میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا جارہا ہے۔

مسلم امیدواروں کی کامیابی کی شرح بلاشبہ مایوس کن بھی ہے اور تشویش انگیز بھی لیکن اسے مسلمانوں کی مجموعی آبادی کے حوالے سے جانچنا، پرکھنا اور اس کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنا درست نہیں ہوسکتا۔ سول سروسز میں انہی لوگوں کو موقع ملتا ہے جو مقابلے کے امتحان میں اپنی اہلیت، اپنی برتری، اپنا استحقاق ثابت کردیتے ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ متعلقہ امیدوار جس مذہبی گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس کی مجموعی آبادی کیا ہے۔ کسی مذہبی گروہ کے تناظر

میں نتائج کے حوالے سے دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ متعلقہ گروہ کے کتنے امیدوار مجموعی طور پر سول سروسز کے امتحان میں شریک ہوئے تھے، کتنے امیدواروں نے پہلا مرحلہ جو جنرل نالج اور مضمون نگاری پر مشتمل ہوتا ہے پار کیا اور دوسرے مرحلے کے امتحان میں شریک ہوئے جو اختیاری مضامین کے ذریعہ ان کی اہلیت کو جانچتا پرکھتا ہے جس کے بعد انٹرویو اور پرسنالٹی ٹیسٹ کا نمبر آتا ہے۔ وہ لوگ جو اول الذکر دونوں مراحل طے کر لیتے ہیں انھیں انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے اور انہی میں سے ان لوگوں کا انتخاب عمل میں آتا ہے جنھیں آئی اے ایس، آئی ایف ایس، آئی پی ایس اور سینٹرل سروسز میں لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کامیاب مسلم امیدواروں کی کامیابی کی شرح کو اس اعتبار سے بھی دیکھا جانا چاہیے کہ کتنے امیدوار امتحان میں شریک ہوئے تھے اور ان میں سے کتنے کامیاب ہوئے۔ یہی صحیح طریقہ ہے لیکن افسوس کہ مسلمانوں کی مجموعی آبادی کے حوالے سے تو بات کی جاتی ہے اور یہ مطالبہ بھی کیا جاتا ہے کہ اصولی طور پر ان کی تعداد 100 سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن یہ دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی جاتی کہ جو مسلم امیدوار سول سروسز کے امتحان میں شریک ہوتے رہے ہیں دوسروں کے مقابلے میں ان کا تناسب کیا رہا ہے۔ جن کی تعداد زیادہ ہوگی ظاہر ہے ان کی کامیابی کے امکانات بھی نسبتاً زیادہ ہوں گے۔ یہ کلیہ نہیں ہے لیکن عام طور پر ہوتا یہی ہے۔

مسلمانوں کا مسئلہ دراصل یہی ہے کہ سول سروسز کے امتحان میں شریک ہونے والے مسلم امیدواروں کی تعداد دوسروں کے مقابلے میں خاصی کم ہوتی ہے اور یہی وہ بنیادی مسئلہ ہے جس پر ملّت کے دردمند حضرات کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ یہ دیکھا جانا چاہیے کہ مسلم نوجوان سول سروس کے امتحان میں اتنی تعداد میں شریک کیوں نہیں ہوتے جتنی تعداد میں انھیں شریک ہونا چاہیے۔ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم تک ان کی رسائی نہیں ہے یا پھر ان کے گھریلو حالات ایسے نہیں ہوتے ہیں کہ وہ یونیورسٹیوں سے نکلنے کے بعد مزید دو تین سال تک سول سروسز کے امتحان کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ کوچنگ کلاسز کی فیس ادا کر سکیں جو خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ جہاں تک اعلیٰ تعلیم تک نارسائی کا تعلق ہے یہ محض عذرِ لنگ ہے۔ مسلمانوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ ڈگری

رکھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ ان کا اصل مسئلہ معاشی ہے۔ ان کی خاصی بڑی تعداد اگر چاہے تو بھی اپنے طور پر اپنے وسائل کے سہارے نہ تو کوچنگ سینٹرز سے استفادہ کرسکتی ہے نہ پوری یکسوئی کے ساتھ امتحان کی تیاری کرسکتی ہے۔ ہمارے یہ نوجوان سول سروسز کی بلند سیڑھیاں چڑھ سکتے ہیں اگر ان کی دستگیری کی جائے۔ مسلمانوں میں نہ تو اہل خیر حضرات کی کمی ہے اور نہ ان لوگوں کی جن کی دلی آرزو ہے کہ ملّت کے نوجوان آئی ایف ایس، آئی اے ایس، آئی پی ایس اور سینٹرل سروسز کے امتحان میں شریک اور کامیاب ہوں۔ اس آرزو کی تکمیل کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ مختلف ادارے اور افراد جو ملّت کی فلاح و بہبود کا کام کررہے ہیں انھیں باہم جوڑا جائے اور ان کی مدد سے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو کم ازکم دو سال تک کچھ منتخب نوجوانوں کو لازمی اور اختیاری مضامین کی تیاری کرائے علاوہ ازیں انٹرویو کے لیے ان افراد کو بھی کوچنگ کی سہولت دی جائے جو اپنے طور پر اپنے وسائل سے امتحان کی تیاری کررہے ہیں۔ وہ قوم جو ہر سال خیرات وزکوٰۃ کے کروڑہا کروڑ روپے مدرسوں پر صرف کردیتی ہے وہ اپنے خون پسینے کی کمائی کا بہت ہی معمولی سا حصہ اس مد میں بھی بہرحال خرچ کرسکتی ہے کیونکہ کسی قوم کی صلاح وفلاح کے لیے دین داری کے ساتھ ساتھ دنیاداری بھی ضروری ہے۔ اگر وہ لوگ جو باکردار ہوں، دیانت دار ہوں، غریبوں کا درد سمجھتے ہوں اور انسانیت کے رشتے کے احترام کے قائل ہوں اور انھیں اس بات کا پورا پورا احساس بھی ہو کہ وہ مسلمان ہیں، انھیں وہ رول ادا کرنا ہے جسے ہر اعتبار سے مثالی کہا جاسکتا ہو، سول سروسز میں پہنچ جاتے ہیں تو اس سے ان کا بھلا تو ہوگا ہی عام مسلمانوں کی تصویر بھی بہتر ہوگی۔

سول سروسز کے امتحانات کی تیاری کے لیے کوچنگ سینٹرز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دوسروں کے علاوہ جو نجی طور پر کوچنگ سینٹر چلارہے ہیں، آر ایس ایس بھی خاموشی کے ساتھ سنکلپ (website:www.sankalp.com) کے نام سے ایک کوچنگ سینٹر چلارہا ہے۔ پہاڑ گنج کے آرام باغ محلّے میں واقع ایک عمارت میں یہ سینٹر 1986 سے کام کررہا ہے۔ اس کی ایک شاخ آر کے پورم میں بھی ہے جس میں 5000 روپے کی معمولی رقم کے عوض لازمی اور اختیاری پرچوں کی تیاری کرائی جاتی ہے۔ دہلی میں واقع اس

کے تین ہوسٹلوں میں امیدواروں کو رہائش کی سہولت بھی دی جاتی ہے۔

انٹرویو کی تیاری کے لیے 501 روپے لیے جاتے ہیں۔ 2006 تک سنکلپ کی اپنی ویب سائٹ کے مطابق 895 امیدوار سول سروسز کے امتحانات میں کامیاب ہو چکے ہیں جبکہ 2007 کے امتحانات میں سنکلپ سے وابستہ 825 امیدوار (امیدواروں کی کل تعداد 1875) انٹرویو کے لیے بلائے گئے تھے جن میں سے 295 کو کامیاب قرار دیا گیا۔ آر ایس ایس کے ادارے میں تربیت پانے والے امیدواروں کی کامیابی کی اس شرح کے پیش نظر یہ اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ آئندہ دس برسوں میں ہندوستانی سول سروس کا کردار بڑی حد تک تبدیل ہو جائے گا۔ اس ضمن میں یہ تذکرہ بھی یقیناً بے محل نہیں ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ جناب وسیم الرحمٰن نے بھی سینٹرل سروسز کے امتحان میں، جن کی کامیابی کو ایک بڑا کارنامہ قرار دیا جا رہا ہے، انٹرویو کے مرحلے میں سنکلپ سے استفادہ کیا تھا اور اس کے لیے انھوں نے 501 روپے بطور فیس ادا کیے تھے۔ اب نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر وہ یہ کہتے سنائی دے رہے ہیں کہ انھیں یہ علم نہیں تھا کہ سنکلپ آر ایس ایس کا ادارہ ہے۔

سنکلپ آر ایس ایس کا ادارہ ہے اس کے بانیوں میں آر ایس ایس کی راشٹریہ پرتی ندھی سبھا کے ارکان اور کئی دوسرے جانے پہچانے آر ایس ایس لیڈر شامل ہیں۔ دہلی کے علاوہ متھرا، میرٹھ، کانپور، کروکشیتر، بھیوانی، نینی تال اور پٹھان کوٹ میں اس کی شاخیں ہیں جہاں نویں کلاس سے طلباء کو داخلہ دیا جاتا ہے اور ابتداء سے ہی ان کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں سینٹرل سروسز کا حصہ بننا ہے یہ سب کچھ انتہائی خاموشی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ کیا مسلمان اس درجے کی نہ سہی اس سے کمتر درجے کی کوئی کوشش نہیں کر سکتے۔ کیا کرنے کا کام یہی ہے کہ ہر سال کامیاب امیدواروں کی گنتی کی جائے مسلم امیدواروں کی کامیابی کی شرح دیکھی جائے اور سینہ کوبی کی جائے؟

2008

OO

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

بہت پہلے یکم فروری 1986 کو ایک مجہول سے عدالتی فیصلے کی آڑ میں بابری مسجد کا تالا کھول دینے کے بعد دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا ایک اجلاس منعقد ہوا تھا جس کی صدارت محترم مولانا علی میاں کر رہے تھے۔ اجلاس کی کارروائی کے باضابطہ آغاز کے ساتھ ہی مسلم مجلس کے اس وقت کے صدر فضل الباری قریشی نے تجویز پیش کی کہ بورڈ اگر یہ اعلان کردے کہ مسلمان فلاں تاریخ کو جمعہ کی نماز بابری مسجد میں ادا کریں گے تو وقت مقررہ کے آنے سے قبل دوبارہ تالا بھی لگ جائے گا اور ان افسروں کی سرزنش بھی ہو جائے گی جن کی اس یقین دہانی پر تالا کھولا گیا تھا کہ اس کے نتیجے میں امن وقانون کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔ ان کی اس تجویز کو بورڈ کے ذمہ داروں نے مسترد کردیا۔ مولانا علی میاں نے دوٹوک لفظوں میں اعلان کیا کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کا تعلق چونکہ قانون شریعت کے تحفظ کے لیے ہے اس لیے وہ بابری مسجد کے تعلق سے نہ تو کوئی ذمہ داری قبول کرسکتا ہے، نہ مسلمانوں سے کوئی اپیل کرسکتا ہے۔

مولانا محترم کا یہ موقف صدفی صد درست تھا۔ ان کی رائے بالکل صائب تھی اور نومبر 1990 تک بورڈ اس پر قائم بھی رہا۔ لیکن 3 دسمبر 1990 کو اچانک دہلی میں ایک میٹنگ بلائی گئی اور اس میں مسجد کے حوالے سے شرعی موقف بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ مسجد ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، اسے کسی مصلحت یا مصالحت کی بنا پر کسی فرد، جماعت یا حکومت کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بالکل ایک نئی چیز تھی اور آپ اگر چاہیں تو اسے بابری مسجد تحریک میں مداخلت

اور اپنے آپ کو اس کی رہنمائی کے مقام پر لا بٹھانے کی بورڈ کی پہلی بالواسطہ کوشش کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ پھر بابری مسجد کی شہادت کے بعد 9 جنوری 1993 کو دہلی میں پرسنل لاء بورڈ نے ایک سات رکنی کمیٹی تشکیل دے کر مسجد کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا۔ بعدازاں 15 مئی کو لکھنؤ میں اس کمیٹی میں 8 افراد کا مزید اضافہ کر دیا گیا اور اس 15 رکنی کمیٹی کے توسط سے بورڈ نے بابری مسجد کے معاملے کو پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اب پرسنل لاء بورڈ کی فکر مندیوں کا دائرہ مسلم پرسنل لاء کے ساتھ ساتھ بابری مسجد اور اصلاح معاشرے جیسے اہم امور تک وسیع ہو چکا تھا۔ لیکن بات یہیں پر ختم ہوتی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ بورڈ نے گزشتہ 20 دسمبر کو لکھنؤ میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر فرقہ وارانہ تشدد کی روک تھام سے متعلق بل پر بھی نہ صرف یہ کہ اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے بلکہ یہ فیصلہ بھی سنا دیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ بل اپنی موجودہ شکل میں قابل قبول نہیں ہوگا۔ بل کی ''موجودہ شکل'' سے اگر بورڈ کی مراد موجودہ مسودہ قانون سے ہے جو نومبر 2005 میں پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تھا تو اب اس میں کابینہ کی منظور کردہ 59 ترمیمات کی شمولیت کے بعد اس کی شکل بالکل بدل چکی ہے۔ ان ترمیمات کے ساتھ بل کی جو نئی شکل وصورت بنی ہے وہ ابھی تک سامنے نہیں لائی گئی ہے۔ اخباروں میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ محض قیاس پر مبنی ہیں اور غالباً یہی سبب ہے کے بی جے پی اور کمیونسٹ پارٹی نے بھی موجودہ حالات میں بل پر اپنی رائے دینے سے احتراز کیا ہے، اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ لیکن بورڈ کو تو شاید یہ بتانے اور جتانے کی بڑی جلدی تھی کہ مسلمانوں کا واحد ٹھیکیدار وہی ہے اس لیے اس نے بل کی مخالفت کے ساتھ ساتھ یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ یہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔

وہ بل جسے عام مسلمان تو دور رہا بورڈ کے ذمہ داروں نے بھی نہیں دیکھا ہے، وہ بل جسے کابینہ نے آخری شکل میں منظور تو کر لیا ہے لیکن نہ تو اسے پارلیمنٹ کے کسی ایوان میں ابھی پیش کیا گیا ہے، نہ رائے عامہ کے لیے مشتہر کیا گیا ہے، اس کے تعلق سے کچھ کہنا سننا قبل ازمرگ واویلا ہی تو کہلائے گا۔ جہاں تک 2005 کے بل کا تعلق ہے تو مسلم مجلس مشاورت نے اس کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ بھی کیا تھا اور مشاورت کے اس وقت کے صدر سید شہاب الدین نے 20 فروری

2006 کو وزیر داخلہ شیوراج پاٹل کو اپنے خط کے ساتھ مجوزہ ترمیمات کی پوری تفصیل بھی ارسال کی تھی۔ مشاورت نے بل کی ایک ایک شق، ایک ایک دفعہ کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لے کر ان میں مناسب ترمیمات کی تجویز رکھی تھی۔ پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ دار اگر چاہیں تو ان ترمیمات پر ایک نظر ڈال سکتے ہیں جو بل کے پارلیمنٹ میں پیش ہونے کے بعد انھیں بل کے تعلق سے اپنا موقف طے کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ بورڈ کے ذمہ دار قانون کے خارزار سے اپنے دامن بچائے رکھیں تو یہی ان کے اور اس ملت کے لیے بھی زیادہ مفید ہوگا۔ اب تک کا جو تجربہ رہا ہے وہ اسی سمت میں کھل کر اشارہ کرتا نظر آتا ہے۔ آیئے اس پر ایک اچٹتی نظر ڈال لیں۔

مطلقہ خواتین قانون جسے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ دار اپنی عظیم الشان کامیابی قرار دیتے ہیں، عدالتوں نے اسے عملاً ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا ہے۔ یہ قانون کتنا لچر، کتنا پوچ، کتنا بے مصرف اور تضادات سے کتنا پر ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک اعلیٰ عدالتوں کے متعدد فیصلوں میں اس کے بخیے ادھیڑ دیے گئے ہیں لیکن بورڈ کے اعلیٰ دماغ ماہرین قانون دور کے تماشائی کا رول ادا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکے ہیں۔ یہی نہیں مسجد کی شرعی حیثیت کے تعلق سے بورڈ نے جو موقف اختیار کیا تھا اسے بھی سپریم کورٹ نے اپنے ایک تاریخ ساز فیصلے میں قطعی طور پر مسترد کر دیا ہے۔ سپریم کورٹ نے صدارتی ریفرنس اور اجودھیا تحویل اراضی قانون 1993 کے مقدمے میں 24 اکتوبر 1994 کو جو فیصلہ دیا تھا اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسجد کو قانون کی نظر میں وہی حیثیت حاصل ہوگی جو دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو اب تک حاصل رہی ہے۔ اگر دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو سرکار کی تحویل میں لیا جا سکتا ہے تو بوقت ضرورت مفادِ عامہ کے تحت حکومت مسجد کو بھی اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ اپنے اس فیصلے کے تحت عدالت عظمیٰ نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اس موقف کو کلی طور پر مسترد کر دیا ہے کہ مسجد ہمیشہ مسجد رہے گی، مسجد کی زمین کو نہ تو بیچا خریدا جا سکتا ہے نہ حکومت اسے اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ بورڈ نے اس فیصلے کو بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا۔ وہ لوگ جو رازِ درونِ خانہ

سے بڑی حد تک واقف ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس موقف کی صورت گری دسمبر 1995 میں اس لیے کی گئی تھی کہ اس وقت کے وزیر اعظم چندر شیکھر بابری مسجد کی الجھی ڈور کو سلجھانے میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔ یہ لوگ اس قضیہ کو نمٹانے کا سہرا راجیو گاندھی کے سر باندھنے کے متمنی تھے۔ لیکن قضاء وقدر کا فیصلہ تو کچھ اور ہی تھا۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قائدین کے ذہن ومزاج اور بورڈ کی ساخت دونوں ہی اس بات کے متقاضی ہیں کہ یہ ادارہ اپنے آپ کو مبینہ دینی معاملات تک ہی محدود رکھے۔ دوسرے میدانوں میں پاؤں پسارنے کی اس کی کوشش کا نتیجہ اس کے لیے ناکامی ورسوائی اور مسلمانوں کے لیے مسائل ومصائب کے انبار میں مزید اضافہ کی صورت میں ہی برآمد ہوسکتا ہے۔ یہ بورڈ پاپوش کلچر کے پروردہ اذہان کی تسکین کا تو سامان فراہم کرسکتا ہے لیکن تعلیم یافتہ اور بیدار ذہن لوگوں کو شمہ برابر بھی مطمئن نہیں کرسکتا ہے۔ جو چیز سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ اس کا غیر نمائندہ کردار ہے۔ بورڈ میں جن لوگوں کو جگہ ملی ہے یا ملتی رہی ہے ان میں سے بیشتر کے تعلق سے یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ ان کی نامزدگی میں اہلیت اور بے لوث خدمت کے جذبہ کے مقابلے میں ترجیحی مقام کچھ بڑی شخصیتوں، بڑے گھروندوں اور نام نہاد مسلم تنظیموں سے ان کے تعلق کو، کفش برداری کی ان کی صلاحیت کو ہی حاصل رہا ہے۔ پاپوش کلچر کے ساتھ بورڈ کے اٹوٹ رشتہ کا ہی نتیجہ ہے کہ اس ادارے میں عصری علوم کے ماہرین کی نمائندگی بس برائے نام ہی ہے۔ اس میں مدرسوں کے تعلیم یافتہ مولوی اور دینی جماعتوں سے وابستہ لوگ بڑی تعداد میں ملتے ہیں بلکہ یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ ان کی تعداد تین چوتھائی سے بھی متجاوز ہے لیکن یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ ممتاز اسکالرز، وکلا، ڈاکٹر اور صحافی وغیرہ خوردبین لے کر تلاش کرنے سے بھی مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں بورڈ پر احناف کی بالادستی بھی ایک کھٹکنے والی چیز ہے۔ اس نے بھی اہل ارکان کی تلاش کے دائرے کو محدود کردیا ہے۔

یہ درست ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کا تعلق ابتدا میں قانون شریعت کے تحفظ سے ہی تھا اور اس اعتبار سے علماء کی بالادستی کسی حد تک قابل فہم بھی ہوسکتی تھی۔ لیکن اب جب کہ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جارہا ہے، اسے مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم کے روپ میں

پیش کیا جانے لگا ہے اور یہ قانون کے خارزار میں بھی سرپٹ دوڑنے کی کوشش کر رہا ہے تو عصری علوم سے بہرہ مند لوگوں کو مسلسل نظر انداز کرتے رہنے کی بات کسی بھی طور پر سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ اپنی انا کے بت پر نثار مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قائدین کو اپنی روش پر نظر ثانی کرنے سے مزید گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اسی میں ان کی اور ملت کی دونوں کی بھلائی ہے۔

یکم جنوری 2010

OO

یہ کالکھ چھوٹنے والی نہیں ہے

لبراہن کمیشن نے اپنی ضخیم رپورٹ میں دوسری چیزوں کے علاوہ کمال فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہاراؤ کے چہرے سے بابری مسجد کے انہدام کی کالکھ بھی صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اتر پردیش کے گورنر ستیہ نرائن ریڈی نے ریاست میں صدر راج نافذ نہ کرنے کا مشورہ دے کر نرسمہاراؤ کے ہاتھ عملاً باندھ دیے تھے۔ علاوہ ازیں کلیان سنگھ نے قومی یکجہتی کونسل اور سپریم کورٹ کو بابری مسجد کے بہر قیمت تحفظ کی جو یقین دہانی کرائی تھی وہ بھی صدر راج کے حوالہ سے کوئی فیصلہ کرنے میں مانع بن رہی تھی۔

وزیر اعظم نرسمہاراؤ نے بھی مارچ 1995 میں جمشید پور میں ایک انتخابی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے بابری مسجد کے انہدام سے قبل صدر راج نافذ نہ کرنے کی مجبوری کا تذکرہ کیا تھا۔ انھوں نے گورنر ستیہ نرائن ریڈی کے اس خط کا حوالہ دیا تھا جس میں ریاست میں صدر راج نافذ نہ کرنے کی پرزور وکالت کی گئی تھی۔ ریڈی نے اپنے خط میں لکھا تھا ''میری رائے میں حکومت اتر پردیش کی برخاستگی جیسا سخت قدم اٹھانے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے... اگر ایسا کیا جاتا ہے تو اس کے بہت دور رس نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف ریاست اتر پردیش بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی بڑے پیمانے پر تشدد کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانے سے بچا جانا چاہیے''۔ لبراہن کمیشن نے نرسمہاراؤ کو اس ''مجبوری'' کی بنیاد پر بابری مسجد کے انہدام کے الزام سے بڑی حد تک بری قرار دے دیا

ہے۔انھوں نے غالباً اس مسئلے پر اس پہلو سے غور نہیں کیا کہ اگر گورنر کے رول، اس کے رویہ، اس کی سفارش اور اس کے مشورہ کو ہی فیصلہ کن قرار دے لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کسی ریاست میں صدر راج کے نفاذ کا فیصلہ مرکزی حکومت کے بجائے اس ریاست کا گورنر ہی کرتا ہے۔نرسمہاراؤ کا یہ کہنا کہ اتر پردیش میں صدر راج نافذ نہ کرنے کا مشورہ دے کر گورنر نے ان کے ہاتھ باندھ دیے تھے عملاً اس بات ہی کی طرف اشارہ کرتا نظر آتا ہے کہ گورنر نہ چاہے تو کسی ریاست میں صدر راج نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ جسٹس لبراہن نے آنکھ بند کر کے اس عذرِ لنگ پر جواز کی مہر ثبت کر دی۔انھوں نے اس بات کی شمہ برابر بھی پروا نہیں کی کہ آئین اس طرح کی کسی دلیل کو، کسی عذر کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا۔

آئین کی دفعہ 356 کی رو سے صدر راج کے نفاذ کا فیصلہ صدر جمہوریہ مرکزی حکومت کے مشورہ سے کرتا ہے اور اس اقدام کے لیے جو بنیادی شرط بتائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ صدر جمہوریہ کو نجی طور پر اس بات کا اطمینان ہونا چاہئے کہ وہ جو قدم اٹھانے جا رہا ہے اس کا جواز ہے اور اس کے بغیر آئین کی عمل داری ممکن نہیں ہے۔ گورنر کی رپورٹ تو اس اطمینان کے حصول کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔صدر جمہوریہ یا دوسرے لفظوں میں مرکزی حکومت گورنر کے مشورہ یا اس کی سفارش پر عمل کرنے کی پابند نہیں ہے، وہ اپنے مجوزہ اقدام کے لیے نجی اطمینان دوسرے ذرائع سے بھی حاصل کر سکتی ہے۔ اسے غایت درجہ کی سادہ لوحی، آئین و قانون سے عدم واقفیت یا آئین کی من مانی تشریح و تعبیر نہیں تو اور کیا کہا جائے گا کہ جسٹس لبراہن نے دفعہ 356 کو گورنر کی سفارش یا اس کے مشورہ تک محدود کر کے رکھ دیا۔جسٹس لبراہن نے نرسمہاراؤ کے چہرے کی کالکھ دھونے کے لیے دفعہ 356 کو جو معنی پہنائے ہیں، اس کی توقع کسی ایسے شخص سے بہر حال نہیں کی جاسکتی جو ہائی کورٹ کا جج رہ چکا ہو اور جسے بابری مسجد کے سانحہ کی چھان بین کی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔

سوال یہ ہے کہ جب پوری فضاء نوبہ نو اندیشوں سے بری طرح بوجھل تھی۔ سنگھ پریوار کے سوا دوسری تمام پارٹیوں کے لیڈر ہی نہیں بلکہ بہت سے ممتاز صحافی، دانشور، سماجی کارکن اور زندگی کے مختلف دائروں سے تعلق رکھنے والے دوسرے بہت سے لوگ بھی اتر پردیش میں

صدر راج کے نفاذ کا پرزور مطالبہ کررہے تھے تو راؤ صاحب نے ستیہ نرائن ریڈی کے ایک مجہول سے خط پر بھروسہ کیوں کرلیا؟ اسی سے جڑا یہ سوال بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ ریڈی سے باضابطہ طور پر رپورٹ کیوں نہیں طلب کی گئی؟ وزیر اعظم نے جس خط کا تذکرہ کیا ہے اور کمیشن نے بھی جس کی اہمیت تسلیم کی ہے وہ کسی بھی صورت میں باضابطہ رپورٹ کا بدل نہیں بن سکتا تھا کیونکہ اس میں ریاست کی صورت حال کے ٹھوس تجزیہ کے بجائے پورا زور یہ باور کرانے پر صرف کیا گیا تھا کہ کلیان سنگھ حکومت کو برطرف کرنے پر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی فتنہ وفساد کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ ستیہ نرائن ریڈی کا یہ اندیشہ کتنا بے بنیاد تھا اس کا اندازہ ایک نہیں بی جے پی کی تین تین ریاستوں ہماچل پردیش، مدھیہ پردیش اور راجستھان کی حکومتوں کو بہ یک وقت برطرف کردینے کے بعد جو کچھ ہوا اس سے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

6 دسمبر 1992 کو اجودھیا میں بابری مسجد کا انہدام نہ تو کوئی اچانک رونما ہونے والا اتفاقی حادثہ تھا نہ کوئی ایسا سانحہ جس سے خاص کر وہ لوگ جو مسند اقتدار پر قابض تھے لاعلم رہے ہوں گے۔ اجودھیا میں جو کچھ ہوا اس کی آہٹ وہ سب لوگ سن رہے تھے جنھوں نے اپنے کان بند نہیں کر رکھے تھے۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جو وعدہ شکن گروہ سپریم کورٹ تک کے احکامات کو نظر انداز کر کے متنازع زمین پر انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ چبوترا بنا سکتا تھا وہ تمام تر یقین دہانیوں کو پس پشت ڈال کر بابری مسجد کو منہدم بھی کر سکتا تھا۔ اس بھیانک واقعہ کے منصوبہ بند ہونے کی بات لبراہن کمیشن نے بھی مانی ہے۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ یہ منصوبہ تمام تر جزئیات کو سامنے رکھ کر پوری تندہی کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ 6 دسمبر کو بابری مسجد مسمار کردی جائے گی اس کا اندیشہ ان کی کابینہ کے بہت سے ارکان کو بھی تھا اور ان میں سے کچھ نے برملا اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ مثال کے طور پر ارجن سنگھ نے بابری مسجد کے انہدام سے دو دن قبل 4 دسمبر ہی کو داخلہ سکریٹری گوڈبولے سے کہہ دیا تھا کہ مسجد منہدم کردی جائے گی اور بہتر ہوگا کہ اس موقع پر حکومت کی طرف سے جاری کیے جانے والے بیان کا مسودہ وہ پہلے ہی تیار کرلیں۔

ارجن سنگھ کے اس اندیشے کی تائید اس وقت کے ایک اور سینئر مرکزی وزیر ایم ایل فوتیدار نے بھی کی تھی۔ فوتیدار نے اپنے ایک تحریری بیان میں کہا تھا کہ انھوں نے وزیر اعظم نرسمہا راؤ کو 3 دسمبر کو ہی دوٹوک لفظوں میں بتا اور جتا دیا تھا کہ بابری مسجد کے لیے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ معروف سیاسی شخصیت اور صحافی پروفیسر بھیم سنگھ نے بھی 3 دسمبر کو وزیر اعظم سے ملاقات کر کے انھیں بتا دیا تھا کہ ان کی اطلاع کے مطابق بالا صاحب دیو رس، اڈوانی، کلیان سنگھ وغیرہ نے بابری مسجد کو مسمار کرنے کے منصوبہ کو آخری شکل دے دی ہے۔ حکومت کو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ مسلم مجلس اتر پردیش کے ایک وفد نے وزیر اعظم سے ملاقات کر کے انھیں ایک میمورنڈم پیش کیا تھا جس میں دوسری چیزوں کے علاوہ یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ حکومت بابری مسجد کو بچانے کے لیے ضروری اقدامات کرے، سنگھ پریوار کے لیڈروں کی یقین دہانیوں پر بھروسہ کرنا انتہائی خطرناک نتائج کا حامل بن سکتا ہے۔

ان انتباہات اور خدشات کی تصدیق متواتر شائع ہونے والی چشم دید اخباری رپورٹوں سے بھی ہورہی تھی۔ مرکزی خفیہ ادارے بھی تشدد اور غنڈہ گردی کے روز افزوں بھیانک واقعات اور بی جے پی کے لیڈروں کے انتہائی جارحانہ بیانات سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ بھی نرسمہا راؤ کو اپنی رپورٹیں بھیج رہے تھے لیکن نرسمہا راؤ نے کچھ نہ سننے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ یہ مان کر چل رہے تھے کہ اتر پردیش کے گورنر ستیہ نرائن ریڈی نے جو کچھ کہا ہے وہی سچ ہے۔ انھوں نے دوسروں کے مقابلے میں جن میں ان کی کابینہ کے سینئر وزراء بھی شامل تھے ستیہ نرائن ریڈی کو صرف اس لیے ترجیح دی کہ وہ جو مشورہ دے رہے تھے عملاً وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کی سوچ کا محور بھی وہی تھا۔ یہ لوگ بھی کلیان سنگھ حکومت کو بہر صورت بنائے رکھنا چاہتے تھے تاکہ بابری مسجد کے انہدام کے منصوبہ کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔

ستیہ نرائن ریڈی فی الواقع نرسمہا راؤ کے کھیل کو ہی آگے بڑھا رہے تھے۔ انھوں نے وزیر اعظم کو جو خط لکھا تھا اس کی ایک ایک سطر اس بات کی غماز ہے کہ وہ بوجوہ حکومت اتر پردیش کے عزائم پر پردہ ڈالنا اور عام لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے اور انھیں ان کی اس خدمت جلیلہ کا صلہ نرسمہا راؤ کے ہاتھوں ایک اور ٹرم کی صورت میں ملا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ

بابری مسجد کے انہدام کے منصوبے پر عمل درآمد اور بعد ازں صدر راج کے نفاذ کے دوران مسجد کے ملبے پر عارضی مندر کی تعمیر کے خواب کی تعبیر ریڈی کے تعاون سے ہی تلاش کی جا سکتی تھی۔ یہ خواب سنگھ پریوار کا بھی تھا اور نرسمہا راؤ اور ریڈی کا بھی۔ چنانچہ ستیہ نرائن ریڈی کا نرسمہا راؤ کو خط لکھ کر اتر پردیش میں صدر راج نافذ نہ کرنے کا مشورہ دینا اور نرسمہا راؤ کا اس مشورہ کو پتھر کی لکیر بنا لینا تو سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن جسٹس لبراہن نے بہت دور جا کر اس خط میں نرسمہا راؤ کی مجبوری تلاش کرنے کی کوشش کیوں کی یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے ان کے اس عمل کی توجیہ آئین وقانون کے حوالے سے تو بہر حال نہیں کی جا سکتی ہے۔

26 نومبر 2009

OO

جوش کے بجائے ہوش سے کام لیجیے

سپریم کورٹ کے تعلق سے یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ ہم جس تیرہ وتار سرنگ میں داخل ہو چکے ہیں یہ اس کے آخری سرے پر دکھائی دینے والی روشنی کی وہ حیات بخش کرن ہے جو مایوسی، محرومی اور لاقانونیت کے گھنے اندھیروں میں پورے عزم واستقلال کے ساتھ جیتے رہنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ اس کے فیصلوں کی بازگشت دور دور تک اور دیر تک سنی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ مان کر چلا جاتا ہے کہ اس عدالت کے جج صاحبان جو قانون پر گہری نظر رکھتے ہیں انھیں زندگی کی جاں گسل حقیقتوں کے ادراک میں بھی یدطولیٰ حاصل ہوگا۔ وہ ایک دردمند دل اور روشن دماغ کے حامل بھی ہوں گے اور ان کی نگاہ دوررس پرت در پرت حقائق کی تہہ تک اتر جانے کی غیر معمولی اہلیت بھی رکھتی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ایسا فیصلہ سامنے آتا ہے جو روز روشن کی طرح عیاں حقیقتوں کو جھٹلاتا نظر آتا ہو تو لوگوں کو دکھ بھی ہوتا ہے اور حیرت بھی۔ ایسے میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ اس فیصلے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور پارلیمنٹ اس کے ازالہ پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔

کچھ اسی طرح کی بات زیر سماعت مقدمات میں بحث کے دوران فاضل جج صاحبان کے تبصروں، ان کی رائے زنی اور ان کے مشاہدوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جنھیں قانون کی اصطلاح میں اباٹر ڈکٹم (obiter dictam) کہا جاتا ہے۔ ان کے تعلق سے یہ مان کر چلا جاتا ہے کہ انھیں عدالتی فیصلوں کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا' خواہ وہ قانون کی نگاہ میں معتبر ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک مروّجہ اور تسلیم شدہ اصول اسٹیئر ڈے سی سیسی (stare decisis) کے

مطابق اس طرح کی رائے زنی کو جو ابائٹر ڈکٹم کے ذیل میں آتی ہو اس کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔ عدالتوں کے لیے ان کا نوٹس لینا ضروری نہیں ہوتا۔ یہی بات سپریم کورٹ کی دورکنی بینچ کے ایک رکن فاضل جج جسٹس مارکنڈے کاٹجو کے تکلیف دہ ریمارکس کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ یہ اوبٹر ڈکٹا کے ذیل میں آتے ہیں انھیں عدالت عظمیٰ کی رائے کہنا یا بنچ کے فیصلے کا حصہ کہنا کسی بھی طور پر درست نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے ان کی ذاتی رائے ہے اور دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس سے رجوع کرلیں۔ وہ اب تک جس ذہن و مزاج کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اس کے پیش نظر ان سے یہ توقع بہر حال کی جاسکتی ہے کہ وہ حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور کسی ایسی بات پر اصرار نہیں کریں گے جس سے نہ صرف یہ کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی دل آزاری ہوتی ہو بلکہ جو انصاف و دیانت کے تقاضوں پر بھی پوری نہ اترتی ہو۔

اس ذیل میں یہ تذکرہ یقیناً بے محل نہیں ہوگا کہ جسٹس کاٹجو زیر سماعت مقدموں میں پہلے بھی ایسی رائے زنی کرچکے ہیں جسے قانون کی نگاہ میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ مثال کے طور پر 30 مئی 2007 کو جسٹس ایس جی سنہا کے ساتھ ٹاڈا پر نظر ثانی سے متعلق ریویو کمیٹی کی ایک سفارش سے متعلق ایک اپیل کی سماعت کرتے ہوئے انھوں نے اصل موضوع سے الگ ہٹ کر ٹاڈا قانون کے جواز پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹاڈا قانون کے منسوخ ہوجانے کے بعد اس کے تحت کسی کے خلاف کسی بھی طرح کی قانونی کارروائی کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ انھوں نے اس طرح کی کسی بھی کارروائی کو آئین کی دفعہ 14 سے متصادم قرار دیتے ہوئے اس سے احتراز کا مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار اس حقیقت کے باوجود ضروری سمجھا کہ ٹاڈا کی منسوخی سے قبل اس میں ایک دفعہ کا اضافہ کردیا گیا تھا جس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ اس قانون کے تحت جن لوگوں پر مقدمات چل رہے ہیں وہ بدستور جاری رہیں گے ان پر ٹاڈا کی موت کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جسٹس سنہا کی اس رائے کو شمہ برابر بھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور ممبئی بم کانڈ کے کچھ اسیران بلانے جب اس کے حوالے سے دادرسی چاہی تو انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ متعلقہ عدالت نے اسے سپریم

کورٹ کی رائے ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ اسے ابائٹر ڈکٹم سے زیادہ کچھ اور اہمیت نہیں دی جاسکتی تھی۔ جسٹس کاٹجو نے 17 مارچ کو بھی ایک ہزار کروڑ روپے کے چارہ گھوٹالہ کے ایک ملزم برج بھوشن پرساد کی ضمانت کی درخواست پر سماعت کے دوران کہا تھا کہ ''ہر جگہ کرپشن کا دور دورہ ہے کوئی گوشہ اس سے اچھوتا نہیں رہ گیا ہے۔ اس سنگین خطرے سے اس صورت میں ہی چھٹکارہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو بیچ چوراہے پر پھانسی پر لٹکا دیا جائے'' اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا انتہائی دکھ کے ساتھ اعتراف بھی کیا تھا کہ قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ظاہر ہے ان کے اس طرح کے مشوروں' تبصروں اور مشاہدوں کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا جاسکتا۔ وہ غالباً یہ مان کر چلتے ہیں کہ وہ جس بات کو درست سمجھتے ہوں اس کے اظہار کا انھیں بہرحال حق حاصل ہے خواہ اسے کسی بھی رنگ میں کیوں نہ دیکھا جائے۔

اب 29 مارچ کو مدھیہ پردیش کے نرملا کانونٹ ہائر سیکنڈری اسکول کے ایک مسلمان طالب علم کی اپیل پر بحث کے دوران فاضل جج جسٹس کاٹجو نے داڑھی اور حجاب کے تعلق سے جو کچھ کہا ہے اس سے نہ تو عدالت عظمیٰ کو اتفاق ہوسکتا ہے اور نہ ان لوگوں کو جو سیکولرزم کے حقیقی مفہوم کو سمجھتے ہیں اور مذہبی رواداری کے مفہوم سے نا آشنا بھی نہیں ہیں۔ فاضل جج نے داڑھی کا رشتہ طالبان سے جوڑتے ہوئے کہا کہ ''ہم ملک کے طالبانائزیشن (Talibanisation) کی اجازت نہیں دے سکتے۔ کل اگر کوئی طالبہ یہ کہتی ہے کہ وہ برقع اوڑھنا چاہتی ہے تو کیا ہم اسے اس کی اجازت دے دیں گے۔ میں ایک سیکولرسٹ ہوں' ہمیں حقوق اور ذاتی عقائد میں توازن قائم کرنا چاہیے۔ ہم اسے ضرورت سے زیادہ کھینچ نہیں سکتے۔ ظاہر ہے یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ طالبان کا داڑھی کے ساتھ رشتہ جوڑ کر انھوں نے زیادتی کی ہے۔ داڑھی اور طالبان کے انداز فکر میں ہم آہنگی تلاش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ دنیا گول ہے کیونکہ چاول چپٹا ہوتا ہے۔ ہر داڑھی والا نہ تو طالبان کے ساتھ ہوسکتا ہے اور نہ ان کے قریب۔ طالبان تو ابھی کل کی پیداوار ہیں۔ داڑھی والے مسلمان اس ملک میں اس وقت سے پائے جاتے ہیں جب سے انھوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ محترم کاٹجو صاحب داڑھی کی حوصلہ شکنی کر کے طالبانیت پر اگر بند باندھنا چاہتے ہیں تو اسے ایک فعل عبث ہی کہا

جائے گا۔ آں محترم نے اس مسئلے پر جو رائے دی ہے وہ اگرچہ بائٹر ڈکٹم کے ذیل میں ہی آتی ہے پھر بھی اس کا نوٹس لیا جانا چاہیے کیونکہ اسے کہنے والے کے ذہن و مزاج اور اس کی پرواز فکر کا آئینہ دار تو کہا ہی جاسکتا ہے اور اگر کہنے والا ملک کی سب سے بڑی عدالت کی بہت ہی اونچی مسند پر براجمان ہو اس سے یہ توقع کی جاتی ہو کہ وہ کسی بھی حال میں انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دے گا تو اس کی اس رائے زنی کو ایک عام بات کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح کی بات حجاب کے تعلق سے بھی کہی جاسکتی ہے۔ حجاب اور داڑھی کے سلسلے میں جو باتیں اکثر و بیشتر سننے میں آتی رہتی ہیں وہ فی الواقع یورپ میں جاری علامتوں کی جنگ کا حصہ ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں یہ علامتیں نہ کبھی موضوع بحث رہی ہیں نہ انھیں موضوع بحث بنانا چاہیے۔ ہمارے سماج کی ساخت اور اس کی رگوں میں دوڑنے والے اصول اس کی اجازت نہیں دیتے۔

فاضل جج جسٹس مارکنڈے کاٹجو اپنے آپ کو سیکولرسٹ کہتے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ ہم ان کے اس موقف کو لائق قدر قرار دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ درخواست بھی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ داڑھی، طالبان اور حجاب سے متعلق اپنی رائے پر نظر ثانی فرمائیں۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے، انھوں نے جو سوال اٹھائے ہیں، انھوں نے جس عزم کا اظہار کیا ہے وہ فی الواقع سیکولرزم کے ان کے دعوے کی چغلی کھاتا نظر آتا ہے۔ ہم جس سیکولرزم پر یقین رکھتے ہیں وہ مذہبی عقائد یا مذہبی اعمال کا مخالف نہیں ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ریاست اپنے عمل اور بے عملی دونوں ہی سے نہ تو کسی مذہب کی حوصلہ افزائی کرے گی نہ حوصلہ شکنی۔ تمام مذاہب اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ اس کا رویہ ایک جیسا ہوگا۔ اسی کی بازگشت ہمارے آئین میں خاص کر بنیادی حقوق کے باب میں مذکور دفعات میں بھی سنائی دیتی ہے۔ عدالتوں پر جن میں ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی شامل ہے اس بنیادی اصول کا بہر قیمت اور بہر صورت احترام واجب ہے۔ چنانچہ محترم جسٹس کاٹجو سے ہم ان کے سیکولر ایقانات کے حوالے سے بھی یہ کہنا چاہیں گے کہ ان کی رائے درست نہیں ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ ہم طالبانیت کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم سے آپ کی مراد یقیناً اس ملک کے لوگ ہوں گے اور اگر ایسا ہی

ہے تو یہ سن لیجیے کہ اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے لوگ ہی نہیں بلکہ اکثریت کی ایک معتد بہ تعداد بھی اپنے آپ کو آپ کے اس ''ہم'' کے دائرے سے الگ ہی رکھنا چاہے گی اور اگر آپ کی ہم سے مراد سپریم کورٹ ہے تو بھی یہ مان کر نہیں چلا جا سکتا کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت آپ کی ہم آواز ہے۔ آپ کی بنچ نے جو فیصلہ دیا ہے اس کا صرف وہ حصہ سامنے آیا ہے جو نافذ العمل (Operating part) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس فیصلے میں آپ کی رائے کو بنیاد بنایا گیا ہے اسے آپ کے طرز فکر کے حوالے سے ہی مدلل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اگرچہ ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا پھر بھی عدالتی فیصلوں کے مزاج اور اب تک کی روایات کی بنیاد پر یہ کہا ہی جا سکتا ہے کہ آپ کی متنازعہ رائے اس میں شامل نہیں ہوگی۔

اس ضمن میں ہم ان لوگوں سے بھی جو غیر معمولی اضطراب کا مظاہرہ کر رہے ہیں صرف اتنا کہنا چاہیں گے کہ ''کوا کان لے گیا'' کی ہانک پر کوے کے پیچھے دوڑ پڑنا دانائی نہیں ہو سکتی۔ جوش کے بجائے ہوش کا مظاہرہ ہمیشہ ہی بہتر نتائج کو جنم دیتا ہے۔ علاوہ ازیں اس مقدمے کے فیصلے کے تعلق سے بھی جو موقف اختیار کیا جائے اس کے عواقب و مضمرات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے کیونکہ معاملہ ایک اقلیتی ادارے کا ہے اور اس کا اثر ہمارے اپنے اداروں پر بھی پڑ سکتا ہے۔

○○

گودھرا کے اسیران پوٹا کو انصاف کب؟

چھ سال بیت چکے ہیں لیکن گودھرا کے اسیران پوٹا کے لیے ہنوز روز اول ہے۔ نہ ان کے خلاف مقدمات کی سماعت شروع ہوئی ہے، نہ عدالت عظمیٰ میں ان کی ضمانت کا مسئلہ زیر بحث آیا ہے۔ گودھرا کے مظلومین کے تعلق سے یہ تذکرہ بھی یقیناً بے محل نہیں ہوگا کہ 2005 میں حکومت ہند کی مقرر کردہ پوٹا (Pota) نظرثانی کمیٹی اپنی رپورٹ میں بہت ہی واضح انداز میں کہہ چکی ہے کہ گرفتارشدگان کے خلاف جو الزامات عائد کیے گئے ہیں وہ پوٹا کے تحت نہیں آتے، ان کے خلاف پوٹا کے تحت کارروائی ختم کردی جانی چاہیے۔ لیکن حکومت گجرات نے کمیٹی کی سفارشات کو قطعی طور پر مسترد کردیا اور ان کے خلاف پوٹا کے تحت لگائے جانے والے الزامات کو واپس لینا تو دور رہا ان پر کسی بھی زاویے سے نظرثانی پر آمادگی بھی ظاہر نہیں کی۔ چنانچہ اب سپریم کورٹ کو یہ بھی طے کرنا ہے کہ اسیران گودھرا پر جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ پوٹا کے تحت آتے بھی ہیں یا نہیں۔

گودھرا ٹرین آتش زدگی کے 85 ملزمین کو جو پوٹا کے تحت قید ہیں (ان میں سے ایک صاحب بینائی سے تقریباً محروم ہو چکے ہیں) انسانی حقوق سے متعلق تنظیموں کی کوششوں کے باوجود اب تک ضمانت نہیں مل سکی ہے۔ حالانکہ ضمانت ضابطۂ فوجداری کی دفعات اور دوسرے انتہائی سخت قوانین کے تحت گرفتار کیے جانے والے ملزمین کے لیے ناقابل تنسیخ بنیادی حق تصور کی جاتی ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ ضمانت گرفتاری کے تعلق سے ایک لازمی شرط کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ کسی شخص کو بغیر

ضمانت کے بغیر مقدمہ چلائے طویل مدت تک جیل میں بند نہیں رکھا جا سکتا ایسا کرنا اس کے بنیادی انسانی حق کو پامال کرنا ہوگا۔

گودھرا کے اسیران پوٹا کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ وہ 6 سال سے قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ دوسروں کے علاوہ سپریم کورٹ کے تین سابق چیف جسٹس صاحبان، مسٹر پی این بھاگوتی، مسٹر ورما اور مسٹر وی این کھرے نے گودھرا کے ملزمین کے مقدمے کی سماعت میں تاخیر پر سخت تنقید کی ہے۔ انھوں نے اسے شخصی آزادیوں پر حملہ قرار دیا ہے۔ ریٹائرڈ چیف جسٹس بھگوتی کا کہنا ہے کہ ''یہ صورت حال فی الواقع ناقابل فہم ہے مقدمہ چلائے بغیر ملزمین کو آخر اتنے لمبے عرصے تک جیل میں محبوس کس طرح رکھا جا سکتا ہے اگر ملزمین میں سے کچھ بے گناہ پائے جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ اگر یہ لوگ مجرم ہیں تو انھیں سزا دی جائے لیکن لوگوں کو اس طرح جیل میں بند نہیں رکھا جا سکتا''۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''چونکہ ملزمین کے جیل میں ہونے کی صورت میں سپریم کورٹ کریمنل اپیلوں پر 2 سال کے اندر اندر اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے اس لیے عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس کو چاہیے کہ وہ ذاتی طور پر اس معاملے کو دیکھیں کیونکہ ملزمین کو اس وقت تک بہر حال بے گناہ تصور کیا جاتا ہے جب تک کہ انھیں عدالت مجرم قرار نہیں دے دیتی''۔

ریٹائرڈ چیف جسٹس مسٹر وی این کھرے کا کہنا ہے کہ ملزمین کی ضمانت کی درخواستوں کی سماعت اب تک بہر حال ہو جانی چاہیے تھی۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''جن معاملات میں ملزم جیل میں ہو ان میں مقدمات کی سماعت میں تاخیر کی کوئی توضیح نہیں کی جا سکتی۔ سپریم کورٹ کریمنل اپیلوں پر فوری طور پر فیصلہ سناتی رہی ہے اس مخصوص معاملے (اسیران گودھرا کا معاملہ) میں تو اسے یہ بھی طے کرنا ہے کہ کہاں مقدمات کی سماعت آزادانہ طور پر ممکن ہے۔ اس لیے اس معاملے میں تاخیر کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیے'' ریٹائرڈ جسٹس مسٹر ورما نے بھی اس بات کی پرزور وکالت کی ہے کہ ملزمین چونکہ ایک طویل مدت سے جیل میں ہیں اس لیے

ان کے مقدمات کا فیصلہ جلد کر دیا جانا چاہیے۔

اسیران گودھرا کی ضمانت کا معاملہ اکتوبر 2004 میں جب گجرات ہائی کورٹ کے سامنے آیا تو اس نے انتہائی بے رخی کا رویہ اختیار کیا اور اسے ناقابل سماعت قرار دے دیا۔ بعدازاں 22 فروری 2007 کو سپریم کورٹ کے فاضل جج جسٹس بی پی سنگھ نے پوٹا نظر ثانی کمیٹی کی رپورٹ پر سماعت کے دوران یہ رولنگ دی کہ گودھرا کے اسیران پوٹا عدالت عظمیٰ میں ضمانت کی درخواست داخل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ 10 اپریل 2007 کو باضابطہ طور پر درخواستیں پیش کر دی گئیں اور رجسٹری (رجسٹرار کا دفتر) نے باضابطہ طور پر سماعت کی تاریخ تو دے دی لیکن عدالت مصروفیت کے سبب ان پر غور نہیں کر سکی۔ اس نے ہدایت دی کہ ضمانت کی یہ درخواستیں 18 اگست 2007 کو اس کے سامنے رکھی جائیں تاکہ ان کے تعلق سے آخری فیصلہ سنا دیا جائے لیکن یہ تاریخ آئی اور گزر گئی ان کے تعلق سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

پھر اگست میں ہی انھیں متفرقات کے زمرے میں درج فہرست کیا گیا لیکن ملزمین کے وکیلوں نے گزارش کی کہ اسے غیر متفرق زمرے میں رکھا جائے تاکہ اس پر بحث مباحثے کو پہلی سماعت کے دوران ہی مکمل کر لیا جائے۔ ڈھائی ماہ تک مکمل خاموشی رہی یہاں تک کہ 21 اکتوبر کو ملزمین کے وکلاء نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جس نے رجسٹری کو ہدایت دی کہ انھیں بلا تاخیر سماعت کی تاریخ دے دی جائے۔ چنانچہ 12 دسمبر کو گودھرا کا معاملا باضابطہ طور پر چیف جسٹس اور جسٹس پنچال کی بنچ کے لیے مخصوص کیا گیا۔ لیکن اس دن ملزمین کے وکلا نے یہ اعتراض کیا کہ جسٹس پنچال گجرات کے رہنے والے ہیں اور ان کے بھائی حکومت گجرات کے سرکاری وکیل ہیں اس لیے ان کے سامنے یہ معاملہ رکھنا مناسب نہیں ہوگا عدالت نے اس سے اتفاق کر لیا۔

رجسٹری نے اس کے بعد 11 نومبر 2007 کی تاریخ طے کی اور اس معاملے کو جسٹس اگروال اور سنگھوی کی بنچ کے حوالے کر دیا لیکن چونکہ جسٹس سنگھوی اس سے قبل پوٹا ریویو کمیٹی کے معاملے کی سماعت کر چکے تھے چنانچہ پنچال کی طرح ان کی بھی مخالفت ہو سکتی تھی۔ اس لیے

دوسرے دن انھوں نے مقدمہ کی سماعت سے انکار کردیا۔ملزمین کے وکلاء نے اسی دن سہ پہر میں چیف جسٹس سے ملاقات کر کے انھیں صورت حال سے آگاہ کیا اور انھوں نے یقین دلایا کہ جنوری کے تیسرے ہفتے میں وہ تین رکنی دوسری بینچ تشکیل دیں گے جو ضمانت کی عرضیوں کی سماعت کرے گی۔

چیف جسٹس نے جو کچھ کہا تھا شاید رجسٹری نے بوجوہ اس کے پاس ولحاظ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔اس نے جسٹس بھان، جسٹس سنہا اور جسٹس ماتھر کی بنچ میں گودھرا کے ملزمین کی عرضی کی سماعت طے کردی لیکن 16 جنوری 2008 کو یہ فیصلہ بدل دیا گیا اس دن جو فہرست تیار کی گئی اس میں یہ دکھایا گیا کہ گودھرا کا معاملہ جسٹس رویندرن اور جسٹس پنچال کی عدالت میں پیش ہونا ہے اور یہ جسٹس پنچال وہی ہیں جن کے تعلق سے ملزمین کے وکلاء پہلے اعتراض کر چکے تھے اور عدالت نے ان کے اعتراض کو مان بھی لیا تھا۔جسٹس پنچال کو لے کر گودھرا کے ملزمین کی ضمانت کا معاملہ ایک بار پھر لٹک گیا۔اب یہ معاملہ کب اور کس بنچ کے سامنے آئے گا اور رجسٹری کتنی تاریخیں اور دے گی کچھ کہہ سکنا مشکل ہے۔ایسا کیوں ہے اس سوال کا جواب ظاہر ہے رجسٹری کے ذمہ دار ہی دے سکتے ہیں۔دوسرے سوال اٹھائیں گے تو عین ممکن ہے کہ عدالت کو ان کی جسارت پسند نہ آئے اور مداخلت بیجا کا سوال اٹھ کھڑا ہو۔

گودھرا کے اسیران پوٹا کا معاملہ ایک نہ ایک عدالت عظمیٰ کی کسی بنچ کے سامنے پیش بھی ہوگا اور انھیں ضمانت بھی ملے گی۔انھیں ضمانت کے حق سے بہت دنوں تک محروم نہیں رکھا جا سکتا اور امکان اس بات کا بھی ہے کہ یہ سب کے سب یا ان میں سے کچھ بے گناہ بھی ثابت ہوں اور انھیں بری کردیا جائے۔اور اگر ایسا ہوتا ہے تو اس وقت یہ سوال ضرور اٹھایا جائے گا کہ انھوں نے جو ماہ وسال قید خانوں میں گزارے ہیں ان کا حساب کون دے گا؟ انھیں جو اذیتیں دی گئی ہیں اور انھیں جو کاری زخم لگے ہیں ان کے اندمال کی صورت کیا ہوگی؟ ان کی روزی روٹی کے وسائل جو بکھر چکے ہیں انھیں جوڑا کس طرح جائے گا؟ ٹوٹے بکھرے گھر، تباہ حال خاندان، پریشان

حال اور روٹی کے لیے سرگرداں بچے یہی سب کچھ تو انھیں رہائی کے بعد دیکھنے کو ملے گا کیا یہ سب کچھ دیکھ کر ان کے کلیجے پھٹ نہیں جائیں گے؟ خدا کرے ایسا نہ ہو اور ایسا نہ ہو اس کے لیے دوسری چیزوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں اولین فرصت میں ضمانت پر رہا کر دیا جائے اور ان کے مقدمات کے قطعی فیصلے میں بھی زیادہ وقت نہ لیا جائے۔ کاش ایسا ہی ہو۔

23/ستمبر 2009

OO

خواتین کے لیے ریزرویشن تو
مسلمانوں کے لیے کیوں نہیں

بعد از خرابیٔ بسیار من موہن سنگھ حکومت خواتین ریزرویشن بل راجیہ سبھا میں پیش کرنے میں کامیاب تو ہوگئی لیکن اسے اس کی موجودہ شکل میں پارلیمنٹ سے منظور بھی کرالے گی یہ کہنا مشکل ہے۔ جو لوگ علی الاعلان اس کی مخالفت کر رہے ہیں ان کا تو خیر ذکر ہی کیا وہ لوگ جو خاموش ہیں اور جن کی پارٹیاں اپنے انتخابی مفادات کے پیش نظر فی الحال اس بل کی حمایت کر رہی ہیں وقت آنے پر شاید وہ خاموش نہیں رہ سکیں گے، اپنے حقیقی جذبات کے اظہار کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیں گے۔ یہ بل پہلی بار 4 ستمبر 1996 کو 81ویں آئینی ترمیمی بل کے روپ میں لوک سبھا میں پیش کیا گیا تھا جو لوک سبھا کی مدت کار ختم ہونے کے ساتھ ہی اپنی موت آپ مر گیا۔ پھر یہی کہانی 26 جون 1998، 22 نومبر 1999، 2002 اور 2003 میں بھی دہرائی گئی۔ ہر بار لوک سبھا کی مدت کار کے ختم ہونے کے ساتھ ہی یہ بل اپنے آپ فوت ہوتا رہا۔ کانگریس، بھارتیہ جنتا پارٹی اور دونوں کمیونسٹ پارٹیاں ابتداء سے ہی خواتین کو ریزرویشن دینے کی حامی رہی ہیں اور انھیں یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ لوک سبھا کی مدّت کار کے ختم ہونے کے ساتھ ہی اس کے زیر غور بل اپنے آپ فوت ہوجایا کرتے ہیں لیکن خواتین ریزرویشن بل ہمیشہ اجلاس کے آخری دنوں میں ہی پیش کیا گیا اور نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے

تھا یعنی یہ بل اپنی موت آپ مرتا رہا۔ اگر یہ پارٹیاں واقعتاً مخلص ہوتیں تو یہ بل پہلے ہی راجیہ سبھا میں پیش کیا جاتا جس کی مدّت کار کبھی ختم نہیں ہوتی اور اس طرح یہ بل بھی زندہ رہتا لیکن پہلے ایسا نہیں کیا گیا اور اب جبکہ اسے راجیہ سبھا میں پیش کیا گیا ہے تو یہ بات تقریباً طے ہے کہ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد یہ بل جب لوک سبھا میں پہنچے گا تو ایک نئی لوک سبھا وجود میں آچکی ہوگی۔ ایسے میں اس بل کا کیا بنے گا اس کے بارے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ موجودہ حالات میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ من موہن سنگھ حکومت نے خواتین سے متعلق بل پیش کرنے کا اپنا وعدہ پورا کردیا ہے اور شاید حکومت چاہتی بھی یہی ہے تاکہ آنے والے چناؤ میں اسے وہ اپنے ایک ایسے کارنامے کے روپ میں پیش کرسکے جس کے تعلق سے تین بار کی کوشش کے باوجود بی جے پی اور اس کی حلیف جماعتیں کوئی کامیابی حاصل نہیں کرسکیں۔ وہ اسے پیش کرتی رہیں اور اس کے فوت ہونے کا تماشہ دیکھتی رہیں۔

خواتین ریزرویشن بل کے حوالے سے یہ تذکرہ بھی یقیناً بے محل نہیں ہوگا کہ 33 فی صد ریزرویشن کی بات سب سے پہلے 1970 میں امریکہ میں کاروبار میں عورتوں کی شرکت کے تعلق سے سامنے آئی تھی۔ ایک ملک گیر تحقیقی مطالعہ کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ فیصلہ ساز اداروں میں خواتین کی 30 فی صد نمائندگی فیصلوں پر خاطر خواہ حد تک اثر انداز ہوسکتی ہے۔ بعد ازاں اسٹاک ہوم یونیورسٹی کی ایک خاتون پروفیسر نے اس کا دائرہ سیاسی اداروں میں خواتین کی نمائندگی تک وسیع کردیا۔ اب ہمارے اپنے ملک میں بھی 33 فی صد ریزرویشن کو ہی عورتوں کے مسائل و مصائب سے، ان کی ہمہ قسم کی محرومیوں سے نجات دلانے اور انھیں حقیقی معنوں میں بااختیار بنانے کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔

خواتین کے لیے ریزرویشن کے حامیوں کا کہنا ہے کہ انھیں سماج میں اور ملکی سیاست میں وہ مقام نہیں مل پارہا ہے جس کی وہ مستحق ہیں۔ ان کے ساتھ شدید ناانصافی ہورہی ہے اور ان کی حالت اس وقت تک بہتر نہیں ہوسکتی جب تک کہ قانون ساز اداروں میں ان کی

عددی قوت کے تناسب سے انھیں نمائندگی نہ مل جائے۔ ہندوستانی سماج مردوں کے غلبہ والا سماج ہے اور مرد نہیں چاہتے کہ عورتیں ان کے شانہ بشانہ سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیں۔ بل کے حامیوں کے خیال میں یہ مقصد قانون ساز اداروں میں 30 فی صد ریزرویشن سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بات بظاہر معقول ہے۔ اسی طرح کی دلیل شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے لیے ریزرویشن کے جواز میں بھی دی گئی تھی۔ انھیں جب ریزرویشن دیا گیا تھا تو یہ بات بھی کہی گئی تھی کہ 10 برس بعد غالباً اس کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ لیکن یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ جب تک ووٹ بینک کی ضرورت سیاسی پارٹیوں کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی رہے گی ریزرویشن کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ علاوہ ازیں ریزرویشن کے تعلق سے یہ بات پہلے بھی کہی گئی تھی اور اب بھی کہی جارہی ہے کہ اس سے ریزرویشن حاصل کرنے والے پورے طبقے کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔ کیا دلتوں کے معاملے میں واقعتا ایسا ہی ہوا ہے؟ کیا ایک بہت ہی پتلی سی بالائی پرت (creamy layer) کے علاوہ دلتوں کی وسیع تر آبادی کے حالات قانون ساز اداروں میں ان کے ریزرویشن کے سبب بہتر ہو گئے ہیں؟ نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ آج جہاں وہ ہیں انھیں سیاسی ریزرویشن نہ ملتا تو بھی وہیں رہتے۔ عورتوں کو ریزرویشن دینے کے بعد بھی وہی کچھ ہوگا جو دلتوں کے معاملے میں ہوا ہے۔ یعنی سماج کی بالائی پرت کے علاوہ عام عورت کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اس کے لیے قانون ساز اداروں کی رکنیت آج بھی خواب ہے کل بھی خواب ہی رہے گی خواہ یہ سلسلہ معشوق کی روایتی زلف کی طرح دراز سے دراز تر ہوتا کیوں نہ چلا جائے۔

چلیے ہم یہ مان لیتے ہیں اور ہو سکے تو آپ بھی اس سے اتفاق کر لیجیے کہ عورتوں کی مایوسی اور ان کے ساتھ ہمہ قسم کی ناانصافیوں کے خاتمے کی صورت یہی ہے کہ انھیں قانون ساز اداروں میں 30 فی صد ریزرویشن دے دیا جائے۔ انھیں سیاسی اعتبار سے بااختیار بنا دیا

جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خواتین ہی سماج کا وہ واحد حصہ ہیں جنھیں ریزرویشن کے ذریعہ بااختیار بنانے کی ضرورت ہے؟ ریزرویشن اگر ان کے دکھوں کا مداوا بن سکتا ہے ریزرویشن اگران کی سیاسی بے وزنی کو ختم کر کے انھیں ہندوستانی سماج کا پروقار حصہ بنا سکتا ہے اور ریزرویشن اگر انھیں ہمہ قسم کے امتیازات سے نجات دلا سکتا ہے تو سماج کا وہ حصہ جو ان سے بھی زیادہ کمزور بدحال اور بے اختیار ہے اس کے معاملے میں ریزرویشن کا نام سنتے ہی خواتین کے ریزرویشن کے حامی بھی کانوں پر ہاتھ کیوں دھر لیتے ہیں؟ میری مراد ہندوستانی مسلمانوں سے ہے جنھیں خواہ کسی بھی زاویے سے کیوں نہ دیکھا جائے وہ خواتین سے کہیں زیادہ خراب حالت میں ہیں۔ ہندوستانی مسلمان غربت کی مار جھیل رہے ہیں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہیں اور ہمہ قسم کے امتیازات کے شکار ہیں۔ اعداد وشمار گواہ ہیں اور اگر آپ چاہیں تو سچر کمیٹی کی رپورٹ میں اس کی جھلک بھی دیکھ سکتے ہیں کہ سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ برائے نام ہے۔ صنعت وتجارت میں بھی وہ حاشیے پر کھڑے ہیں۔ ان کی فی کس آمدنی ہندوؤں کی فی کس آمدنی سے کم ہے۔ وہ ملک کی مجموعی آبادی کا 13.4 فیصد ہیں لیکن لوک سبھا میں ان کی نمائندگی صرف 6.7 فیصد ہے۔ 534 رکنی لوک سبھا میں مسلم ممبران کی تعداد کل 36 ہے۔ اگر انہی ساری کمزوریوں' انہی سارے اسباب وعوامل کی بناء پر خواتین کو ریزرویشن دیا جا سکتا ہے تو پھر مسلمانوں کو اس سے محروم کیوں رکھا جا رہا ہے؟ وہ لوگ جو ریزرویشن کو سماجی نابرابری اور سیاسی بے وزنی کا علاج قرار دیتے ہیں وہ مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کی بات آتے ہی بغلیں کیوں جھانکنے لگتے ہیں۔ معیار تو سب کے لیے ایک ہی ہونا چاہیے۔ جنس کی بنیاد پر ریزرویشن جائز ہے تو مذہب کی بنیاد پر اسے ناجائز قرار دے کر سماج کے 13 فی صد حصے کو قعر مذلت میں پڑے رہنے پر مجبور کیوں کیا جا رہا ہے اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ دلتوں کو جو ریزرویشن ملا ہے اس کی بنیاد بھی ہندو دھرم سے ان کا وابستہ ہونا ہی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو تبدیلی مذہب کے بعد مسلمان اور عیسائی دلتوں کو ریزرویشن کی سہولت سے محروم کیوں

کردیا جاتا۔

وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی سماج کو مراعات یافتہ طبقوں اور مراعات سے محروم طبقوں میں تقسیم کرتے چلے جانے کی پالیسی ترک کردی جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو مذہب کے حوالے سے ان مراعات سے محروم نہ رکھا جائے جو ریزرویشن کے نام پر دوسروں کو دی جارہی ہیں۔

9 مئی 2008

○○

صرف معاوضہ کی ادائیگی کافی نہیں

بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے جسٹس این این سنگھ انکوائری کمیشن کی عبوری رپورٹ کی سفارشات کو منظور کرنے کا اعلان کر کے بلاشبہ ایک بہت ہی اچھی اور لائق تقلید مثال قائم کی ہے۔ اس سے شاید ہی انکار کیا جاسکتا ہو کہ ہمارے ملک میں فساد زدگان کے تعلق سے وہ انصاف پسندانہ رویہ کم ہی اختیار کیا گیا ہے جو اختیار کیا جانا چاہیے تھا۔ انھیں انصاف کم ہی مل پایا ہے۔ انتہائی بلند آہنگ دعووں کے باوجود وہ لوگ بھی ان کے ساتھ انصاف پر مبنی رویہ اپنانے میں ناکام رہے ہیں جو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے سیکولرازم سے اپنی گہری وابستگی کا اعلان کرتے کبھی نہیں تھکتے۔ مظلوموں کو معاوضہ دینے کے معاملے میں بھی ہمیشہ ناانصافی برتی گئی ہے۔ اس طرح کی مثالیں بھی ہیں کہ قتل وغارت کا شکار ہونے والوں کے ورثا اور زخمیوں کو جو معاوضہ دیا گیا وہ نہ صرف یہ کہ ناکافی تھا بلکہ انتہائی ہتک آمیز بھی تھا۔ دینے والوں نے بھیک سمجھ کر دیا اور لینے والوں کے سامنے اپنے کشکول آگے بڑھا دینے کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں تھا۔ آسام میں نیلی کا فساد اس کی واضح مثال ہے جہاں مقتولین کے ورثہ کو صرف 2 ہزار روپے دیے گئے تھے۔

جسٹس این این سنگھ کمیشن نے اپنی عبوری رپورٹ میں بھاگل پور کے مظلوموں کے لیے سکھ مخالف فسادات کے مظلومین کے ورثا کے مساوی معاوضہ دینے اور مظلوموں کو پنشن دینے کی سفارش کی ہے۔ وزیر اعلیٰ بہار نے دونوں سفارشوں کو نہ صرف یہ کہ منظور کرلیا ہے بلکہ مرکزی حکومت سے یہ درخواست کرنے میں بھی کوئی تاخیر نہیں کی ہے کہ وہ معاوضے کے

معاملے میں اپنی ذمہ داری ادا کرے۔ ریاستی حکومت پنشن کا انتظام تو خود کرے گی لیکن معاوضے سے متعلق یقین دہانی کو روبہ کار لانے کے لیے اسے مرکز کے فیصلے کا انتظار کرنا پڑے گا۔اور گمان غالب یہی ہے کہ مرکز اپنی ذمہ داری نبھانے میں کوئی آنا کانی نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ 1984 کے سکھ مخالف فسادات کے مظلوموں کے ورثا کو 7 لاکھ فی خاندان کے حساب سے معاوضہ دینے کا فیصلہ کرتے وقت یہ بات بھی واضح کردی گئی تھی کہ اس کا اطلاق تمام فساد زدگان پر ہوگا۔

بھاگل پور کے مظلوموں کو معاوضہ ملنا چاہیے یہ ان کا حق ہے۔انھیں پنشن بھی دی جانی چاہیے جس کے وہ مستحق ہیں اور جس سے اب تک انھیں محروم رکھا گیا تھا۔لیکن کچھ چیزیں اس سے آگے کی بھی ہیں جن پر ملک وسماج کے وسیع تناظر میں سنجیدگی سے غور کیا جانا ضروری ہے۔ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو فسادات کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، لوگوں کو آگ اور خون کا کھیل کھیلنے پر آمادہ کرتے ہیں اور خود بھی مظلوموں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتے ہیں۔اس زمرے میں پولیس اور ایڈمنسٹریشن کے وہ لوگ بھی آتے ہیں جو اپنے عمل اور بے عملی دونوں ہی کے ذریعہ قتل وغارت کے وحشت ناک کھیل میں معاونت کرتے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پیشگی تیاری اور فضا کو مسموم کرنے کی منصوبہ بند کوشش کے بغیر نہ تو کہیں فساد کی آگ بھڑکائی جاسکتی ہے، نہ اسے مسلسل کئی دنوں یا ہفتوں تک جاری رکھا جاسکتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کچھ لوگ بہت ہی عیاری کے ساتھ کچھ جذباتی مسئلے ''دریافت'' کرتے ہیں، انھیں پالتے پوستے ہیں اور رفتہ رفتہ ماحول کو اس حد تک آتش گیر بنا دیتے ہیں کہ ایک ہلکی سی چنگاری بھی لوگوں کے خرمن امن وسکون کو غارت کر کے رکھ دیتی ہے۔

نفرت کی جو بارود فرقہ وارانہ اتحاد و یکجہتی کی تباہی کا سبب بنتی ہے وہ ایک تدریج کے ساتھ مختلف مرحلوں میں اکٹھا کی جاتی ہے اور یہ کام بیشتر حالات میں کچھ زیادہ خاموشی کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔کیا کچھ ہو رہا ہے اور کیا کچھ ہونے والا ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے ان حالات میں کچھ بہت زیادہ فہم و بصیرت کی ضرورت نہیں پڑا کرتی ہے۔ایک عام آدمی بھی بارود کی بو کو آسانی کے ساتھ سونگھ کر یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ فضا کا یہ بوجھل پن بے سبب اور بے

معنی نہیں ہے۔ لیکن افسوس کہ ایڈمنسٹریشن، پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کے لوگ بیشتر حالات میں نہ تو عام طور پر چوکسی کا مظاہرہ کرتے ہیں نہ ان لوگوں پر نظر رکھتے ہیں جو نفرت کی بارود اکٹھی کررہے ہوتے ہیں۔ ان کی قابل اعتراض آتش گیر اور دھماکہ خیز سرگرمیوں کے باوجود نہ تو ان سے کوئی باز پرس کی جاتی ہے نہ ان کی سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے کوئی موثر قدم اٹھایا جاتا ہے۔ پولیس اور ایڈمنسٹریشن کے لوگ اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب یہ بارود پھٹ پڑتی ہے اور آگ وخون کا کھیل اپنی پوری شدت کے ساتھ شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر کچھ الٹی سیدھی کہانیاں گھڑی جاتی ہیں، کچھ بہانے تلاش کیے جاتے ہیں اور 'نزلہ برعضوضعیف می ریزد' کے مصداق اکثر انھیں لوگوں کو جوابدی کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جاتا ہے جو سماج دشمن عناصر کا اصل نشانہ بن رہے ہوتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات میں عام طور پر یہی ہوتا ہے اور بھاگل پور میں بھی یہی کچھ ہوا۔ شلا پوجن کے حوالے سے فرقہ پرست پارٹیوں نے فضا کو شرربار بنانے میں کیا کچھ نہیں کیا لیکن پولیس اور ایڈمنسٹریشن کے لوگ نہ صرف یہ کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے بلکہ اس وقت کے ایس پی دویدی جیسے کچھ دوسرے افسران او پولیس فورس کے لوگ فسادیوں کی کھل کر حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔ جسٹس رام چندر پرساد سنہا اور جسٹس سید شمس الحسن کی مشترکہ رپورٹ میں جو 28 فروری 1995 کو حکومت کے حوالے کی گئی تھی، خاص طور پر ان فرقہ پرست تنظیموں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے جو پورے ملک میں رام مندر کے سوال کو لے کر فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے میں مصروف تھیں۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں مقامی سطح پر کلکٹر، کمشنر، ڈی آئی جی، ایس پی اور ایس ایس پی جیسے افسران کو بھی قصوروار ٹھہرایا ہے اور یہ سفارش کی ہے کہ فرقہ وارانہ فساد میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر ملوث افسران کے خلاف لازمی طور پر کارروائی کی جائے۔ جن کے خلاف دستاویزی ثبوت اور شواہد موجود ہیں ان کے خلاف فوجداری مقدمات قائم کرکے انھیں عدالت سے سزا دلائی جائے اور جن لوگوں نے اپنی بے عملی سے یا سادہ لوحی میں اپنے فرائض منصبی میں کوتاہی برتی ہے ان کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کی جائے۔

بھاگل پور کے مظلوموں کو معاوضہ ضرور ادا کیا جائے۔ یہ ان کا حق ہے۔ یہ انصاف کا تقاضا ہے اور انصاف کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ ظالموں کو بہر قیمت سزا دلوائی جائے۔ حکومت بہار کو اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بغیر انصاف کا عمل ادھورا رہے گا۔

31/اگست 2008

○○

رنگ ناتھ مشرا کمیشن کا اچوک نسخہ

سچر کمیٹی رپورٹ کے بعد ہندوستانی اقلیتوں کے تعلق سے ایک اور رپورٹ پارلیمنٹ کے رواں اجلاس میں پیش کی جانے والی ہے۔ یہ رپورٹ جو رنگ ناتھ مشرا کمیشن رپورٹ کے نام سے جانی جاتی ہے اپنی سفارشات، اپنی تجاویز اور اپنے مواد کے اعتبار سے اس لائق ہے کہ اس کی ایک ایک شق پر، اس کی ایک ایک سطر پر دیانت کے ساتھ، تحفظات ذہنی سے بلند تر ہو کر غور کیا جائے اور اقلیتوں کے مسائل و مصائب کو، ان کی زبوں حالی اور پسماندگی کو دور کرنے کے معاملے میں وعدۂ فردا کی روایت ترک کر دی جائے۔ مسلمان مسائل کی گرداب میں گرفتار ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور سب جانتے ہیں کہ ان کی بدحالی میں، ان کی بے وقعتی اور بے وزنی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ انھیں شکایت ہے کہ سرکاری و غیر سرکاری ملازمتوں میں اور کاروبار میں انھیں وہ حصہ نہیں مل پا رہا ہے جو ازروئے انصاف انہیں ملنا چاہیے اور ان کی یہ شکایت بڑی حد تک درست ہے۔ انہیں شکایت ہے کہ ایوان اقتدار کی غلام گردشوں میں، قانون ساز اداروں میں ان کی موجودگی آبادی میں ان کے تناسب سے کہیں کم ہے اور ان کی اس شکایت کو بھی کسی زاویے سے مبالغہ آمیز نہیں کہا جا سکتا۔ مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ان کے دکھوں کے مداوا اور حالات کو بہتر بنانے کے لیے معقول و مناسب قدم اٹھانے کے وعدے تو انتہائی فراخ دلی کے ساتھ کیے جاتے ہیں، خاص کر انتخابات کے موسم میں، لیکن رات گئی بات گئی کے مصداق، چناؤ کے بعد سب کچھ بھلا دیا جاتا ہے۔ وعدوں کی کشت زار بے حسی کی آگ برساتی ہواؤں میں جھلس کر رہ جاتی ہے تو

امیدوں، آرزووں اور تمناؤں کی نرم رو آب جو وعدہ فراموشی، طوطا چشمی اور بے ضمیری کے ریگ زاروں میں سر پٹک پٹک کر دم توڑ دیتی ہے۔ ثمر بار درختوں کی پھلوں سے لدی ڈالیوں اور دانوں سے بھری بالیوں تک اقلیتوں کی رسائی مشکل ہی سے ہو پاتی ہے۔ انہیں زیادہ تر دور کے جلوے پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے اور بتدریج نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ جسٹس سچر کمیٹی رپورٹ کسی لاگ لپیٹ کے بغیر یہ کہتی سنائی دے رہی ہے کہ ہندوستانی مسلمان بحیثیت مجموعی ہندو و دیگر پسماندہ طبقات کے مقابلے میں زیادہ پسماندہ دکھائی دے رہے ہیں۔

رنگ ناتھ مشرا کمیشن نے اقلیتوں کی پسماندگی کے روگ کے علاج کا جو اچوک نسخہ تجویز کیا ہے اسے ریزرویشن کا نام دیا جاسکتا ہے۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بہت ہی دو ٹوک انداز میں کہا ہے کہ مسلمانوں کو آئین کی دفعہ 16 (4) کے تحت پسماندہ قرار دیا جانا چاہیے۔ اس صورت میں انھیں ملازمتوں میں 10 فیصد ریزرویشن دیا جائے جبکہ دیگر اقلیتوں کو بھی مجموعی طور پر 5 فیصد ریزرویشن دیا جانا چاہیے۔ ملک کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ نے بھی اندرا ساہنی کیس میں یہ تسلیم کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں کو آئین کی دفعہ 16 (4) کے تحت پسماندہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس فیصلے سے رنگ ناتھ مشرا کمیشن کے اس دعوے کی توثیق ہوتی ہے کہ مسلمان بتدریج اس مقام پر پہنچا دیے گئے ہیں جہاں کبھی ہندوؤں کی بیشتر پسماندہ ذاتیں کھڑی تھیں۔

مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کی مخالفت مذہب کی بنیاد پر بھی کی جارہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کو ریزرویشن کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ بظاہر یہ بات عملاً قائل کن نظر آتی ہے لیکن فی الواقع ایسا ہے نہیں۔ اس سلسلے میں آندھرا پردیش ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کا تذکرہ یقیناً بے محل نہیں ہوگا۔ عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کو سیکولرزم کی ضد قرار دینا مناسب نہیں ہوگا اس کے برعکس اگر کسی گروہ کو اس بنیاد پر ریزرویشن سے محروم رکھا جاتا ہے تو یہ بات سیکولرزم کے منافی ہوگی۔ آندھرا ہائی کورٹ کی یہ رولنگ قابل فہم بھی ہے اور انصاف کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ بھی نظر آتی ہے۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ سیکولرزم جو ہمارے آئین کا لازمی جزو ہے اس بات کا مقتضی ہے کہ تمام شہریوں کے

ساتھ مساوی رویہ اختیار کیا جائے اور اس مساوی رویہ کی روح کا ہی تقاضا ہے کہ کمزور اور پریشان حال اقلیتوں کو مساوی سطح پر لانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں۔درج فہرست ذاتوں، قبائل اور دیگر پسماندہ طبقات کو جو ریزرویشن یا غیر معمولی سہولتیں دی گئی ہیں ان کی توجیہ اسی مساوی سطح کے حوالے سے کی جاسکتی ہے۔ اب اقلیتوں کے معاملے میں مذہب کو بنیاد بنا کر ان کے اور ریزرویشن کے درمیان کوئی ناقابل عبور دیوار کھڑی کرنے کی کوشش نہیں کی جانی چاہیے۔ وہ لوگ جو چیخ چیخ کر مذہب کی بنیاد پر کسی بھی گروہ کو ریزرویشن نہ دینے کا مطالبہ کررہے ہیں وہ بڑی آسانی کے ساتھ اس حقیقت کو نظر انداز کیے دے رہے ہیں کہ درج فہرست ذاتوں کو جو ریزرویشن ملا ہے اس کی بنیاد ہندو دھرم سے ان کا رشتہ ہی ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جو اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام یا عیسائیت کے دامن میں پناہ لینے والے درج فہرست ذات کے لوگوں سے ریزرویشن کا وہ حق چھین لیتی ہے جو انھیں تبدیلی مذہب سے پہلے حاصل تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ درج فہرست ذات کے ہندوؤں کے لیے ان کا دھرم ریزرویشن کی بنیاد فراہم کرتا ہے جبکہ اپنا مذہب تبدیل کرنے والوں کے لیے ان کا نیا مذہب انھیں ریزرویشن کی سہولت سے محروم کردینے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کیا اسے دوہرے معیار کا نام نہیں دیا جاسکتا؟ کیا اسے مذہب کے نام پر بدترین قسم کا امتیازی سلوک نہیں کہا جائے گا؟ کیا یہ سلوک سیکولرزم کی نفی نہیں کرتا جسے ہمارے آئین کا لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ایک متبادل تجویز بھی پیش کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر اقلیتوں کو پسماندہ قرار دے کر ان کے لیے 15 فیصد ریزرویشن کا اہتمام کسی سبب سے ممکن نہ ہو تو دیگر پسماندہ طبقات کے لیے مخصوص 27 فیصد کوٹے میں 10 فیصد اقلیتوں کے لیے مخصوص کردیا جائے۔ 6 فیصد مسلمانوں کے لیے اور 4 فی صد دیگر اقلیتوں کے لیے۔ علاوہ ازیں جوڈیشیل سروسز میں بھی اقلیتوں کے لیے ریزرویشن کے امکانات پر غور کیا جانا چاہیے۔

کمیشن نے اضافی ٹرم آف ریفرنس کے تحت یہ تجویز پیش کی ہے کہ آئین کے پیراگراف 3 (شیڈول کاسٹ) آرڈر 1950 کو کلی طور پر حذف کردیا جائے جس کی رو سے

بنیادی طور پر ریزرویشن ہندو درج فہرست ذاتوں کے لیے مخصوص تھا پھر اس میں ترمیم کر کے سکھوں اور بدھسٹوں کو بھی اس زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ ریزرویشن کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ علاوہ ازیں رپورٹ میں یہ سفارش بھی کی گئی ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کی ان ذاتوں کو بھی درج فہرست ذاتوں میں شامل کر لیا جائے جو ہندوؤں میں بھی پائی جاتی ہیں اور اس اعتبار سے درج فہرست ذاتوں کے زمرے کا حصہ ہیں اور ریزرویشن کی تمام سہولتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں میں ایسی 50 ذاتیں یا گروہ پائے جاتے ہیں جنھیں درج فہرست ذاتوں کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اگر اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی کسی ذات کا اندراج دیگر پسماندہ ذاتوں کی فہرست میں ہے تو اسے درج فہرست ذاتوں کے زمرے میں منتقل کر دیا جانا چاہیے۔ ایسا عملاً مختلف ریاستوں میں ہو بھی رہا ہے جسے ہر حال میں مذہب پر مبنی امتیاز کا ہی نام دیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ عیسائیت اور اسلام مساوات انسانی کے عقیدہ کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں، یہ ذات پات کو پوری طرح اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ذات پات ایک ایسی زمینی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ مسلمان ذاتیں جو معاشی درجہ بندی کے اعتبار سے اپنی ثانی ہندو ذاتوں کے ہم پلّہ ہیں انھیں ان سہولتوں سے محروم رکھنا جو دوسروں کو حاصل ہیں کوئی دانائی کی بات نہیں ہو سکتی۔

کمیشن نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ تبدیلی مذہب کے بعد درج فہرست ذات سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو اس زمرے سے خارج نہیں کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص جو کسی درج فہرست ذات سے تعلق رکھتا ہے وہ اگر اسلام قبول کر لیتا ہے تو اسے ان سہولتوں سے محروم نہیں کیا جا سکتا جو درج فہرست ذاتوں کے زمرے سے تعلق رکھنے کی صورت میں اسے حاصل تھیں۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ اس کی مخالفت دوسری چیزوں کے علاوہ اس بنیاد پر بھی کی جاتی رہی ہے کہ مراعات اور سہولتوں سے محرومی درج فہرست ذاتوں کے لوگوں کے لیے مذہب تبدیل کرنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اب اگر یہ شرط ختم کر دی جاتی

اور تبدیلی مذہب کسی طرح کی معاشی رکاوٹ ان کے لیے کھڑی نہیں کرتی تو مذہب تبدیل کرنے کی راہ کا ایک بڑا روڑا خود بخود ختم ہو جائے گا۔

گمان غالب یہی ہے کہ رنگ ناتھ مشرا کمیشن رپورٹ کے مندرجات اگر زیر بحث آئے تو پارلیمنٹ کا ماحول ایک بار پھر آتش بار بن سکتا ہے۔ بی جے پی اور اس کی ہم نوا پارٹیوں کو ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو سیکولر کہنے والے کچھ لوگوں کو بھی رنگ ناتھ مشرا کمیشن کی سفارشات ہضم نہیں ہوں گی اور خود حکومت کے ذمہ داروں کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا رویہ منصفانہ ہی ہوگا۔ یہ لوگ ووٹ کی سیاست پر انصاف کے تقاضوں کو ترجیح دیں گے اور ہر معاملے میں مسلمانوں کی منھ بھرائی کا مشاہدہ کرنے والوں کے خلاف رکوع و سجود کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے تن کر کھڑے ہونے کا فیصلہ کریں گے۔ یہ لوگ سپریم کورٹ میں زیر سماعت مقدموں کا سہارا بھی لے سکتے ہیں یا ایک اور کمیٹی تشکیل دینے کا فیصلہ کر کے پورے مسئلہ کو اور زیادہ طول دے سکتے ہیں۔ کیا کچھ ہوگا اس کا صحیح اندازہ تو پارلیمنٹ میں اس رپورٹ کے پیش ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ اس کے تعلق سے حکمراں کانگریس سمیت مختلف جماعتیں جو روش اختیار کرتی ہیں اس کی بازگشت کافی دیر تک سنی جاتی رہے گی۔

(18 / دسمبر 2009)

○○

مذہب کی آزادی پر
چور دروازے سے حملہ

آئین ہند کی دفعہ 25 میں ملک کے تمام شہریوں کو بلا تفریق مذہب وعقیدہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس دفعہ کا تعلق شہریوں کے بنیادی حقوق سے ہے جو نا قابل تنسیخ بھی ہیں اور جنھیں عام حالات میں عارضی طور پر بھی معطل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آزادی فی الواقع کم وبیش دنیا کے تمام مہذب، جمہوری معاشروں میں شہریوں کو حاصل ہے اور کچھ مبصرین نے اسے اگر جمہوری معاشروں کی روح قرار دیا ہے تو ان پر مبالغہ آرائی کا الزام بہر حال نہیں لگایا جا سکتا۔ ہماری آئین ساز اسمبلی نے مذہبی آزادی، مذہب وعقیدہ کی تبلیغ اور اس پر عمل کی آزادی کی ضمانت دے کر بلاشبہ ہندوستان جیسے کثیر مذہب والے ملک کی ضرورت کا بھی پاس ولحاظ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی سماج کی سیکولر بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن اس آزادی کو قانون کے ذریعہ ضابطہ بند کرنے کی ریاستی حکومتوں کو چھوٹ دے کر اور اسے صحت عامہ اخلاقیات اور نظم ونسق کے ساتھ مشروط کر کے فی الواقع وہ چور دروازے بھی کھول دیے ہیں جن کے ذریعہ انھیں مسدود و محدود بھی کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کبھی کوئی کمی نہیں رہی ہے جو قانون کے ذریعہ تبدیلی مذہب کی آزادی پر قدغن لگانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ اس طرح کی کوشش آزادی سے پہلے بھی مختلف ریاستوں میں سامنے آتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر ریاست سرگوجا 1945 میں اور ریاست اودے پور 1946 میں قانون کے ذریعہ مذہب تبدیل کرنے کی

آزادی پر روک لگانے کی کوشش کر چکی ہیں۔ آزادی کے بعد 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں ریاستی اسمبلیوں کے ذریعہ ایسے قوانین بنائے گئے جو عملاً مذہب کی آزادی کو محدود یا مسدود کرتے تھے۔ ان قوانین نے اکثریت کے فرقہ پرستوں اور پولیس کو اقلیتوں کے خلاف ایک بہت ہی کارگر حربہ فراہم کر دیا۔ اڑیسہ (1963) مدھیہ پردیش (1968) اروناچل پردیش (1978) اور تری پورہ وغیرہ اس کی کچھ چشم کشا مثالیں ہیں۔

1981 میں تامل ناڈو کے میناکشی پورم میں دلتوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے قبول اسلام کے بعد بڑے پیمانے پر اس کا ردعمل ہوا اور وزارت داخلہ نے تمام ریاستوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے یہاں مذہبی آزادی کو منضبط کرنے کے لیے قانون بنائیں۔ اس وقت مسز اندرا گاندھی ملک کی وزیر اعظم تھیں اور یہ مشورہ ظاہر ہے ان کے ایما پر ہی دیا گیا ہوگا۔ بعد ازاں 15 اکتوبر 2002 کو تامل ناڈو نے جبری تبدیلی مذہب پر روک کا آرڈی نینس جاری کیا اور اپریل 2003 میں گجرات کی بی جے پی حکومت نے مذہبی آزادی قانون وضع کر کے مذہب و عقیدہ کی آزادی پر روک لگانے کا ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ گجرات اور تامل ناڈو میں جو قوانین وضع کیے گئے ہیں ان میں نظم و نسق عامہ، اخلاقیات اور صحت عامہ کی ان تینوں شرطوں کا ہی سہارا لیا گیا ہے جن کا تذکرہ آئین کی دفعہ 25 میں ملتا ہے لیکن ان کی نہ تو قائل کن توضیح کی گئی ہے نہ ان حالات و واقعات کی طرف ہلکا سا اشارہ ہی کیا گیا ہے جن کے نتیجے میں یہ قانون بنانا ناگزیر بن گیا تھا۔ گجرات کے قانون میں دوسری ریاستوں سے الگ ہٹ کر ایک مزید دفعہ کے ذریعہ یہ لازمی قرار دے دیا گیا ہے کہ اسلام یا عیسائیت اختیار کرنے سے پہلے کسی مجسٹریٹ کی اجازت بہرصورت حاصل کی جائے۔ بدھ مت سکھ دھرم اور جین دھرم میں داخل ہونے والوں کو اس شرط سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

اب مدھیہ پردیش کی بی جے پی حکومت نے ایک سال قبل 1968 کے قانون میں مختلف ترمیمات کر کے عملاً اسے ایک نئی شکل دے دی ہے جس کے بارے میں یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ یہ تبدیلی مذہب کی آزادی کو سلب کرنے کی ایک بھرپور کوشش ہے۔ مقام مسرت ہے کہ مدھیہ پردیش کے گورنر مسٹر بلرام جاکھڑ نے اس پر دستخط کرنے کے بجائے اسے اٹارنی جنرل

آف انڈیا کے پاس ان کی قانونی رائے جاننے کے لیے بھیج دیا۔ اٹارنی جنرل نے تقریباً ایک سال کے بعد اپنی رپورٹ اب گورنر کے پاس بھیج دی ہے جس میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ مذکورہ قانون شہریوں کے بنیادی حقوق کے مغائر ہے۔ اس ضمن میں یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ جس وقت اپنی ترمیم شدہ شکل میں یہ قانون منظور کرایا گیا اس وقت نہ تو ایوان میں اپوزیشن کے اراکین موجود تھے نہ کوئی بحث ومباحثہ ہوا۔

اس ترمیم شدہ قانون میں مذہب تبدیل کرنے اور کرانے والے دونوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو کم از کم ایک ماہ قبل اس کی اطلاع دیں تبدیلی مذہب کے خواہش مند لوگوں کے باضابطہ نام اور پتے درج کرائے جائیں اور اس مقام کی بھی نشاندہی کی جائے جہاں تبدیلی مذہب کی یہ تقریب منعقد ہونے والی ہے۔ اس تحریری اطلاع کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پولیس کپتان کو جانچ پڑتال کے لیے لکھے گا جو متعلقہ تھانے کے انچارج کو معاملے کی پوری تفتیش کے بعد اپنی تفصیلی رپورٹ پیش کرنے کے لیے کہے گا۔ اس جانچ پڑتال کی روشنی میں مجسٹریٹ تبدیلی مذہب کی اجازت اس صورت میں ہی دے گا جب حالات اس کے اعتبار سے اطمینان بخش ہوں اور لالچ یا زور زبردستی مذہب تبدیل کرانے کا عنصر عملاً سرے سے معدوم ہو۔ اس شرط کی عدم تکمیل کی صورت میں قید و جرمانہ کی سزا دی جا سکتی ہے۔

حکومت مدھیہ پردیش نے تبدیلی مذہب سے متعلق قانون کو مزید دھار دار بنانے کے جواز میں سب سے مضبوط دلیل یہ دی تھی کہ ریاست کے آدی واسی علاقوں میں بیرونی مشنریاں بھاری رقوم خرچ کر کے بڑے پیمانے پر لوگوں کا مذہب تبدیل کرا رہی ہیں۔ اس الزام میں کتنی صداقت ہے یہ جاننے کے لیے مسٹر بلرام جاکھڑ نے حکومت سے گزشتہ پانچ سال کے دوران تبدیلی مذہب کے جو بھی واقعات ہوئے ہیں ان کی تفصیل مہیا کرنے کے لیے کہا۔ انھوں نے یہ بھی جاننا چاہا کہ مذہب تبدیل کرنے والوں کی عمر کیا تھی اور ان میں سے کتنوں کا تعلق آدی واسی قبائل سے تھا۔ حکومت کی طرف سے 48 میں سے صرف 20 اضلاع کے بارے میں ہی تفصیلات مہیا کی گئیں، جن کی بنیاد پر گورنر نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حکومت نے بڑے

پیمانے پر لالچ اور جبر کے ذریعہ مذہب تبدیل کرانے کا جو دعویٰ کیا ہے اس میں شمہ برابر بھی صداقت نہیں ہے۔ وہ اس نتیجے پر اس لیے بھی پہنچے کہ بہت سے پسماندہ علاقوں میں سے کسی ایک میں بھی کسی فرد واحد یا کسی ایک خاندان کے مذہب تبدیل کرنے کا ایک بھی ثبوت مہیا کرنے میں حکومت قطعاً ناکام رہی تھی۔

اٹارنی جنرل آف انڈیا کی رپورٹ کی روشنی میں اب گورنر بلرام جاکھڑ کے لیے یہ بات آسان ہوگئی ہے کہ وہ متعلقہ قانون کو حکومت کے پاس نظر ثانی کے لیے بھیج دیں۔ مدھیہ پردیش کی بی جے پی حکومت ظاہر ہے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرے گی کیونکہ یہ بات سنگھ پریوار کے لوگوں کی بنیادی سوچ کا حصہ ہے کہ تبدیلی مذہب لالچ یا جبر کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی مان کر چلتے ہیں کہ تبدیلی مذہب کے سبب ملک میں ہندوؤں کی آبادی گھٹتی جارہی ہے۔ پچھلی صدی کی ساتویں' آٹھویں دہائی میں وشوہندو پریشد نے بڑے پیمانے پر ایسا لٹریچر شائع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ 2030 تک ہندو اقلیت میں آجائیں گے۔ اس وقت ہندو ملک کی مجموعی آبادی کا 83 فیصد ہیں۔ وہ آئندہ 23 برسوں میں 50 فیصد سے کم کس طرح ہو جائیں گے اس سوال کا جواب ظاہر ہے نہ تو عام لوگ دے سکتے ہیں نہ اس پر یقین کر سکتے ہیں۔ اس پر وہی لوگ یقین کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنے بند دماغ کی چابیاں ناگپور کے سنگھ ہیڈ کوارٹر میں جمع کرا رکھی ہیں۔ ایسے لوگ کم نہیں ہیں اور کمی ایسے لوگوں کی بھی نہیں ہے جو ان کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ جذبات سے کھلواڑ کرتے ہیں' ان کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں عقل کی میزان پر کھرا بھی اترتا ہے۔

15/ جون 2007

○○

دوسری شادی کے لیے اسلام کا سہارا

کچھ غیر مسلم حضرات جنھیں ان کا قانون ایک سے زائد شادی کی اجازت نہیں دیتا کبھی کبھی پہلی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے یا کسی اور سے شادی کرنے کی غرض سے اسلام قبول کرنے کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور اس طرح تعدداز دواج کی اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنے مذموم ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتے ہیں۔ اگر چہ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنھوں نے قبول اسلام کا فیصلہ نیک نیتی کے ساتھ، اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ہی کیا ہوتا ہے لیکن ایسے لوگ خال خال ہی ملتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی کوئی شادی شدہ غیر مسلم مرد اسلام قبول کر کے فوراً دوسری شادی کر لیتا ہے تو یہ سوال فطری طور پر اٹھتا ہے کہ قبول اسلام کا اصل محرّک کیا ہے۔ رضائے الٰہی یا نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے قانونی راہ کی تلاش۔ مثالیں بہت سی ہیں۔ تازہ ترین مثال ہریانہ کے سابق نائب وزیر اعلیٰ چندر موہن اور انورادھا بالی کی ہے جنھوں نے قبول اسلام کے بعد باضابطہ طور پر شادی بھی کر لی اور کچھ ہی دنوں میں اپنی شادی اور قبول اسلام دونوں ہی کو عملاً مذاق بنا کر رکھ دیا۔ غالباً اسی طرح کی تکلیف دہ مثالوں کے پیش نظر ہی لاء کمیشن نے ہندو شادی قانون 1955 میں ایک نئی شق کا اضافہ کر کے شادی کے لیے تبدیلی مذہب پر روک لگانے کی سفارش کی ہے۔ یہ سفارش کمیشن کی تازہ ترین رپورٹ میں کی گئی ہے جس میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ اس کا مقصد تعدد ازدواج کی سہولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسلام قبول کرنے کا ڈھونگ رچانے کی راہ مسدود کرنا ہے۔

اس رپورٹ میں کیا کچھ کہا گیا ہے اس سے قطع نظر یہاں یہ تذکرہ یقیناً بے محل نہیں ہوگا

کہ جسٹس مسٹر کلدیپ سنگھ اور جسٹس آر ایم سہائے پر مشتمل سپریم کورٹ کی ایک دو رکنی بنچ 10 مئی 1995 کو مسز سرلا مدگل وغیرہ کے معاملہ میں ایک غیر معمولی فیصلہ دے کر یہ بات پوری طرح واضح کر چکی ہے کہ ہندو شادی جو ہندو قانون کے تحت کی گئی ہو صرف اس قانون میں درج بنیادوں کے حوالے سے ہی منسوخ قرار پائے گی، جب تک اس قانون میں درج کسی بنیاد کے حوالے سے ہندو شادی منسوخ قرار نہیں پاتی اس وقت تک زوجین میں سے کسی ایک کو بھی دوسری شادی کرنے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس وقت سپریم کورٹ کی مذکورہ بنچ کے سامنے چار عرضیاں تھیں۔ اصل معاملہ مسز مینا ماتھر کی دائر کردہ رٹ سے عدالت کے سامنے آیا۔ مینا ماتھر سے جتندر ماتھر کی شادی 27 فروری 1978 کو ہوئی تھی ان کے تین بچے تھے۔ 1988 میں جتندر ماتھر نے اسلام قبول کر کے سنیتا نرولا سے شادی کر لی۔ مینا ماتھر کا کہنا تھا کہ انھوں نے دفعہ 494 کے تحت کارروائی سے بچنے کے لیے ہی اسلام قبول کیا ہے۔ رٹ داخل کرنے والی ایک دوسری مدعیہ مسز گیتا رامی رانی نے عدالت سے کہا کی ہندو رسم و رواج کے مطابق اس کی شادی پردیپ کمار سے ہوئی تھی جو دسمبر 1991 میں دیپا نامی ایک عورت کو لے کر فرار ہوگیا اور اسلام قبول کر کے اس سے شادی کر لی۔ ایک اور مدعیہ سشمیتا گھوش نے اپنی عرضی میں کہا کہ اس کی شادی 10 مئی 1984 کو جی سی گھوش کے ساتھ ہندو رسم و رواج کے تحت ہوئی تھی۔ 20 اپریل 1992 کو اس کے شوہر نے بتایا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا اور دباؤ ڈالا کہ وہ اسے طلاق دینے کے لیے راضی ہوجائے۔ سشمیتا گھوش اس کے لیے راضی نہیں ہوئی تو جی سی گھوش نے اسلام قبول کر لیا اور ونیتا نامی ایک دوسری عورت سے شادی کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ سشمیتا نے سپریم کورٹ سے درخواست کی کہ اس کے شوہر کو ونیتا گپتا سے شادی کرنے سے روکا جائے۔

عدالت نے ان تینوں عرضیوں کو ایک سماجی تنظیم کلیانی کی صدر سرلا مدگل کی رٹ پٹیشن کے ساتھ جوڑ دیا اور یہ پورا معاملہ انہی کے نام سے موسوم ہوا۔ بنچ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ ”ہندو شادی قانون کی متعدد شقوں سے ظاہر ہے کہ ہندو لاء یک زوجگی کا نفاذ پوری سختی سے کرتا ہے۔ اس قانون کے تحت کی جانے والی شادی صرف اس صورت میں ہی فسخ قرار پائے

گی جب اس قانون کی دفعہ 13 کے تحت بیان کی جانے والی کوئی بنیاد موجود ہو۔ اس قانون کے تحت کی جانے والی شادی اس صورت میں بھی بدستور برقرار رہتی ہے جب کوئی شوہر دوسری بیوی کے لیے اسلام قبول کرلیتا ہے..... مذہب تبدیل کرنے والے کسی ایسے شخص کی دوسری شادی اس بیوی کے حوالے سے غیر قانونی قرار پائے گی جس نے اس سے ہندو قانون کے تحت شادی کی ہے اور اب بھی ہندو دھرم پر قائم ہے... قبول اسلام اور اس کے بعد دوسری شادی ہندو شادی ایکٹ کے تحت کی گئی شادی کی منسوخی کا موجب نہیں بنتی۔ مذہب تبدیل کرنے والے کی دوسری شادی ہندو ایکٹ کی خلاف ورزی ہوگی اور تعزیرات ہند کی دفعہ 494 کے تحت یہ شادی ناجائز قرار پائے گی۔"

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کی توثیق بعد میں للی تھامس کیس میں بھی ہوئی۔ ان دونوں معاملات میں سپریم کورٹ کی رولنگ واضح طور پر قبول اسلام کے ڈھونگ کی حوصلہ شکنی کرتی نظر آتی ہے۔ اس رولنگ کی رو سے شوہر کے قبول اسلام کے بعد اس کی بیوی سے اس کا رشتہ ازخود منقطع نہیں ہوجاتا اور اس طرح کے کسی بھی شخص کے خلاف دفعہ 494 کے تحت قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے جو موجب سزا بن سکتی ہے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ عدالت عظمیٰ کی یہ واضح رولنگ بھی اس روگ کو ختم کرنے میں معاون نہیں بن سکی۔ اب ہندو میرج ایکٹ میں ایک مزید شق کا اضافہ اس بیماری کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں معاون بن سکے گا اس سلسلے میں ظاہر ہے کوئی بات فی الحال وثوق سے نہیں کہی جاسکتی۔

جہاں تک مسلم قانون کے ماہرین مثلاً مسٹر فیضی، امیر علی، طیب جی وغیرہ کا تعلق ہے ان کا بھی ماننا ہے کہ کسی پرسنل لاء کے تحت کی جانے والی شادی کسی دوسرے مذہب کو اختیار کرلینے کے بعد خود بخود فسخ نہیں ہوجاتی۔ مسلمانوں کو ظاہر ہے اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ دوسری شادی کے لیے اسلام قبول کرنے کے ڈھونگ کو بہرحال روکا جانا چاہیے ایسے لوگوں کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے اس کے لیے جو بھی قانونی بندش لگائی جاسکتی ہو لگائی جانی چاہیے لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ کچھ شادی شدہ لوگ اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں، ان کی حوصلہ شکنی بہرحال

نہیں ہونی چاہیے۔

انصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہندو میرج ایکٹ میں یہ گنجائش بھی پیدا کی جائے کہ مذہب تبدیل کرنے والا شوہر بھی طلاق کے لیے عدالت سے رجوع کر سکے۔ موجودہ حالات میں یہ سہولت صرف بیویوں کو ہی حاصل ہے۔ ہندو شادی قانون میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر شوہر اپنا مذہب تبدیل کر لے تو اس بنیاد پر بیوی طلاق کا مقدمہ دائر کر سکتی ہے کہ اس کے شوہر نے مذہب بدل لیا ہے لیکن شوہر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عدالت سے کہے کہ چونکہ اس نے اپنا مذہب بدل لیا ہے اور بیوی پرانے مذہب پر قائم ہے اس لیے اسے طلاق کی اجازت دی جائے کیونکہ اب ساتھ رہنا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ یہ حق نہ ملنے کی صورت میں شوہر کو بیوی کے عدالت جانے کا انتظار کرنا پڑے گا اگر وہ ایسا نہیں کرتی ہے تو اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ شوہر کی زندگی مستقل عذاب بن جائے۔

جہاں تک اسلام کے قانون ازدواج کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں کافی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اسلام چار شادیوں کی اجازت تو دیتا ہے لیکن یہ محض اجازت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر مسلمان کو چار، تین یا دو بیویاں رکھنی ہی ہیں قرآن پاک کا مشورہ ہے کہ بہتر یہی ہے کہ ایک بیوی پر ہی اکتفا کیا جائے۔ اسلام نے تعدّد ازدواج کی کھلی چھوٹ نہیں دی ہے۔ یہ مشروط اجازت ہے۔ اسے بہرحال ذہن میں رکھنا چاہیے۔ جو لوگ محض دوسری شادی کے لیے یا پہلی بیوی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے اسلام کا سہارا لیتے ہیں انھیں انسانیت کے دامن پر بدنما داغ ہی کہا جائے گا۔

7/اگست 2009

OO

ذات پات، اسلام اور مسلم سماج

کیا اسلام میں ذات پات پر مبنی تفریق کی کوئی گنجائش ہے؟ کیا اسلام کسی بھی درجے میں، کسی بھی عنوان سے ذات پات کے نظام کی بالواسطہ یا براہ راست تائید یا توثیق کرتا ہے؟ اور کیا مسلم سماج بھی دوسرے سماجوں کی ہی طرح مختلف چھوٹی بڑی برادریوں اور ذاتوں میں منقسم ہے؟ کیا اشراف، اجلاف اور ارذل ذاتوں میں مسلمانوں کی تقسیم بھی ہندوستانی سماج کو باہم تقسیم کرنے والی مختلف اکائیوں کی ہی طرح پیداواری سلسلۂ عمل سے جڑی ہوئی ہے جو دراصل ہندو ذاتوں کو ہی کسی نہ کسی درجے میں منعکس کرتی ہے؟ یہ سارے سوال کسی نہ کسی شکل میں ملک کی سب سے بڑی عدالت کے سامنے زیر بحث آنے والے ہیں۔ یہ سوال اکھل مہاراشٹر مسلم کھٹک سماج کی مفاد عامہ کی اس پٹیشن کے نتیجے میں اٹھے ہیں جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ذات پات پر مبنی ریزرویشن کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سپریم کورٹ کی متعلقہ بنچ نے جس کے سربراہ خود چیف جسٹس مسٹر بالاکرشنن ہیں حکومت ہند سے اس معاملے میں اپنا موقف واضح کرنے کے لیے کہا ہے۔ حکومت اس معاملے میں کیا موقف اختیار کرتی ہے، مسلمانوں کی پچھڑی ذاتوں کو ریزرویشن ملتا ہے یا نہیں اس سے زیادہ اہم اور دوررس مضمرات کا حامل یہ سوال ہے کہ کیا مسلم سماج کو مختلف چھوٹی بڑی اکائیوں میں تقسیم کرنا اور اس تقسیم کی جڑوں کو مراعات کی کھاد، پانی فراہم کرتے چلے جانا اسلام کے بنیادی اصولوں اور مسلم سماج کے وسیع تر مفاد سے ہم آہنگ ہے؟ ان سوالوں کو مزید نظرانداز کرتے رہنے کا نتیجہ خود اپنی جڑوں پر کلہاڑا چلانے اور رشتۂ اخوت کو پارہ پارہ کرتے چلے جانے کی صورت میں

ہی برآمد ہو سکتا ہے۔

جہاں تک اسلام کے اثاثی اصولوں کا تعلق ہے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اسلام رنگ ونسل، حسب ونسب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ اس ضمن میں قرآن کریم کی سورۂ الحجرات کی تیرہویں آیت میں بہت ہی واضح الفاظ میں کہا گیا ہے: ''اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمھاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور تمہیں نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ (ورنہ دراصل یہ تفریق وانشعاب کوئی ذریعہ امیتاز نہیں) اور امتیاز وشرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے بلاشبہ اللہ انتہائی علیم وخبیر ہے''۔ اس آیت کریمہ میں دو چیزیں پوری طرح واضح کر دی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نوع انسان کی مختلف نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انھیں پہچانا جا سکے یعنی یہ تقسیم محض ذریعہ شناخت ہے اس کے ساتھ عزت وذلت یا چھوٹے بڑے کا کوئی تصور وابستہ نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ کہ عزت وشرف کا تعلق حسب ونسب سے نہیں بلکہ تقویٰ سے ہے اللہ کے نزدیک امیتاز وشرف اسی کے لیے ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ اسلام عزت وشرف کا واحد معیار تقویٰ کو قرار دیتا ہے یعنی سماج کی تقسیم اگر اشراف، اجلاف اور ارزل میں کی جا سکتی ہے تو اس کی بنیاد تقویٰ ہی ہو سکتی ہے نہ کہ حسب نسب، مال ودولت، قبیلائی وجغرافیائی نسبتیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے آخری خطبۂ حج میں دوسری چیزوں کے علاوہ بہت ہی دوٹوک لفظوں میں کہا تھا کہ اب کسی گورے کو کسی کالے پر کسی کالے کو کسی گورے پر، کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی قبیلے کو کسی قبیلے پر اور کسی کو بھی حسب نسب کی بنیاد پر کوئی ترجیح حاصل نہیں ہوگی۔ اگر ترجیح کی کوئی بنیاد ہوگی تو وہ تقویٰ ہوگا۔ حضور ﷺ اور خلفائے راشدین ہی نہیں بلکہ بعد کے دنوں میں بھی ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جو اسلام کے نظریۂ مساوات کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ اس ضمن میں دو مثالیں خاص طور پر پیش کرنا چاہوں گا۔ ایک کا تعلق قبیلہ غسان کے سردار جبلہ بن ایہم سے اور دوسری کا مصر کے گورنر عمرو بن العاص سے ہے۔ حضرت عمرؓ سے ایک بدو نے شکایت کی کہ جبلہ بن ایہم نے اسے تھپڑ مارا ہے۔

حضرت عمرؓ نے جبلہ بن ایہم کو بلایا اور کہا کہ اگر بدو اسے معاف نہیں کرتا تو وہ اپنے ساتھ کی گئی زیادتی کا بدلہ اسے تھپڑ مار کر لے گا۔ جبلہ بن ایہم کو خلیفۂ وقت کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے کہا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ میں شہزادہ ہوں اور وہ ایک عام آدمی۔ حضرت عمرؓ نے اسے سمجھایا کہ اسلام نے تم دونوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے اب تم دونوں برابر ہو۔ جبلہ بن ایہم اس اہم نکتے کو سمجھنے سے قاصر رہا اور وہ چپکے سے اپنے قبیلے میں واپس لوٹ گیا۔ اس نے اسلام سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور اس کی اس حرکت پر نہ کسی کو کوئی حیرت ہوئی نہ افسوس اس لیے کہ ان کے نزدیک کسی فرد کے مقابلے میں اسلام کا اصول مساوات زیادہ اہم تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں عمرو بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ ان کے بیٹے نے ایک عیسائی کو زدوکوب کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ جتانے کی کوشش بھی کی کہ اس کا تعلق ایک بہت ہی عزت دار خاندان سے ہے۔ متعلقہ شخص مدینہ پہنچا۔ حضرت عمرؓ سے ملاقات کی اور سارا واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔ حضرت عمرؓ نے گورنر عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے کو مدینہ بلایا اور شکایت کنندہ سے کہا کہ وہ گورنر کے بیٹے کو اسی طرح زدوکوب کرے جس طرح کہ اس نے کیا تھا۔ پھر آپ نے عمرو بن العاص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "ان کی ماؤں نے تو انھیں آزاد جنا تھا تم نے انھیں غلام بنانا شروع کر دیا"۔

اسلام گزشتہ کئی صدیوں سے مساوات و اخوت کے زریں اصولوں کا درس دیتا رہا ہے۔ اس کے ماننے والے ان اصولوں کو حتی الوسع عملی زندگی میں برتنے کی کوشش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ دوسری چیزوں سے کہیں زیادہ اس اصول اور عملی زندگی میں اسے برتنے کی کوشش کے نتیجے میں ہی مسلمانوں کو دنیا کے ایک بڑے خطے میں فتوحات حاصل ہوئیں۔

اگر یہ درست ہے کہ شرف و امتیاز کی بنیاد حسب و نسب نہیں بلکہ تقویٰ ہی ہے تو پھر ذات پات کے نظام کو ظاہر ہے کوئی مسلمان تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ عملی دنیا میں کبھی کبھی نظریاتی اور اصولی بنیادوں کو نظر انداز کر دینا پڑتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ جو کچھ ہونا چاہیے اس کے مقابلے میں زیادہ باوزن اور لائق عمل قرار پاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ مسلم سماج میں ذات پات کا بھی ہے جو عملاً کوئی نظریاتی تشکیل نہیں ہے۔ اس نے

ہندوستانی سماج کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اس کی بنیاد فی الواقع پیداواری تعلقات کے تانے بانے پر ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اشراف، اجلاف اور ارذل کے خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہمارے کچھ علماء نے کفو کے دائرے کی غیر ضروری اور حماقت انگیز توسیع کے ذریعہ اس تقسیم کو مزید مستحکم بنایا ہے۔ ہندوستان کے مسلم سماج کی ذات پات میں تقسیم کا تفصیلی تذکرہ 14ویں صدی کے ایک ترکی عالم ضیاء الدین بارانی کی تصنیف فتویٰ جہاں داری میں ملتا ہے۔ بارانی محمد بن تغلق کا درباری تھا اور اس کی تصنیف کا بنیادی مقصد شاہان تغلق کو ذات پات کی بنیاد پر ریاستی مشینری کی تشکیل پر آمادہ کرنا تھا۔ ضیاء الدین کے لیے اشراف واجلاف کی تقسیم ایک بنیادی عقیدے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شرافت اور تقویٰ جو اللہ کو پسند ہے وہ شرفاء اور ان کی اولاد میں ہی مل سکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ذات پات کے معاملے میں ریاست کے قانون کو شرعی قانون پر ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔ فتویٰ جہاں داری میں اجلاف کو گناہوں کی پوٹ اور اشراف کو خوبیوں کی کان قرار دیا گیا ہے۔ ضیاء الدین بارانی اجلاف کو فی الواقع درس وتدریس کے دائرے سے بھی دور رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ اشراف کو حاصل سہولتوں اور ان کے خصوصی حقوق کے حصول کی کوشش نہ کرسکیں۔

ہندوستانی مسلمانوں میں ایک معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی اب بھی موجود ہے جو بارانی جیسے متشدد تو نہیں ہیں لیکن مسلم سماج میں ذات پات کے قائل ضرور ہیں۔ بارانی اور ان میں ایک یہ فرق بھی ہے کہ بارانی اجلاف کو ہمہ قسم کی مراعات سے محروم دیکھنا چاہتا تھا جبکہ اب جو لوگ ذات برادری کے قائل ہیں وہ اس کی بنیاد پر خصوصی مراعات اور ریزرویشن کا مطالبہ کررہے ہیں۔ اسی موضوع پر رنگ ناتھ مشرا کمیشن اپنی ایک ضخیم رپورٹ بھی 8 ماہ قبل وزیر اعظم کو پیش کرچکا ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں اس رپورٹ کے حوالے سے بھی کچھ سوالات اٹھائے جائیں گے۔ رنگ ناتھن مشرا کمیشن رپورٹ میں مسلمانوں کی ان ذاتوں کو درج فہرست ذاتوں کی لسٹ میں شامل کرنے کی پرزور سفارش کی گئی ہے جو ایسی ہی ہندو ذاتوں کی فہرست ہے جیسے ''بھنگی'' مثلاً خاکروب اگر مسلمان ہے تو وہ شیڈولڈ کاسٹ کی فہرست میں نہیں ہے لیکن ہندو بھنگی (خاکروب) شیڈولڈ کاسٹ کی لسٹ میں

بھی ریزرویشن کے فائدوں کا حقدار ہے۔ کمیشن نے ارذل مسلم ذاتوں (خاکروب، سقہ، نائی، دھوبی، مداری، فقیر وغیرہ) کی سماجی معاشی تعلیمی حالت دلتوں سے بدتر پائی ہے۔ مشرا کمیشن رپورٹ پر عمل درآمد کی صورت میں مسلمانوں کی تقریباً 50 ذاتیں دلتوں کو ملنے والی سہولتوں اور فائدوں کی حقدار ہو جائیں گی۔ سپریم کورٹ میں مہاراشٹر کھٹک سماج کی مفاد عامہ کی عرضی اور رنگ ناتھن مشرا کمیشن رپورٹ پر وسیع پیمانے پر بحث و مباحثہ سے پہلے مناسب ہوگا کہ علماء، ماہرین آئین و قانون اور سماجی امور کے ماہرین باہم مل کر کوئی ایسا راستہ تلاش کرلیں جس سے اسلام کے اصول مساوات پر زد بھی نہ پڑتی ہو اور انتہائی غریب و مفلوک الحال مسلمانوں کو جو مدت مدید سے ملت کی بے اعتنائی کے شکار اور استحصال کی چکی میں بری طرح پستے رہے ہیں وہ سہولتیں بھی مل جائیں جو دوسروں کو مل رہی ہیں۔ ذات پات ہندوستانی سماج بشمول مسلم سماج کی ایک بنیادی حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یکم فروری 2008

OO

سارے دہشت گرد مسلمان نہیں ہیں

دہشت گردی اسلام کی ضد ہے اور اسلام ہی کیا کوئی بھی مذہب جسے صحیح معنوں میں مذہب کہا جاسکتا ہو، نہ دہشت گردی کی تائید کرتا ہے نہ اس کی ترغیب دیتا ہے۔ دہشت گردی انسانیت کے جسم کا کوڑھ ہے جو اس کی رعنائی و برنائی سلب کرلیتا ہے۔ دہشت گردی نہ کسی ریاست کی حدود و قیود کی پابند ہوتی ہے نہ کسی مخصوص قوم سے اس کا کوئی خاص رشتہ ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ اس کا اپنا کوئی چہرہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ بے چہرہ عفریت اپنے طریقۂ واردات سے، اپنے مذموم مقاصد سے اور انسانی اقدار کو انتہائی بے شرمی کے ساتھ پامال کرنے کی روش سے پہچانا جاتا ہے۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ اس کا بے چہرہ ہونا ہی اس کی بنیادی صفت بھی ہے اور اس کی ایک ناگزیر ضرورت بھی۔ ہمیشہ یہی صورت حال رہی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اسے ایک خاص چہرہ دینے کی کوشش بھی کی جاتی رہی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ امریکی ٹریڈ سینٹر پر دہشت گردانہ حملے کے بعد اس میں غیر معمولی شدت پیدا ہوئی ہے یک قطبی دنیا کے سب سے بڑے چودھری جارج واکر بش نے جنھیں صلیبی جنگوں کی کوکھ سے جنم لینے والی عصبیت ورثے میں ملی ہے آنکھ بند کرکے یہ اعلان کردیا کہ اس حملے کی منصوبہ بندی القاعدہ نے کی تھی اور القاعدہ جس جہادی نظریے پر یقین رکھتی ہے وہ پوری دنیا کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ پھر بات القاعدہ اور اس کے نظریات تک محدود نہیں رہی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس نے پورے اسلام کا احاطہ کرلیا۔ اب اسلام اور دہشت گردی کو ایک ہی سکے کے دو روپ کے طور پر دیکھا جانے لگا اور اس طرح دہشت گردی کو ایک مخصوص چہرہ مل

گیا۔ بڑے چودھری نے اسلامی دہشت گردی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنالیا۔

بڑے چودھری کے پاس نہ تو ابلاغ عامہ کے وسائل کی کوئی کمی تھی اور نہ ان لوگوں کی جو پوری دنیا میں اس کی سوچ کو عام کرسکیں۔ ان میں چہرے والے لوگ بھی تھے اور وہ بے چہرہ لوگ بھی جنھوں نے مختلف چہروں کے ساتھ بڑے چودھری کی خدمت کو اپنے لیے فرض عین قرار دے لیا تھا۔ ان لوگوں نے ایک عجیب وغریب فارمولا وضع کیا جس کا مقصد فی الواقع اپنے اصل عزائم پر پردہ ڈالنا اور مسلمانوں کو یہ باور کرانا تھا کہ وہ نہ تو اسلام کے مخالف ہیں نہ سارے مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔ اس فارمولے کا لب لباب یہ تھا کہ ''سارے مسلمان دہشت گرد نہیں ہیں لیکن سارے دہشت گرد مسلمان ہیں''۔ اس فارمولے کے تحت عملاً کچھ کہے بغیر یہ باور کرانے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ دہشت گردی کا جب بھی، جہاں بھی کوئی واقعہ ہوگا تو اس کی پشت پر بلاشبہ مسلمان ہی ہوں گے۔ اس طرح سیدھے سیدھے ناک پکڑنے کے بجائے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسلمان اور دہشت گردی کا اٹوٹ رشتہ ثابت کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور فارمولا کوئی اور نسخہ شاید ہی دستیاب ہوسکتا ہو۔

اس فارمولے کو ہمارے اپنے ملک میں بھی غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ سنگھ پریوار اور دیگر مسلم دشمن تنظیموں کا تو ذکر ہی کیا سرکاری ادارے اور سرکار دربار سے وابستہ افراد بھی اس کے سحر میں گرفتار پائے گئے۔ ہماری خفیہ ایجنسیوں، پولیس اور ایڈمنسٹریشن نے تو اسے ایک مہامنتر کے طور پر جپنا اور اس پر عمل کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی، جب کبھی بھی دہشت گردی کا کوئی واقعہ ہوا تو فوراً مسلمانوں کی دھر پکڑ کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ اس سے کوئی فرق کبھی نہیں پڑا کہ بم دھماکہ کسی مسجد میں ہوا ہے یا مندر میں، منگل کے دن پوجا کے لیے بڑی تعداد میں جمع ہونے والے بھکتوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے یا جمعہ کی نماز کے

لیے مسجد میں اکٹھا ہونے والے نمازیوں کو خاک وخون میں تڑپانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ دھماکہ کہیں بھی ہوا ہو الزام مسلمانوں ہی کے سر ڈالا گیا اور مسلم نوجوانوں کو ہی گرفتار کر کے نذرِ زنداں کر دیا گیا۔ یہ زندانی کس حال میں ہیں ان پر اور ان کے اعزہ واقربا پر کیا گزری یا کیا گزر رہی ہے نہ کسی کو یہ جاننے کی کبھی کوئی توفیق ہوئی اور نہ ان کے مقدمات کی پیروی کے لیے کوئی باضابطہ قدم اٹھایا گیا۔ یہ تو ہوا کہ دہشت گردی کے خلاف پورے ملک میں مولوی صاحبان کی قیادت میں چھوٹے بڑے بہت سے اجتماعات ہوئے اور دار العلوم دیوبند سے دہشت گردی کے خلاف باضابطہ طور پر ایک فتویٰ بھی جاری کرایا گیا جس کی میڈیا کے ذریعہ بھرپور تشہیر بھی کی گئی لیکن اصل صورت حال جوں کی توں برقرار رہی۔ "سارے دہشت گرد مسلمان ہی ہیں" یہ فارمولا اپنی جگہ پر قائم ودائم رہا۔ چنانچہ ایک طرف دہشت گردی مخالف اجتماعات ہو رہے تھے تو دوسری طرف جے پور بم دھماکے کے حوالے سے مسلمانوں کی دار و گیر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پولیس اور اے ٹی ایس کے لوگ یہ مان کر چلتے رہے کہ چونکہ "سارے دہشت گرد مسلمان ہی ہیں" اس لیے جے پور کے دھماکے میں بھی لازمی طور پر مسلمان ی شریک رہے ہوں گے۔ اس فارمولے کے تناظر میں ظاہر ہے اس کے سوا کچھ اور سوچا بھی ہیں جاسکتا تھا۔

سارے دہشت گرد مسلمان ہیں یہ مفروضہ سراسر بے بنیاد اور ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہی کہا جاسکتا ہے جو مسلمانوں اور اسلام سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہوں جو لوگ تاریخ سے واقف ہیں وہ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ یورپ، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے بعض حصوں میں جو انتہا پسند یا دوسرے لفظوں میں دہشت گرد تنظیمیں کام کرتی رہی ہیں ان کا تعلق نہ تو مسلمانوں سے رہا ہے نہ اسلام سے اور اس حقیقت سے تو شاید ہی کوئی انکار کرسکتا ہو کہ اسرائیل کی غاصب ریاست کے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل دہشت گردی کی ہی رہین منت ہے۔

یہ تو سرحدوں سے دور کی اور کل کی بات ہے۔ آج بھی ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جو

اس فارمولے کی تکذیب کرتی نظر آتی ہیں۔تازہ مثال مہاراشٹر کی ہے جہاں سناتن سنستھا اور ہندو جن جاگرتی سمیتی کے چار لوگوں کو نوی ممبئی اور تھانے کے دو آڈیٹوریموں میں بم نصب کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں ان پر گزشتہ فروری میں نوی ممبئی کے ایک سنیما ہال میں بم رکھنے کا بھی الزام ہے۔اس سے قبل اپریل 2006 میں مہاراشٹر کے ہی ایک شہر ناندیڑ کے ایک مکان میں دو اشخاص بم بناتے وقت ہلاک ہو گئے تھے۔ان دونوں کا تعلق سنگھ پریوار سے تھا یہ لوگ بجرنگ دل کے سرگرم کارکن بتائے گئے تھے۔یہ لوگ بم کس مقصد سے بنا رہے تھے؟ انھیں کب اور کہاں استعمال کیا جانا تھا؟ ان کے ساتھ اور کون لوگ تھے؟ یہ اور دوسرے بہت سے سوالات ایسے تھے جو اپنا جواب چاہتے تھے لیکن ان کے تشفی بخش جواب نہیں ملے۔شاید ہماری خفیہ ایجنسیوں کو ان سوالوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی کیونکہ ان سوالوں کے جواب ''سارے دہشت گرد مسلمان ہی ہیں'' کے مہامنتر کی نفی کر سکتے تھے۔لیکن اس بار شاید ایسا نہیں ہونے جا رہا ہے۔اس کا واضح اشارہ وزیر اعلیٰ مہاراشٹر مسٹر دیش مکھ کے اس بیان میں ملتا ہے کہ ''عام طور پر جب اس طرح کے واقعے ہوتے ہیں تو ایک خاص کمیونٹی پر شبہ کیا جانے لگتا ہے۔لیکن اب ایک ہندو تنظیم سے وابستہ دو افراد کی گرفتاری سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اس طرح کے شکوک وشبہات بے بنیاد ہوا کرتے ہیں۔دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا''۔

وزیر اعلیٰ ولاس راؤ دیش مکھ کے اس بیان سے اس شر انگیز فارمولے کی نفی تو ہوتی ہی ہے اس کی نفی ''سامنا'' میں شیو سینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کے اس اداریہ سے بھی ہوتی ہے جس میں ہندوؤں سے کہا گیا ہے کہ وہ خودکش دستے تیار کریں اور ہندوستان میں جو ''منی پاکستان'' پائے جاتے ہیں انھیں نشانہ بنائیں۔انھوں نے اپنے اس اداریے میں اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہندو تنظیم (ہندو جن جاگرتی سمیتی) نے جو بم بنائے تھے وہ کم طاقت کے تھے اور اس کا نشانہ ہندو ہی بنے۔انھیں زیادہ بہتر ''ہندو'' بم بنانا چاہیے تھا تا کہ

ان کے نام انقلابیوں کی فہرست میں شامل کر لیے جاتے۔ بال ٹھاکرے کا یہ اداریہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ ''نہ تو سارے دہشت گرد مسلمان ہی ہیں اور نہ اس کی ترغیب دینے والے مسلمان اور صرف مسلمان ہیں۔ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں بلکہ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ یہ سارا ہاؤ ہو ان پردہ نشینوں کے دم سے ہی ہے۔

20/جون 2008

○○

بول کہ سچ اب تک زندہ ہے

تحفظات ذہنی کے تیرہ وتار اندھیروں میں سچائی کے چمکتے دمکتے موتی تلاش کرنے والے حوصلہ مند لوگوں کو اکثر و بیشتر اغیار سے کہیں زیادہ اپنوں کے سنگ ملامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بنی بنائی لیک سے ہٹ کر چلنے' بنے بنائے پیمانوں سے الگ ہٹ کر نئے پیمانے تراشنے یا تلاش کرنے کی سزا انھیں بیشتر حالات میں ان کے پاؤں کے نیچے کی سخت زمین کھینچ کر دی جاتی ہے۔ انھیں بے دست و پا بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے تاکہ انھیں دیکھ کر دوسرے عبرت حاصل کریں۔ لیکن سچائی ہے کہ اپنے آپ کو منوا کر ہی رہتی ہے۔ کل بھی یہی ہوتا رہا ہے آج بھی یہی ہو رہا ہے اور کل بھی یہی کچھ ہوگا۔ نہ سچ کو پابہ زنجیر کیا جاسکے گا' نہ سچائی کی راہ میں کوئی ایسی دیوار کھڑی کی جاسکے گی جو ناقابل عبور ہو۔

سچائی اپنے آپ کو کس طرح منواتی ہے اس کی تازہ مثال بھارتیہ جنتا پارٹی کے صف اوّل کے لیڈر سابق مرکزی وزیر جسونت سنگھ کی تصنیف ''جناح ہندوستان۔ تقسیم۔ آزادی'' (Jinnah-India-Partition- Independence) ہے۔ جس میں انھوں نے محمد علی جناح کو سیکولر اور عظیم کردار کا حامل ایک ایسا پختہ عزم انسان قرار دیا ہے جو ملک کی تقسیم تک وفاقی ہندوستان پر اصرار کرتا رہا۔ اگر کانگریس عدم مرکزیت اور وفاق کو تسلیم کر لیتی تو متحدہ ہندوستان تقسیم کے دردناک مرحلے سے نہ گزرتا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اس سچائی کو برداشت نہیں کرسکی۔ جسونت سنگھ کو پارٹی سے نکال دیا گیا۔ بقول ان کے وہ 30 سال تک جس گھر میں رہے' جس کی دیواروں کو مضبوط و مستحکم کرنے میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس سے

انھیں اس طرح نکال باہر کیا گیا کہ انھیں اپنی بات کہنے کا موقع تک نہیں دیا گیا۔

اس سے قبل 2005 میں لال کرشن اڈوانی بھی جناح کو غیر متوقع طور پر سیکولر قرار دے چکے تھے۔ آر ایس ایس کو اس وقت بھی ان کی یہ ادا پسند نہیں آئی تھی چنانچہ انھیں پارٹی کے صدر کے عہدے سے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ لیکن وہ بدستور پارٹی کے لیڈر بھی بنے رہے اور انھیں وزارت عظمیٰ کا امیدوار بھی بنایا گیا۔ لیکن اس بار ناگپور میں آر ایس ایس ہیڈ کوارٹر کے مکینوں کے صبر کا پیمانہ اس حد تک لبریز ہو گیا کہ انھوں نے بی جے پی کو ہدایت دے ڈالی کہ وہ جسونت سنگھ کو بلا تاخیر نکال باہر کرے اور ان کی اس ہدایت پر اس طرح عمل کیا گیا کہ جسونت سنگھ کو نہ تو وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا گیا نہ انھیں اپنی بات کہنے کا موقع دیا گیا' بس پارلیمانی بورڈ کی میٹنگ بلائی گئی اور ناگپور کے فیصلے پر انگوٹھا لگا دیا گیا۔ اور اس کی اطلاع جسونت سنگھ کو فون کے ذریعے دے دی گئی۔

سوال یہ ہے کہ جسونت سنگھ کے معاملے میں یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا گیا اور وہ بھی اتنی عجلت کے ساتھ۔ ان کی کتاب پڑھے بغیر۔ یہ سوال اہم بھی ہے اور اپنے دامن میں امکانات و خدشات کی ایک پوری دنیا بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ لال کرشن اڈوانی نے تو صرف جناح کے سیکولر ہونے کی بات کہی تھی۔ جسونت سنگھ نے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بتانے اور جتانے کی کوشش بھی کی ہے کہ ملک کی تقسیم میں جناح سے کہیں زیادہ قابل ذکر رول پنڈت جواہر لال نہرو' سردار پٹیل اور کسی حد تک گاندھی جی کا بھی رہا ہے۔ جناح کو دھکیل کر اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں پاکستان ان کی ناگزیر ضرورت بن گیا بلکہ یہ کہنا بھی کچھ غلط نہ ہوگا کہ کانگریس کے ان عظیم لیڈروں نے خود اپنے طور پر پاکستان کو جناح کی جھولی میں ڈال دیا۔ یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے اس سے قطع نظر یہ کہنا اس موقع پر یقیناً بے محل نہیں ہوگا کہ جسونت سنگھ نے جو کچھ کہا ہے اسے اگر درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ تقسیم وطن کے لیے مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرانا حقائق کو مسخ کر کے پیش کرنا ہوگا۔ امر واقعہ بھی یہی ہے کہ تقسیم وطن کے لیے نہ تو کلی طور پر جناح ذمہ دار تھے نہ مسلمان۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی آویزش اور زمینی حقیقتوں کو نظر انداز کر کے محض نام نہاد اصولی بنیادوں پر ہوا میں لٹھ چلانے کا نتیجہ

پاکستان کی صورت میں برآمد ہوا۔ دونوں پارٹیوں کی باہمی آویزش میں انانیت پسندی کا بھی ایک رول رہا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جسونت سنگھ کا سب سے بڑا گناہ یہی ہے کہ انھوں نے تقسیم وطن کے داغ دھبوں کو دوسرے کے دامن پر بھی دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے محمد علی جناح کی سیکولر امیج کو ہی اجالنے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ تحریک آزادی کے تناظر میں ان لوگوں کی مساعی' ان کے فیصلوں، ان کے اقدامات اور ان کی سوچ کا جائزہ بھی لیا ہے جو اب تک تنقید سے بالاتر سمجھے جاتے رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے جناح کی سیکولر تصویر پیش کر کے بالواسطہ طور پر مسلمانوں کے دامن سے تقسیم وطن کے جرم بے پناہ کے داغ کو کسی حد تک دھونے کی کوشش بھی کی ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ سنگھ پریوار کی نگاہ میں ان کا سب سے سنگین جرم یہی ہے۔ کیونکہ آر ایس ایس کے نظریہ ساز' اس کے لیڈر' اس کے پرچارک' اس کے سویم سیوک اب تک تقسیم وطن کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ہی ڈالتے رہے ہیں۔ مسلمان گزشتہ 62 برسوں سے اپنے اس ناکردہ گناہ کے بوجھ کا پشتارہ اٹھائے جی رہا ہے۔ اب اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ پاکستان کی تشکیل میں جناح سے کہیں زیادہ اہم رول پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے عمل اور بے عملی کا رہا ہے تو ظاہر ہے اس سے سب سے زیادہ تکلیف آر ایس ایس کو ہی پہنچ سکتی ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں اس کا وہ مفروضہ ناقابل تردید حقائق کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا جس کے سہارے اس نے مسلمانوں کو مطعون کرنے اور ان کے خلاف فضا کو نفرت کے شراروں سے بھرتے رہنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ جسونت سنگھ کا یہ جرم بھی کچھ کم سنگین نہیں ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کو اجنبی' یا یوں کہیے کہ کسی اور سیارے کی مخلوق سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ سچائی کم از کم آر ایس ایس کے لیے ادنیٰ درجے میں بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کی براہ راست یا بالواسطہ حمایت' ان کی اشک شوئی بھی کسی ایسے شخص کی جانب سے جو سنگھ پریوار کی کسی تنظیم میں قیادت کی صف اوّل سے تعلق رکھتا ہو ظاہر ہے اسے برداشت کرتے رہنے کا مطلب اپنے اصولوں پر' اپنے نظریات پر' اپنی سوچ پر خود کلہاڑا چلانے کے مرادف ہی ہو سکتا ہے۔ ناگپور ظاہر ہے یہ غلطی نہیں کر سکتا۔ اس لیے

جسونت سنگھ کو پہلی فرصت میں بہ یک بینی و دو گوش اس مکان (بی جے پی) سے نکال باہر کیا جس میں وہ 30 سال سے مقیم تھے۔

جسونت سنگھ نے اپنی ضخیم کتاب (669 صفحات) میں حالات و واقعات کی روش پر مبنی جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ کچھ بہت زیادہ چونکا دینے والے نہیں ہیں۔ 37-1936 کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات اور خاص کر صوبہ جات متحدہ (U.P) میں حکومت سازی کو لے کر کانگریس اور مسلم لیگ میں جو رسہ کشی ہوئی اور مسلم لیگ کو جس طرح اپوزیشن میں بیٹھنے پر مجبور کیا گیا وہ اپنے آپ میں ایک بڑا واقعہ تھا جس نے ملک کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں کافی اہم رول ادا کیا تھا۔ اسی طرح کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لینے کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے بمبئی کی ایک پریس کانفرنس میں اسے جس طرح سبوتاژ کیا وہ ہماری سیاسی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے اس اعلان کے بعد کہ صوبوں کی حیثیت کیا ہوگی اس کا تعین آئین ساز اسمبلی کرے گی جناح کا یہ موقف اختیار کرنا کہ کانگریس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ایک فطری بات تھی۔ مہاتما گاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی نے کیبنٹ مشن پلان کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب (Eight lives: a study of Hindu - Muslim encuonter) میں لکھا ہے ”... جناح نے کیبنٹ مشن پلان کے تعلق سے کانگریس پر بددیانتی کا جو الزام لگایا ہے وہ ٹھیک ہی تھا اور پتھک لارنس اور کرپس پر کانگریس کے ساتھ ساز باز کا الزام بھی درست تھا“۔

21/اگست 2009

○○

سپریم کورٹ کا ایک اور چشم کشا فیصلہ

سپریم کورٹ کا ایک اور فیصلہ، مسلم خواتین (حقوق بعداز طلاق) قانون 1986 کے تابوت میں ایک اور کیل۔ اس فیصلے کی بازگشت بھی اسی نوع کے دوسرے فیصلوں کی طرح دیر تک اور دور تک سنی جائے گی۔ لیکن ایک بات تقریباً طے ہے کہ بے حسی کی ریت میں شتر مرغ کی طرح گردن دھنسا کر نہ کچھ دیکھنے، نہ کچھ سننے کی روش پر گامزن مسلم پرسنل لاء بورڈ کی قیادت اس کا کوئی نوٹس نہیں لے گی اور وہ اس کا نوٹس لے بھی کیوں؟ اس نے تو مسلم مطلقہ قانون کے حوالے سے جو کچھ حاصل کرنا تھا کرلیا۔ اسے اس سے کیا غرض کہ عدالتیں اس قانون کے ساتھ کیا سلوک کررہی ہیں یا انھوں نے قانون شریعت کے نام پر مطلقہ کے نان و نفقہ کو عدّت کی مدّت تک ہی محدود کرنے کی جو مہم چلائی تھی اس کا کیا نتیجہ برآمد ہورہا ہے، ضابطۂ فوجداری کی دفعہ 125 سے مسلم مطلقہ خواتین کو مستثنیٰ کرانے میں انھوں نے بزعم خود جو کامیابی حاصل کی تھی وہ حقائق کی تیز آنچ پر عملاً کاٹھ کی ہانڈی ثابت ہورہی ہے اور اب زیریں عدالتیں ہی نہیں بلکہ ملک کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ بھی دفعہ 125 کے تحت مسلم خواتین کو گزارہ دلانے کی بات کرتی سنائی دے رہی ہے۔ اس نے پرسنل لاء بورڈ کے اس موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے کہ مسلم مطلقہ خواتین 3 ماہ کی عدّت کی مدت کے بعد قانوناً گزارہ پانے کی حقدار نہیں ہوتی ہیں۔

اس کی تازہ مثال سپریم کورٹ کی 4 دسمبر کی یہ رولنگ ہے جس میں یہ بات بہت ہی دو ٹوک انداز میں کہی گئی ہے کہ مطلقہ مسلم خاتون بھی دوسری شادی نہ کرنے تک اپنے سابق

شوہر سے گزارہ پانے کی حقدار ہوگی۔ یہ رولنگ جسٹس بی سدرشن ریڈی اور جسٹس دیپک ورما پر مشتمل دو رکنی بنچ نے ایک مطلقہ خاتون شبانہ بانو کی اپیل پر دی ہے۔

شبانہ بانو کی شادی عمران کے ساتھ گوالیار میں 2001 میں ہوئی تھی۔ حاملہ ہونے کے بعد وہ اپنے میکے چلی گئی جہاں اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ بچے کی پیدائش کے بعد بھی جب عمران شبانہ کو گھر واپس نہیں لے گیا تو اس نے بحالت مجبوری ضابطۂ فوجداری کی دفعہ 125 کے تحت مقدمہ دائر کر دیا اور مطالبہ کیا کہ عمران جو 12 ہزار روپے ماہانہ کماتا ہے اسے باقاعدگی کے ساتھ 3000 روپے دیتا رہے کیونکہ اس کا اپنا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ عمران نے اپنے بیان حلفی میں کہا کہ اس نے شبانہ کو 2004 میں مسلم قانون کے تحت طلاق دے دی ہے۔ اس لیے اسے 1986 کے مسلم مطلقہ قانون سے ہی رجوع کرنا چاہیے اور اس قانون میں عدّت کی مدّت کے بعد گزارہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فیملی کورٹ نے شبانہ بانو کی درخواست جزوی طور پر منظور کر لی اور عمران کو ہدایت دی کہ وہ 2004 سے 2000 روپے ماہانہ کے حساب سے ادائیگی شروع کردے۔ عمران نے اس کے خلاف مدھیہ پردیش ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ عدالت نے اس کی اپیل منظور کر لی اور فیملی کورٹ کے فیصلے کو رد کر دیا۔

پھر شبانہ بانو نے مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ سے رجوع کیا۔ سپریم کورٹ نے بہت ہی صراحت کے ساتھ بہت ہی واضح الفاظ میں کہا ہے کہ مسلم مطلقہ خاتون طلاق کی صورت میں اپنے سابق شوہر سے گزارہ پانے کی حقدار ہوگی اور یہ گزارہ صرف عدّت کی مدّت یعنی تین ماہ تک کے لیے ہی نہیں ہوگا، بلکہ یہ اسے اس وقت تک ملتا رہے گا جب تک کہ وہ دوسری شادی نہیں کر لیتی۔ اس فیصلے میں دانیال لطیفی اور اقبال بانو کیس کے حوالہ سے اس نکتے کو ابھارا گیا ہے کہ گزارہ یا نفقہ صرف تین ماہ کے لیے ہی نہیں ہوسکتا۔ مطلقہ خاتون کے لیے عدّت کی مدّت کے نفقہ کے علاوہ متاع معروف یعنی معقول گزارہ کا انتظام بھی کیا جانا چاہئے تاکہ وہ دوسری شادی نہ کرنے تک قطعاً بے سہارا نہ رہ جائے۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ نے شاہ بانو کے فیصلے کے بعد جو پرزور اور پرشور مہم چلائی تھی اس کا بنیادی نکتہ یہی تھا کہ طلاق کی صورت میں مطلقہ عورت عدّت کی مدّت کے بعد نفقہ کی حقدار

نہیں رہ جاتی ہے۔ طلاق کے بعد اس کی حیثیت ایک اجنبی عورت کی اور سابق شوہر کی حیثیت ایک اجنبی مرد کی ہوتی ہے کسی اجنبی مرد کو کسی اجنبی عورت کے گزر بسر کا انتظام کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا البتہ اگر سابق شوہر چاہے تو وہ عدّت کی مدّت کے نفقہ کے علاوہ مطلقہ کو کچھ اور دے دلا کر رخصت کرسکتا ہے۔ وہ کیا کچھ دیتا ہے اس کا انحصار اس کی اپنی مرضی پر ہوگا۔ مسلم مطلقہ قانون کی صورت گری بظاہر اس مرکزی نکتے کو سامنے رکھ کر کی گئی تھی، لیکن پرسنل لاء بورڈ نے جو کچھ حاصل کیا وہ اس کے بالکل الٹ تھا۔ اس وقت کے انتہائی عیار مرکزی وزیر قانون اشوک سین نے جو ڈرافٹ تیار کروایا وہ ناقص ڈرافٹنگ کا شاہکار تھا۔ اس ڈرافٹ میں کمال عیاری کے ساتھ وہ سب کچھ سمو دیا گیا تھا، جو قانون کا چولا پہن لینے کے بعد مجاز عدالتوں میں ایک آنچ بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے کیا کیا جائے کہ پاپوش کلچر کے پروردہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے ارباب بست وکشاد نے مسودہ قانون پر گفت و شنید کے لیے جو ٹیم ترتیب دی تھی اس کے بیشتر افراد نہ تو عصری قانون کی نزاکتوں سے واقف تھے اور نہ ہی قانون شریعت کے رمز شناس تھے۔ اس پوری ٹیم میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو مسودے کے نقائص کی نشاندہی بھی کرسکتا تھا اور وزیر اعظم کے سامنے اپنی بات پوری قوت کے ساتھ رکھ بھی سکتا تھا۔ یہ تھے سید شہاب الدین۔ لیکن اشوک سین نے ان سے بھی چھٹکارا حاصل کرلیا۔ انھوں نے بورڈ کے ذمہ داروں کو سمجھایا کہ وزیر اعظم سید صاحب کو پسند نہیں کرتے۔ وفد میں ان کی شمولیت اور ان کا انداز گفتگو ماحول کو بوجھل بنا سکتا ہے اور یہ صورت حال مذاکرات کے نتائج کو متاثر کرسکتی ہے۔ چنانچہ سید صاحب کو ٹیم میں شامل نہیں کیا گیا اور اس طرح اشوک سین کو من مانی کرنے کی چھوٹ مل گئی۔ اس طرح اشوک سین کی کمال عیاری اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں کی کمال نادانی کے نتیجے میں مسلم مطلقہ قانون یعنی مسلم خواتین (حقوق بعد از طلاق) قانون 1986 وجود میں آگیا جو اپنے دامن میں اپنی ناکامی، اپنی بے وقعتی اور کثرت تعبیر کے تمام تر امکانات کو سمیٹے ہوئے تھا۔

مسلم مطلقہ قانون کے تحت پہلا فیصلہ لکھنؤ کی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ریکھا دکشت نے سنایا تھا۔ انھوں نے درخواست گذار مطلقہ خاتون کے سابق شوہر کو 80 ہزار روپے ادا کرنے کی

ہدایت دی تھی۔ 60 ہزار بطور یک مشت ادا کیے جانے والے گذارہ کے روپ میں اور بیس ہزار مہر اور عدّت کے نفقہ کے طور پر۔ اس کے بعد تو مقامی عدالتوں اور ہائی کورٹوں میں ،مقدمات کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ممبئی ہائی کورٹ ،کلکتہ ہائی کورٹ کے علاوہ کیرلا ہائی کورٹ نے علی بنام سوفیرا اور گجرات ہائی کورٹ نے اے اے عبداللہ بنام اے پی میمونہ سیدہ بائی کے معاملے میں فیصلہ سنایا کہ متاع معروف کا مطلب مطلقہ کے لیے عدّت کے بعد کی زندگی کی آسائش کا انتظام کرنا ہے۔ اس دوران کچھ فیصلے ایسے بھی آئے جن میں یہ مانا گیا تھا کہ مطلقہ عورت صرف عدّت کی مدّت کے نفقہ کی ہی حقدار ہوگی۔ لیکن 2001 میں دانیال لطیفی بنام انڈین یونین کا فیصلہ آنے کے بعد متاع معروف اور نفقہ کا مسئلہ تقریباً حتمی طور پر حل ہو گیا۔ ممتاز قانون داں دانیال لطیفی نے مسلم مطلقہ قانون کے منظور ہوتے ہی سپریم کورٹ میں اس کے آئینی جواز کو چیلنج کر دیا تھا۔ عدالت عظمیٰ کی 5 رکنی بنچ نے اس کے غیر آئینی ہونے کی بات تو نہیں مانی لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کی وضاحت بھی کر دی کہ اس قانون سے مطلقہ شاہ بانو کا فیصلہ منسوخ نہیں ہوا ہے اور اس کا اطلاق ہر معاملے میں اس کی روح کے مطابق ہی کیا جائے گا۔ عدالت نے متاع اور نفقہ دونوں پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ان دونوں کی ادائیگی عدّت کی مدّت کے دوران ہی کی جانی ہے، البتہ اگر سابق شوہر یک مشت ادائیگی کی پوزیشن میں نہ ہو تو عدالت قسطیں بھی مقرر کر سکتی ہے۔ سپریم کورٹ نے اپنے اس فیصلے میں حتمی طور پر مان لیا ہے کہ مطلقہ عورت نفقہ اور متاع معروف (Fair Provision) دونوں ہی کی حقدار ہوگی جبکہ مسلم مطلقہ قانون صرف عدّت کی مدّت کے نفقہ کی ہی بات کرتا ہے۔ ظاہر ہے سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے بعد مسلم مطلقہ قانون اپنے آپ بے اثر ہو کر رہ جائے گا اور ایسا ہی ہو بھی رہا ہے۔

10 دسمبر 2010

OO

جسٹس شریواستو کا ناقابل فہم فیصلہ

جج صاحبان خاص کر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے ججوں کو عام طور پر اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ ذی علم، ذہین وفطین، جزرس، وسیع النظر، وسیع المشرب اور آئین وقانون کی باریکیوں نیز قانون اور سماج کے ربط باہم پر زیادہ گہری نظر رکھنے والا سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ مان کر چلا جاتا ہے کہ یہ عام طور پر صاحب کردار بھی ہوتے ہیں اور قانون کی تشریح وتعبیر، اس کی تطبیق و اطلاق کے معاملے میں غیر معمولی حد تک غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ ذاتی منفعت، مذہبی وابستگی اور ذات پات کی بنیاد پر یہ نہ تو کبھی کوئی فیصلہ کرتے ہیں نہ ان کے پائے ثبات میں ان کی بنا پر عام طور پر لغزش آیا کرتی ہے۔ مقام شکر ہے کہ عدلیہ کی اونچی سطح سے تعلق رکھنے والے ہمارے بیشتر جج صاحبان اس معیار پر پورے اترتے رہے ہیں البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص حالات میں غالباً ذہنی تحفظات کے تحت کوئی جج ایسے فیصلے سنا دیتا ہے جو نہ اس کے شایان شان ہوتے ہیں نہ عدلیہ کے وقار واحترام کو یقینی بنانے میں ان سے کوئی مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر 1995 میں سپریم کورٹ کی ایک تین رکنی بنچ نے مہاراشٹر ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کے خلاف اپیل پر اپنے فیصلے میں کہا تھا کہ ہندوتو تو ہندوستانیت کا ہی دوسرا نام ہے۔ اس فیصلے پر ماہرین آئین وقانون، سیاست دانوں، دانشوروں اور تعلیمی اداروں سے وابستہ ممتاز افراد نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اس کی تائید وحمایت کرنے والوں میں صرف سنگھ پریوار، خاص کر بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے لوگ ہی شامل تھے کیونکہ فاضل جج صاحبان نے ہندوتو کو ہندوستانیت کا ہم معنٰی قرار دے

کر فی الواقع ڈاکٹر ہیڈ گیوار اور گرو گولوالکر کے ہندو راشٹر کے بنیادی نظریے کو ہی شعوری یا غیر شعوری طور پر موثق کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس فیصلے کی بازگشت اڈوانی اشوک سنگھل جیسے لیڈروں کی تقریروں میں اب بھی سنائی دیتی ہے۔

ہماری عدلیہ کی اس مسلمہ روایت اور معیار مطلوب سے انحراف کی مثالیں کبھی کبھی ہائی کورٹوں کے فیصلوں میں بھی ملتی ہیں۔ اس کی تازہ مثال الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس ایس این شریواستو کے دو فیصلے ہیں جو انتہائی حیرت انگیز بھی ہیں اور اپنے مضمرات کے اعتبار سے انتہائی خطرناک بھی۔ جسٹس شریواستو کے پہلے فیصلے کا تعلق اتر پردیش میں مسلمانوں کے اقلیتی درجہ سے ہے اور دوسرے کا بھگوت گیتا کو قومی دھرم شاستر قرار دینے سے ہے۔ چند ماہ قبل اپنے پہلے فیصلے میں فاضل جج جسٹس بی این شریواستو نے کہا تھا کہ مسلمان اتر پردیش میں اب اقلیت میں نہیں رہ گئے ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد 18 فیصد سے متجاوز ہو چکی ہے۔ اس فیصلے کو مان لینے کا واضح مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو ان تمام آئینی مراعات سے محروم کر دیا جائے جو انھیں بحیثیت اقلیت حاصل ہیں۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دوسرے انصاف پسند لوگوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ کسے اقلیت کا درجہ کس بنیاد پر ملے گا اس کے تعلق سے یہ بات تقریباً طے ہے کہ جو گروہ عددی اعتبار سے اکثریت سے کم ہوگا خواہ وہ 49 فی صد ہی کیوں نہ ہو 51 فیصد کے مقابلے میں اقلیت ہی قرار پائے گا' اور یہ فیصلہ بھی عام طور پر ملک گیر سطح پر کیا جائے گا۔ جسٹس شریواستو نے اس معاملے میں اپنا ایک الگ معیار گھڑا اور من مانے طور پر مسلم اقلیت پر اس کو منطبق کر دیا۔ یہ سراسر زیادتی تھی۔ یہ عدلیہ کی مسلمہ روایات سے صریح انحراف تھا۔ یہ فیصلہ جسٹس شریواستو کے مبینہ ذہنی تحفظات کا آئینہ دار تھا۔ یہ فیصلہ سماجی انتشار میں اضافہ کا سبب بن سکتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ گرم ہواؤں کے جھکڑ چلنے شروع ہو جاتے الٰہ آباد ہائی کورٹ کی ہی ایک دو رکنی بینچ کے فیصلے کے ذریعہ اسے عملاً کالعدم قرار دے کر اس کے ممکنہ اثرات کو زائل کر دیا گیا۔

اب انہی محترم جج، جسٹس ایس این شریواستو نے ایک اور فیصلہ دے کر یہ بتا اور جتا دیا ہے کہ ان کی زنبیل میں ابھی بہت کچھ ایسا ہے جو بہتوں کی نیند اڑا سکتا ہے۔ فاضل جج نے

وارانسی کے ایس ایم مکھرجی کی ایک رٹ پٹیشن پر رولنگ دیتے ہوئے کہا ہے کہ گیتا ہندوستان کا دھرم شاستر ہے اور ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ اسے راشٹریہ دھرم شاستر کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ اگر ہندوستان کا ایک تسلیم شدہ قومی پرچم اور قومی ترانہ ہے تو بھگوت گیتا کو بھی قومی دھرم شاستر کے روپ میں تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی ہے۔ فاضل جج نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ فرمان بھی صادر کر دیا ہے کہ ''ہندوستان کے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ آئین کی دفعہ 51-A کے تحت بلا امتیاز ذات پات، عقیدہ یا مذہب بھگوت گیتا میں بتائے گئے دھرم پر عمل کرے''۔

فاضل جج نے آئین کی جس دفعہ 51-A کا حوالہ دیا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جسے اپنے عجیب وغریب فرمان کی بنیاد بنایا ہے اس کا تعلق بنیادی فرائض کے باب سے ہے۔ اس دفعہ کی ذیلی 10 شقوں، A سے لے کر J تک وہ 10 فرائض گنائے گئے ہیں جن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر شہری ان پر عمل کرے گا۔ اس کی پہلی شق کے مطابق ہر شہری آئین، اس کے آدرشوں، بنیادی اداروں، قومی پرچم اور قومی ترانہ کے احترام کا پابند ہوگا۔ اس میں قومی دھرم شاستر کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ فاضل جج چاہتے ہیں کہ بھگوت گیتا کو بھی اس میں شامل کر دیا جائے اور غالباً اسی لیے انھوں نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ اگر ریاست کا کوئی قومی پرچم اور قومی ترانہ ہوسکتا ہے تو قومی دھرم شاستر بھی ہونا چاہیے۔

فاضل جج نے جو دوسری سب سے اہم دلیل دی ہے اس کا تعلق بھی دفعہ 51-A کی دوسری شق سے ہی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ ان آدرشوں کو حرز جاں بنالے جو آزادی کے لیے ہماری قومی جدوجہد کے لیے ولولہ انگیز ثابت ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں فاضل جج کا کہنا ہے کہ قومی جنگ آزادی کو بھگوت گیتا سے کافی ترغیب ملی تھی اور اس بنیاد پر اسے قومی دھرم شاستر قرار دینا بالکل جائز ہوگا۔ موصوف کی اس دلیل میں کتنا وزن ہے اس کے تعلق سے صرف اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ آج تک کسی کی بھی نگاہ اس نکتے تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ظاہر ہے اس کے لیے غیر معمولی طور پر ذہین وفطین اور جزرس ہونے کے علاوہ غیر معمولی اختراعی ذہن کا مالک ہونا ضروری ہے اور یہ وہ کمال ہے جو محسوس ہوتا ہے محترم جسٹس

شریواستو کو ہی حاصل ہے۔

فاضل جج الٰہ آباد ہائی کورٹ کی ایک اونچی کرسی پر براجمان ہیں۔ وہ اس بات سے یقیناً ناواقف نہیں ہوں گے کہ سیکولرزم ہماری جمہوریت کا لازمی جز ہے۔ اس کے بغیر ہماری جمہوریت کی ادارہ جاتی بنیادیں منہدم ہو جائیں گی۔

ہمارا آئین ملک کے تمام شہریوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اپنی زبان، اپنی تہذیب وثقافت اور اپنے تعلیمی اداروں کے تحفظ کا حق دیتا ہے اور یہ وہ حق ہے جو کسی بھی حال میں چھینا نہیں جاسکتا۔ فاضل جج جسٹس شریواستو کو کم ازکم یہ تو دیکھنا ہی چاہیے تھا کہ اس ملک کے تمام شہریوں کو کسی ایک مذہبی کتاب پر عمل کرنے کی وکالت کرنا ہمارے آئین کی روح کے منافی ہے۔ جسٹس شریواستوا نے یہ رولنگ دے کر فی الواقع ہمارے آئین کی توہین کی ہے۔ ان کے اس غیر آئینی عمل کا سپریم کورٹ کو ضرور نوٹس لینا چاہیے۔ ہمارے مرکزی وزیر قانون مسٹر بھاردواج نے یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری پوری کر لی ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ کیا یہ واقعہ نظر انداز کر دینے کے ہی لائق ہے؟ کل جسٹس شریواستو اسی طرح کا کوئی اور الٹا سیدھا فیصلہ صادر نہیں فرمائیں گے اس کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے اور کیا مسٹر بھاردواج پھر یہی مشورہ دے کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے؟

14/ستمبر 2007

○○

دہلی ہائی کورٹ کا ایک چشم کشا فیصلہ

دہلی ہائی کورٹ کے فاضل جج جسٹس بدر دریز احمد نے گزشتہ ہفتہ اپنے ایک انتہائی اہم فیصلے میں ایک نشست میں تین طلاق کو عملاً غیر موثر قرار دیتے ہوئے عدالتوں سے کہا ہے کہ اب سے تین طلاق کو صرف ایک طلاق تصور کیا جائے جسے زن وشو کے مابین افہام وتفہیم کی بنیاد پر واپس لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک نشست میں دی جانے والی تین طلاق کی حیثیت ایک رجعی طلاق کی ہوگی اور ان تینوں طلاقوں کی بنیاد پر نکاح ختم نہیں ہوگا یعنی طلاق وارد نہیں ہوگی۔ جسٹس احمد نے ایک نشست کی تین طلاقوں کو اس بنیاد پر ایک رجعی طلاق قرار دیا ہے کہ ان کے نزدیک طلاق کے وارد ہونے سے قبل زوجین کے مابین افہام وتفہیم کی کوشش بھی ہونی چاہیے اور طرفین کے ایک ایک ثالث کو معاملات کو سلجھانے کا موقع بھی دیا جانا چاہیے۔ اس کے بغیر طلاق کا عمل نہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے نہ مکمل۔

جسٹس بدر دریز احمد کے اس تاریخی فیصلے سے قبل بھی سپریم کورٹ اور متعدد ہائی کورٹ طلاق یا مطلقہ مسلم خواتین کے حقوق کے تحفظ سے متعلق قانون کے اطلاق سے متعلق اپنے فیصلوں میں ثالثی کو طلاق کے موثر ہونے کی بنیادی شرط قرار دے چکے ہیں۔ مثال کے طور پر جون 2007 میں جسٹس اری جیت پسایت اور جسٹس ڈی کے جین نے اقبال بانو بنام اسٹیٹ آف اتر پردیش میں کہا تھا کہ 1986 کے مسلم مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ سے متعلق قانون کا اطلاق اس مسلم مطلقہ پر ہی ہوگا جسے اس کے شوہر نے قرآنی احکامات کے تحت طلاق دی ہو۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ طلاق تین بار دی گئی ہو یعنی ایک ایک ماہ

کے فصل سے تین طہر میں تین طلاقیں جن میں دو طلاقیں واپس لی جاسکتی ہوں جبکہ تیسری قابل رجوع نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں ان تین مہینوں کے دوران طرفین کے نامزد کردہ ایک ایک فرد کے ذریعہ سمجھانے بجھانے اور ثالثی کا فریضہ بھی انجام دیا گیا ہو۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے میں دوسری چیزوں کے علاوہ یہ بات بہت ہی واضح طور پر سامنے آگئی تھی کہ عدالت عظمیٰ ایک نشست میں تین طلاق کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس سے قبل ممبئی ہائی کورٹ کی اورنگ آباد بنچ نے بھی اپنے ایک فیصلے میں طلاق کی قانونی حیثیت کے تعلق سے کہا تھا کہ اس کا نہ صرف یہ کہ کوئی معقول سبب ہونا چاہیے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ شوہر اور بیوی کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ثالث باضابطہ طور پر افہام وتفہیم کی کوشش بھی کریں۔ اس طرح کی کسی کوشش کے ناکام ہوجانے کی صورت میں ہی طلاق کو موثر قرار دیا جائے گا یعنی اپنے تمام تر مضمرات کے ساتھ واقع ہوجائے گی۔ ان فیصلوں کے تعلق سے یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان میں مسلم پرسنل لاء کے جواز کو کسی بھی رخ سے موضوع بحث نہیں بنایا گیا ہے۔ جسٹس بدر دریز نے تو بہت ہی واضح الفاظ میں کہا ہے کہ طلاق کے معاملے میں مسلم پرسنل لاء کو دوسرے تمام رواجوں اور روایتوں پر فوقیت حاصل ہوگی۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ نے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے مذکورہ بالا فیصلوں کو باضابطہ طور پر چیلنج کرنا ضروری نہیں سمجھا اور گمان غالب یہی ہے کہ وہ جسٹس بدر دریز کے فیصلے کو بھی چیلنج نہیں کرے گا۔ اس کے ذمہ داروں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ملکی عدالتوں نے اس معاملے میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ عملاً قرآن وحدیث کی تعلیمات پر مبنی ہے اور جسٹس بدر دریز نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ایک نشست میں تین طلاق کو اگر ممنوع قرار دے دیا جائے تو یہ بات اسلام کے بنیادی اصولوں یا قرآن یا پیغمبر اسلام ﷺ کے فرمودات کے مغائر نہیں ہوگی۔

قرآن کریم نے طلاق کے معاملے میں جو کہ انتہائی حساس مسئلہ ہے انتہائی محتاط اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ رویہ اختیار کیا ہے۔ اسے ہر اعتبار سے انتہائی ترقی پسندانہ رویہ

کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم میں سورۂ نساء کی آیت 4:35 میں بہت ہی واضح طور پر ثالثی کی بات کہی گئی ہے۔ اگر یہ کہا جائے جیسا کہ کئی عدالتی فیصلوں میں کہا گیا ہے کہ ثالثی کو طلاق کے معاملے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اس کے بغیر طلاق کا عمل مکمل نہیں ہوسکتا تو غلط نہیں۔ ثالثی کا یہی عمل اس بات کو بھی لازمی قرار دیتا ہے کہ ایک نشست کے بجائے طلاق ایک ایک ماہ کے فصل کے ساتھ دی جائے تاکہ زوجین کو بھی حالات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کا موقع ملے اور ان کے مقرر کردہ ثالثوں کو بھی سمجھانے بجھانے اور حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرنے کے لیے خاطر خواہ وقت مل جائے۔ ظاہر ہے ثالثی کا عمل پہلی رجعی طلاق کے بعد ہی شروع ہوسکتا ہے جو تیسری یعنی آخری طلاق تک جاری رہے گا۔ اب اگر ان تین مہینوں میں فریقین اپنا ارادہ بدل لیتے ہیں تو طلاق کا عمل اپنے آپ ختم ہوجائے گا لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا اور شوہر تیسری طلاق پر مصر رہتا ہے تو طلاق اپنے تمام تر تقاضوں کے ساتھ وارد ہوجائے گی۔

قرآن نے عدل، احسان، صلہ رحمی اور حکمت پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ ایک نشست میں تین طلاق سے ان چاروں بنیادی صفات کی کسی نہ کسی حد تک نفی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات مبارک اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں ایک نشست میں تین طلاق کے موثر ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مسند احمد بن حنبل کے مطابق رکانہ نے اپنی اہلیہ کو ایک ساتھ تین طلاق دینے کے بعد جب آنحضرت سے اس معاملے میں رجوع کیا اور یہ بتایا کہ انھوں نے بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی حیثیت محض ایک طلاق کی ہے اور اگر وہ (رکانہ) چاہیں تو اپنی اہلیہ کو واپس لے سکتے ہیں۔ طلاق واقع نہیں ہوئی ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں بھی دو سال تک بیک وقت تین طلاق کی بنیاد پر طلاق کے واقع ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ البتہ انھوں نے تیسرے سال کے دوران ایک نشست میں تین طلاق کو ایک رجعی طلاق کے بجائے باقاعدہ واقع ہونے والی طلاق تسلیم کرلی یعنی ایک نشست میں تین طلاقیں دینے کا مطلب یہ تھا کہ زن و شو کا رشتہ ختم ہوجائے۔ حضرت عمرؓ

نے یہ فیصلہ بعض ہنگامی حالات کی بناء پر عورتوں کو مشکلات و مصائب سے بچانے کے لیے کیا تھا اور بحیثیت خلیفہ راشد انھیں اس کا حق بہر حال حاصل تھا۔ ان کا یہ فیصلہ ایک ناگزیر ضرورت کی بنا پر سامنے آیا تھا۔ اس ضرورت کی پوری تفصیل حسنین ہیکل نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف عمر فاروقؓ میں بیان کی ہے۔ اگر کوئی فیصلہ کسی ہنگامی، وقتی ضرورت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے تو اس میں یہ بات بھی مضمر ہوتی ہے کہ اس ضرورت کے ختم ہو جانے کے بعد یہ فیصلہ اپنے آپ غیر موثر ہو کر رہ جائے گا۔ یہ بات تین طلاق سے متعلق حضرت عمرؓ کے فیصلے کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے علاوہ ازیں موجودہ حالات میں ایک نشست میں تین طلاق کو اس لیے بھی غیر ضروری قرار دیا جا سکتا ہے کہ جس ضرورت کے تحت اس کا چلن عمل میں آیا تھا وہی ضرورت اب اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے بستہ بند کر دیا جائے کیونکہ اب یہ عورتوں کے مصائب و مسائل کو کم کرنے کے بجائے انھیں مزید بڑھانے کا سبب بن رہا ہے۔ حضرت عمرؓ کی فراہم کردہ یہ ڈھال اب خواتین کے لیے وبال جان بنتی جا رہی ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کو ملکی عدالتوں کے فیصلوں کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی بہر حال مدّ نظر رکھنا چاہیے کہ سورۂ بقرہ 230 '2:229 اور سورۂ نساء 4:35 میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ عمل کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کا اسوۂ حسنہ بھی ہر مومن کو دعوت عمل دیتا ہے۔ انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ احناف کی اکثریت والا یہ بورڈ اگر اب بھی اس اہم مسئلہ پر خاطر خواہ توجہ نہیں دیتا تو اس کے نتائج کچھ اچھے نہیں ہوں گے۔ ایک نشست میں تین طلاق کو اگر عدالتوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو اس کے نتیجے کتنے سنگین ہوں گے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ارباب بست و کشاد عقل کے ناخن لیں، صحیح اسلامی اسپرٹ کا مظاہرہ کریں اور ہٹ دھرمی کی راہ ترک کر دیں۔ دہکتے سرخ انگاروں جیسی حقیقتوں کو مسلسل جھٹلاتے رہنا' دانائی کی علامت نہیں ہو سکتی۔

گزشتہ جمعہ کو انھی کالموں میں میں نے ''دہلی ہائی کورٹ کا ایک چشم کشا فیصلہ'' کے عنوان سے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ سپریم کورٹ اور ملک کے متعدد ہائی کورٹوں نے ثالثی اور صلح و صفائی کی کوشش کے بغیر دی جانے والی طلاق کو قانون کی نگاہ میں طلاق تسلیم کرنے سے انکار

کر دیا ہے۔ میں نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی تھی کہ عدلیہ نے جو موقف اختیار کیا ہے بقول اس کے اس کی بنیاد قرآن کریم کی آیت 230 ‘2:229 اور 4:35 پر ہے اور یہ بھی کہ اگر عدالتیں قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ کے حوالے سے کوئی بات کہتی ہیں تو مداخلت فی الدین کا الزام لگا کر انھیں مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ میرے لیے یہ بات بہر حال اطمینان بخش ہے کہ دینی صحافتی اور قانونی دائروں سے تعلق رکھنے والے متعدد اہم لوگوں نے میرے اس کالم کا نوٹس لیا۔ کچھ نے میری تائید کی اور کچھ نے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس طرح کی تحریروں سے وسیع تر ملّی مفادات کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی کالم سے متعلق راشٹریہ سہارا کے 7 نومبر کے شمارے میں ’’چشم نم نے پڑھا چشم کشا فیصلہ‘‘ کے عنوان سے ایک مراسلہ بھی شائع ہوا ہے۔

فاضل مراسلہ نگار مفتی محمد ارشد فاروقی نے اپنے اس مراسلہ میں دوسری چیزوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ ’’اس وقت سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہندوستانی عدلیہ وقفہ وقفہ سے ایسے فیصلے کر رہی ہے جو تقریباً شرعی عائلی قوانین کی روح کے منافی ہیں۔ ضرورت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ملّت اسلامیہ ہند مدبّرانہ‘ جرأت مندانہ اقدام کرے تاکہ یہ سلسلہ بند ہو‘‘۔ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کچھ دوسرے لوگوں نے بھی کیا ہے اور ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اس کے کسی حد تک باوزن ہونے سے تو پوری طرح انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے کلی طور پر درست بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس صورت حال کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ عدلیہ وقفہ وقفہ کے ساتھ جو فیصلے کرتی رہی ہے وہ شرعی عائلی قوانین کے منافی ہیں جو کلّی طور پر درست نہیں ہے۔ دوسرے پہلو کا تعلق ملّت اسلامیہ کے مدبّرانہ اور جرأت مندانہ اقدام سے ہے جس کی ابھی تک کوئی واضح اور حوصلہ افزا علامت نظر نہیں آئی ہے۔

بہت پہلے شاہ بانو کیس میں جسٹس چندر چوڑ کی سربراہی میں سپریم کورٹ کی خصوصی بینچ نے جو فیصلہ دیا تھا وہ بلاشبہ اپنے بعض مضمرات کے سبب قانون شریعت میں مداخلت کے مترادف تھا اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کی قیادت میں مسلمانوں نے اس کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور حکومت وقت کو مجبور کیا کہ وہ مسلم مطلقہ خواتین کے حقوق سے متعلق ایک قانون منظور

کر کے اس فیصلے کو کسی حد تک غیر مؤثر کر دے یہ ایک جرأت مندانہ قدم تو تھا لیکن اسے کسی بھی زاویے سے مدبّرانہ قدم نہیں کہا جا سکتا کیونکہ سپریم کورٹ کا فیصلہ اپنے تمام تر مضمرات کے ساتھ برقرار رہا، اسے کالعدم قرار دینے کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

علاوہ ازیں اس کی شرعی حیثیت بھی اس قانون میں اس دفعہ کی شمولیت سے مجروح ہو کر رہ گئی کہ خلع چاہنے والی خواتین کو بھی وہی سہولتیں اور حقوق حاصل ہوں گے جو ان عورتوں کو حاصل ہوں گے جنھیں ان کے شوہروں نے طلاق دی ہو۔ طلاق اور خلع دو الگ الگ چیزیں ہیں، لیکن مسلم پرسنل لاء بورڈ کے زعماء نے اس قانون کو شرعی قانون کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیا جو اس واضح فرق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔

مسلم مطلقہ خواتین کے حقوق سے متعلق قانون کی منظوری کے بعد متعدد ہائی کورٹوں نے اور سپریم کورٹ نے بھی اپنے فیصلوں میں اس قانون کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں اور عملاً ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ اس قانون کی نہ تو کوئی کل سیدھی ہے نہ اس میں کوئی بات ایسی کہی گئی ہے جو قانون کی کسوٹی پر کھری اترتی ہو۔ مطلقہ خواتین کو نان ونفقہ دلانے کا معاملہ ہو یا "کچھ دے دلا کر" رخصت کر دینے کا معاملہ ہو 1986 کا مسلم خواتین مطلقہ قانون کسی بھی معاملے میں کوئی واضح اور قابل عمل حل پیش نہیں کرتا اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت اس قانون کو خود اسی قانون کا تکملہ قرار دے رہی ہے جس کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا تھا۔

مسلم مطلقہ قانون 1986 کے بعد سے مختلف ہائی کورٹوں نے "شرعی عائلی" کیسز میں جو فیصلے دیے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق 1986 کے قانون کی تشریح وتعبیر سے رہا ہے، اسے مسلم پرسنل لاء میں مداخلت قرار دینا کلّی طور پر قرین انصاف نہیں ہو سکتا اور اگر واقعتاً ایسا نہیں ہے اور یہ فیصلے شرعی قوانین میں مداخلت کے مرادف ہیں تو سوال یہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ان کے خلاف اب تک کوئی باضابطہ قانونی اور عوامی مہم کیوں نہیں شروع کی حالانکہ ہائی کورٹوں کے فیصلوں پر نظر ثانی کی درخواست بھی دی جا سکتی تھی اور سپریم کورٹ سے بھی رجوع کیا جا سکتا تھا۔ جسٹس پسائت اور جسٹس جین کے فیصلے کا تو ہر حال میں نوٹس لیا جانا

چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور گمان غالب یہی ہے کہ جسٹس بدر دریز کے فیصلے کو بھی چیلنج نہیں کیا جائے گا کیونکہ بورڈ اپنے اندر یہ کہنے کی جرأت بہر حال پیدا نہیں کر سکتا کہ قرآن کی 4:35 میں جو کچھ کہا گیا ہے ضروری نہیں کہ اس پر عمل کیا جائے اور بورڈ کے ارباب بست وکشاد یہ دعویٰ بھی بہر حال نہیں کر سکتے کہ قرآن میں ثالثی اور صلح صفائی سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کی حیثیت محض ہدایت کی ہے' یہ طلاق کی شرط نہیں ہے۔ قرآن کے بارے میں عام مسلمان یہ مان کر چلتا ہے اور یہی صدفی صد سچ بھی ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے اور اس میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ عمل کرنے کے لیے ہی ہیں۔ طلاق کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہدایت ہے۔ ہدایت ربانی۔ اس ہدایت کو نظر انداز کر کے جو بھی شرائط وضع کی جائیں گی وہ ظاہر ہے درست نہیں ہو سکتیں۔ اور سوال یہ بھی ہے کہ کیا ایسی شرائط وضع کی جا سکتی ہیں جو قرآن کی کسی واضح ہدایت سے متصادم ہوں۔

دوسرے پہلو کا تعلق جرأت مندانہ اور مدبرانہ اقدام سے ہے جو کسی بھی انسانی گروہ کی بقاء اور اس کی آبرومندانہ زندگی کے لیے ضروری ہے۔ ہمیں یہ بات انتہائی دکھ کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ ان لوگوں نے جو اپنے آپ کو ملت کے واحد نمائندہ کے روپ میں پیش کر رہے ہیں، ہمیشہ' ہر نازک موڑ پر عدم تدبر اور جرأت وبسالت سے تہی دامن ہونے کا ہی مظاہرہ کیا ہے اور ان کی اسی روش کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مسائل کے انبار میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

2/نومبر 2007

○○

ممبئی ہائی کورٹ کا تاریخ ساز فیصلہ

ہمارے آئین نے جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی ہے ان میں اظہار خیال کی آزادی کے حق کو بلاخوف تردید غیر معمولی اہمیت کا حامل اور فرد وریاست کے باہمی تعلقات کی میزان قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کی بھی اپنی کچھ حدیں ہیں۔ کچھ بندشیں ہیں جنھیں کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آئین کی دفعہ 19 (1) جس کے تحت آزادی تحریر وتقریر کی ضمانت دی گئی ہے اسی کی شق (2) میں ریاست کی سلامتی، امن عامہ، اخلاقیات، توہین عدالت اور اشتعال انگیزی جیسے 8 عنوانات کے تحت اس کے گرد ایک ایسا حصار قائم کردیا گیا ہے جس کے احترام کی صورت میں ہی یہ آزادی عملاً بامعنی بھی بن سکتی ہے اور ریاست کے ساتھ ٹکراؤ سے بھی بچا جاسکتا ہے۔ معاملہ اگر مذہبی عقائد کا، مذہبی شخصیتوں اور مذہبی روایات کا ہو تو یہ بات اور بھی زیادہ ضروری بن جاتی ہے کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے ،صحت مند تنقید اور اشتعال انگیز تنقیص کے فرق کو نظر انداز نہ کیا جائے اور زبان وبیان دونوں ہی کے معاملے میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ شہریوں کے کسی بھی گروہ، فرقے یا طبقے کے جذبات واحساسات مجروح نہ ہوں۔ یہی ہونا چاہیے لیکن کچھ لوگ جان بوجھ کر زبان وقلم کے ذریعہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ردا کو تار تار کردینے اور فضا کو نفرت کے انگاروں سے بھر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ جو کچھ کررہے ہیں ملک وسماج پر، لوگوں کی سوچ پر اس کے کتنے مضر اور منفی اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ ایسی ہی ایک ناروا کوشش سپریم کورٹ کے ایک ایڈووکیٹ آروی بھسین کی ایک

تصنیف ''اسلام۔ مسلمانوں کی سیاسی عالمی یلغار کا نظریہ'' (Islam - A concept of political world Invasion by Muslims) کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ بعد میں ''راج نیتک وشو پر مسلم آکرمن کی اودھارنا'' کے نام سے اس کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

حکومت مہاراشٹر نے 9 مارچ 2007 کو ایک نوٹی فکیشن جاری کر کے اس کتاب پر پابندی عائد کر دی۔ اس کی تمام جلدیں بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ نوٹی فکیشن میں کہا گیا تھا کہ کتاب میں مذہب اسلام، مسلم کمیونٹی، پیغمبر اسلام ﷺ، قرآن، جہاد اور تبدیلی مذہب کے حوالہ سے بہت سی اہانت آمیز، بے بنیاد اور اشتعال انگیز باتیں کہی گئی ہیں جن کے نتیجے میں سماجی ہم آہنگی اور امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ بھسین نے اس کے خلاف ممبئی ہائی کورٹ میں اپیل کی اور معاملہ جسٹس شریمتی انجنا دیسائی، جسٹس ڈاکٹر وی وائی چندر چوڑ اور جسٹس آر ایس موہتے پر مشتمل تین رکنی بینچ کے حوالے کر دیا گیا۔ فاضل بینچ نے 14 اگست 2009 کو اپنا فیصلہ سنانے کے بجائے اسے ریزرو کر دیا بعد ازاں 6 جنوری 2010 کو یہ باضابطہ طور پر سنایا گیا۔ فاضل بنچ نے دوسری چیزوں کے علاوہ اپنے اس فیصلے میں یہ کلیہ بھی بیان کیا ہے کہ کوئی بھی مذہب تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔ تنقید کسی بھی مذہب پر کی جا سکتی ہے لیکن یہ تنقید صحت مند ہونی چاہیے، علمی سطح پر سمجھنے، سمجھانے کے لیے کی جائے، اسے کسی بھی طور پر نہ تو بدخواہی پر مبنی ہونا چاہیے، نہ اس کے نتیجے میں مختلف فرقوں کے درمیان نفرت کے جذبات کی پرورش اور بدگمانی کی راہ ہموار ہونی چاہیے۔

فاضل بینچ نے ممنوعہ کتاب کے تمام ابواب کا تفصیلی جائزہ بھی لیا ہے اور جو غلط اور گمراہ کن باتیں کہی گئی ہیں ان کی گرفت بھی کی ہے اور اپنے طور پر صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ 150 صفحات پر مشتمل یہ فیصلہ اس لائق ہے کہ اسے سطر سطر پڑھا جائے اور محفوظ کر لیا جائے۔ مثال کے طور پر فاضل بینچ نے مسلمانوں، خاص کر ہندوستانی مسلمانوں پر مصنف کے اہانت آمیز تبصروں کو خاص طور پر انتہائی قابل اعتراض قرار دیتے ہوئے ان کے تعلق سے اپنی رائے بھی پیش کی ہے۔ بھسین نے اپنی کتاب میں مسلمانوں پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ تشدد پر یقین رکھتے ہیں، وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کفر اور کافروں کو صفحۂ ہستی

سے مٹادیا جائے، وہ مغلستان قائم کرنے کے منصوبے بنارہے ہیں وہ ایک دس نکاتی منصوبے پر عمل کررہے ہیں جس کا مقصد اپنی آبادی میں اضافہ کرکے ہندو آبادی پر غلبہ حاصل کرلینا ہے۔ فاضل بینچ کا کہنا ہے کہ مصنف کی رائے اسلام کے بارے میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کا یہ کہنا انتہائی قابل اعتراض ہی قرار پائے گا کہ تمام مسلمان تمام غیر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کے درپے ہیں، وہ تشدد کے ذریعہ پوری دنیا میں اسلام پھیلانے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ مصنف نے ایک قدم اور آگے جاکر کہا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے مغلستان قائم کرنے کا ہدف مقرر کررکھا ہے، اور یہ کہ تمام مسلمان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان سیاسی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے دو قومیں ہیں۔ مصنف کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک ایسے منصوبہ پر عمل پیرا ہیں جس میں ہندوؤں کو مسلمان بنانا، ہندو مندروں پر حملہ کرنا، ہندو عورتوں کو اغواء کرنا اور خاندانی منصوبہ بندی کی راہ میں روڑے اٹکانا وغیرہ شامل ہے۔ یہی وہ تبصرے یا بیانات ہیں جو لوگوں کو تشدد پر ابھار سکتے ہیں۔ جو تشدد، دشمنی یا منافرت کی آبیاری کرسکتے ہیں''۔

تشدد کے واقعات میں مسلم نوجوانوں کی شمولیت کے الزام کے حوالہ سے فاضل بینچ نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ ''اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گمراہ مسلم نوجوانوں نے تشدد کی کاروائیوں میں حصہ لیا ہے۔ لیکن گمراہ نوجوان دوسرے مذہبی گروہوں میں بھی پائے جاتے ہیں اور ایسی مثالیں بھی ہیں کہ انھوں نے تشدد کی کارروائیوں میں حصہ بھی لیا ہے اس طرح کی مثالوں کی بنیاد پر پوری مسلم کمیونٹی کو دہشت گرد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مصنف کو پوری مسلم کمیونٹی کو ایک ہی برش سے ایک ہی رنگ میں رنگنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مصنف نے ہندوستانی مسلمانوں کے ایک قابل ذکر حصے کی اہانت کی ہے جو قومی زندگی کے دھارے میں شامل ہے، جو تمام میدانوں میں ہندوستان کی تعمیر وترقی میں معاونت کررہا ہے''۔

فاضل بینچ نے مصنف کی اس خوش خیالی کو بھی افسوسناک قرار دیا ہے کہ مسلمانوں اور دوسروں میں جنگ ناگزیر ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستوں اور ان کے مخالفین کے درمیان جنگ لازمی ہے۔ اس ضمن میں اس نے پندرہویں صدی کے فرانسیسی فلسفی

نوسٹر داMس اور پروفیسر ہنٹنگٹن کا حوالہ دیا ہے جن کا کہنا ہے کہ دنیا دو متحارب دھڑوں میں تقسیم ہو رہی ہے جن کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ناگزیر ہے۔ مصنف نے دنیا کے تمام مذہبی اور سیاسی لیڈروں سے یہ اپیل بھی کی ہے کہ وہ دہشت گردی کے اصل منبع کو تلاش کرنے کی کوشش کریں اور بھسین کے مطابق یہ منبع فی الواقع قرآن ہے۔ فاضل بینچ نے مصنف کے ان اقتباسات کے حوالے دے کر یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا اس طرح کی ترغیب وتحریک کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب دونوں مذاہب کے درمیان معاندت کے فروغ کا ذریعہ نہیں بن سکے گی یا اس کا مقصد مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں ہے یا اس کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں میں دشمنی، معاندت اور منافرت کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی؟ ظاہر ہے ان سوالوں کے جواب اثبات میں ہی دیے جا سکتے ہیں۔ یہ کتاب جسے ذہنی غلاظت کی پوٹ کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا اپنے دامن میں وہ سب کچھ سمیٹے ہوئے ہے جسے ہندتو وادی اکثر وبیشتر طوطے کی طرح رٹتے سنائی دیتے ہیں۔ یہ ان کی مجبوری ہے ان پر ناگپور کے آسمان سے جو کچھ نازل ہوتا ہے اسے رٹنے کے علاوہ وہ کچھ اور کر ہی نہیں سکتے ناگپور کی کارگاہ میں ان کا جو ذہنی سانچہ ڈھلا ہے وہ اس کے علاوہ کسی اور چیز کو قبول ہی نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو۔

ممنوعہ کتاب "A concept of political world Invasion by Islam - Muslims" (اسلام۔ مسلمانوں کی سیاسی عالمی یلغار کا نظریہ) کے مصنف آر وی بھسین نے مغرب ومشرق کے اسلام دشمن اصحاب قلم کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے پوری پوری کوشش اس بات کی ہی کی ہے کہ اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کے حوالے سے سب وشتم اور بہتان تراشی کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ چنانچہ اس کتاب کو اگر شاطران مشرق ومغرب کے خبث باطن کا عکس کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اس آتش گیر مواد کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے "ذکر خیر" کی آمیزش کر کے بھسین نے اسے اور بھی زیادہ شر بار بنا دیا ہے۔ حکومت مہاراشٹر نے اس پر بجا طور پر پابندی عائد کر دی ہے اور اب ممبئی ہائی کورٹ نے اس پابندی کو حق بجانب قرار دے کر بھسین کی اپیل مسترد کر دی ہے۔

حکومت مہاراشٹر کے نوٹی فکیشن میں کہا گیا ہے کہ کتاب میں قرآن، پیغمبر اسلام ﷺ ، مذہب اسلام، جہاد، ہندوستانی مسلمانوں اور تبدیلی مذہب کے تعلق سے گمراہ کن اور اہانت آمیز باتیں کہی گئی ہیں جن سے بچا جا سکتا تھا۔ دریدہ دہن مصنف نے رسوائے زمانہ کتاب ''رنگیلا رسول'' اور انور شیخ کی کتاب ''اسلام اور دہشت گردی'' اور ''جنس وتشدد'' کے اقتباسات کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ کی نجی زندگی اور ازواج مطہرات کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے اسے مسلمانوں ہی نہیں بلکہ تمام شریف النفس انسانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی سوچی سمجھی اور ناروا کوشش کے سوا کوئی اور نام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ ذات اقدس جسے اس کائنات کے خالق و مالک نے ''ورفعنا لک ذکرک'' کی نوید سنائی ہو، اقصائے عالم میں ان گنت مسجدوں کے میناروں سے دن میں پانچ بار جس کے اللہ کے رسول ہونے کی گواہی دی جاتی ہو اور کروڑوں مسلمان جس ذات پاک پر ہر روز سلام و درود بھیجتے ہوں اس پر اگر کچھ کوزہ پشت بالشتیے خاک اچھالنے کی کوشش کرتے ہیں تو ظاہر ہے اس کی عظمت پر کوئی حرف آنے والا نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے اس عمل سے اس آگ کے لیے مسلسل ایندھن ہی فراہم کر رہے ہیں جس میں انھیں ہمیشہ جلنا ہے۔ فاضل بنچ نے بجا طور پر کہا ہے کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے جذبات کو جراحت پہنچانے کے لیے ہی پیغمبر اسلام کی کجلائی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرآن اور مذہب اسلام کے عنوان کے تحت کتاب میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کو ظلم و تعدّی کی راہ پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ انھیں جنگ و جدال اور تشدّد پر ابھارتا ہے۔ ان کی یہ مقدّس کتاب مسلمانوں کو کفر اور کافروں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی ترغیب دیتی ہے۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی جان کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے کافروں کے خلاف جہاد میں حصہ لیں اور اگر وہ شہید ہو جاتے ہیں تو انھیں بہشت میں 72 حوریں اور 72 غلمان ملیں گے جو ان کی ہمہ قسم کی خدمت پر مامور ہوں گے۔ یہ واحد مذہب ہے جو جہاد کے ذریعہ توسیع پر یقین رکھتا ہے اور دہشت گردی کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔ علاوہ ازیں اسلام اپنے ماننے والوں کو نہ صرف یہ کہ ایک کے بجائے چار بیویوں کی اجازت دیتا

ہے بلکہ انہیں مسلمان مردوں کی دل بستگی کا سامان بھی قرار دیتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام کے پھیلنے کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ اس نے انسانیت کو مسترد کر کے ظلم و تعدّی کا عقیدہ اختیار کر لیا ہے۔ انسانی اقدار پر یقین، قربانی اور سچائی کے ہندو عقیدہ کے برعکس اسلام تمام انسانی قدروں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتا ہے اور قرآن کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اسلام کے پیغام کو بہر قیمت مسلّط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ قرآن اہل ایمان کو اسلام پر مرمٹنے یا دوسروں کو ہلاک کر دینے کی تلقین کرتا ہے۔ اس پس منظر میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے تسلسل پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

کتاب کے مصنف نے یہ سارے نتائج قرآن کی کچھ مخصوص آیات کے حوالے سے اخذ کیے ہیں جنھیں اس نے اشتعال انگیز آیات قرار دیا ہے۔ ہائی کورٹ کی فاضل بینچ نے ان آیات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم نے ان کے معنیٰ و مفہوم کو سمجھنے کے لیے عبداللّٰہ یوسف علی کی کتاب (تفسیر) ''دی ہولی قرآن'' اور محمد اسد کی کتاب ''دی میسج آف دی القرآن'' سے مدد لی ہے جن کی جانب ہماری توجہ مسٹر وائی ایچ مچھالا نے مبذول کرائی ہے۔ دونوں ہی مصنف قرآن پر گہری نظر کے لیے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

مصنف نے اپنی کتاب میں کچھ چیدہ چیدہ آیات کا حوالہ بھی دیا ہے جنھیں اس نے ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے من مانے معنی پہنائے ہیں۔ انھیں اس نے اشتعال انگیز آیات کا نام دیا ہے۔ یہ وہی آیات ہیں جن کے تعلق سے اسلام دشمن حلقوں میں نہ صرف یہ کہ کافی کچھ لکھا اور کہا جاتا رہا ہے بلکہ ان کی بنیاد پر کلکتہ ہائی کورٹ سے باضابطہ طور پر درخواست بھی کی گئی تھی کہ قرآن پر پابندی عائد کر دی جائے۔ فاضل بینچ نے بھسین کی کتاب میں درج قرآنی آیات کے معنی و مفہوم پر اپنی جانب سے کوئی تبصرہ یا تنقید کرنے کے بجائے عبداللّٰہ یوسف علی اور محمد اسد کی تفسیر کے حوالہ سے ان کے حقیقی معنی و مفہوم کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حوالے راست طور پر کچھ کہے بغیر بھسین کی بد دیانتی کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔

فاضل بنچ نے اپنے فیصلے میں کہا ہے ”ہم قرآن کی تشریح وتفسیر کی انتہائی دشوار گزار راہ پر گامزن ہونا نہیں چاہتے۔لیکن جو کوئی بھی اس راہ پر چلنا چاہتا ہو اسے ہم مشورہ دیں گے کہ وہ محمد اسد کی کتاب ”دی میسج آف دی القرآن“ کا دیباچہ ضرور پڑھے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ قرآن کو الگ الگ آیات واحکامات کے مجوعے کے روپ میں نہیں بلکہ ایک کُل کے روپ میں دیکھا جائے، اسے ایک ایسے اخلاقی اصول ونظریہ کے پھیلاؤ کے روپ میں دیکھا جائے جس کی ہر آیت ،ہر جملہ ،ایک دوسرے سے مربوط ہے۔اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر کے قرآن کے حقیقی معنی ومفہوم کو سمجھ پانا مشکل ہے۔

فاضل بنچ نے اپنے فیصلے میں بعض ان آیات کا حوالہ بھی دیا ہے جن میں امن، رواداری، بھائی چارہ، عورتوں کے ساتھ مساوی سلوک کی وکالت اور بزور قوت تبدیلی مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے۔اس ضمن میں سورہ 5 آیت 32 سورہ 7 آیت 151 سورہ 42 آیت 40، 41، 42، 43 سورہ 49 آیت 13 سورہ 13 آیت 7 سورہ 6 آیت 188 سورہ 14 آیت 4 سورہ 11 آیت 117، 118 سورہ 2 آیت 256 سورہ 4 آیت 3، 129 اور سورہ 33 آیت 35 وغیرہ کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ان آیات اور ان کے معنی ومفہوم کو محمد اسد کی کتاب ’’دی میسج آف دی القرآن‘‘ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے۔ان کے ذریعہ ان الزامات کی اصل حقیقت واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے جو بھسین کی کتاب میں اسلام اور قرآن پر لگائے گئے ہیں۔مثال کے طور پر فاضل بینچ نے متعلقہ قرآنی آیات نقل کرنے کے بعد کہا ہے: کسی استثنا کے بغیر تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ طاقت کے ذریعہ تبدیلی مذہب کا کوئی جواز نہیں ہے اور یہ کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا بدترین گناہ ہے۔اسی طرح عورتوں کے بارے میں متعلقہ آیات نقل کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ قرآن عورتوں کے اپنے تشخص کو تسلیم کرتا ہے وہ انہیں روحانی، سماجی، معاشی اور قانونی حقوق سے سرفراز کرتا ہے۔

فاضل بینچ نے بھسین کے اس دعوے کو بھی تسلیم نہیں کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔فیصلے میں کہا گیا ہے کہ اس دعوے کی صداقت کو جانچنے پرکھنے کے لیے متعدد معتبر مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا گیا جن میں یہ بات کہی گئی ہے کہ انڈونیشیاء، ملائشیا اور افریقہ کے مشرقی ساحل

کے ملکوں میں اسلام کو پرامن ماحول میں فروغ حاصل ہوا۔ فیصلے کے آخری حصے میں کہا گیا ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام پر بھی تنقید کی جاسکتی ہے، اس کتاب پر محض اس بنیاد پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ہمارا کہنا یہ بھی ہے کہ اسلام کی یہ تنقید علمی سطح کی نہیں ہے۔ مصنف نے اسلام اور مسلمانوں خاص کر ہندوستانی مسلمانوں پر اہانت آمیز تبصرے کیے ہیں، ان کے مذہبی جذبات کو جان بوجھ کر، بدخواہی کے جذبے کے تحت برانگیختہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس کتاب پر پابندی عائد کرنے کے معاملہ میں حکومت مہاراشٹر حق بہ جانب قرار پاتی ہے۔

8/جنوری 2010

○○

اپنے گریبان میں بھی جھانکیے

مالیگاؤں بم دھماکہ میں سادھوی پرگیہ سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری نے خاص طور پر سنگھ پریوار کے لوگوں کو ذہنی طور پر خاصی پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ انھیں یہ سمجھنے میں کافی دشواری پیش آ رہی ہے کہ دہشت گردی کے جرم میں کوئی ہندو بھی ملوث ہوسکتا ہے اور اسے گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے۔ اب تک دہشت گردی کے جتنے بھی واقعات ہوئے ہیں ان میں صرف مسلمانوں کو ہی گرفتار کیا گیا ہے۔ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا کہ دھماکے مسجدوں میں ہوئے یا مندروں میں، شب برأت کے موقع پر کسی قبرستان کو نشانہ بنایا گیا یا دیوالی کی خریداری کرنے والے معصوم لوگوں کو۔ ہر بار جب بھی کوئی دھماکہ ہوا ہے تو ریکارڈ کی سوئی ایک ہی ٹریک پر چلتی رہی ہے یعنی کچھ مقامی مسلمانوں نے لشکر طیبہ یا ہوجی یا انڈین مجاہدین کی ہدایت پر یہ قابل نفریں کارنامے انجام دیے ہیں۔ لیکن اس بار ریکارڈ کی یہ سوئی ایک الگ ٹریک پر چل پڑی اور سنگھ پریوار کے لوگوں کی نیند حرام ہو کر رہ گئی ہے۔ اس بار اسلامی دہشت گردی کے حوالے سے آسمان سر پر اٹھا لینے والی آوازیں گنگ ہو کر رہ گئی ہیں اور دہشت گردوں کے معاملے میں حکومت کی نرم روی کے طعنے بھی کم سننے کو مل رہے ہیں۔

سنگھ پریوار اور اس سے جڑی تنظیموں کا سارا زور اپنی صفائی پر صرف ہو رہا ہے۔ ابتدا میں کہا گیا کہ پرگیہ سنگھ کا سنگھ پریوار یا اس کی کسی تنظیم سے کوئی واسطہ نہ اب ہے نہ ماضی قریب میں کبھی رہا ہے پھر جب وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش مسٹر چوہان اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر مسٹر راج ناتھ سنگھ کے ساتھ سادھوی پرگیہ سنگھ کی تصویر سامنے آئی تو بی جے پی کے لیے یہ کہنے کی

گنجائش عملاً ختم ہو کر رہ گئی کہ سادھوی ان کے لیے اجنبی ہے۔ یہ تصویر فروری 2006 کی ہے۔ علاوہ ازیں پرگیہ سنگھ کی گرفتاری کے بعد اس کے اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اتنا کچھ سامنے آگیا ہے کہ سنگھ پریوار اب ان سے لاتعلقی کے موقف پر آسانی کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اب ان کا لہجہ قدرے بدل گیا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر راج ناتھ سنگھ اس معاملے میں پہل کرتے ہوئے سادھوی کے دفاع میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ انڈین ایکسپریس (اکتوبر 30) کے ساتھ ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا ہے کہ ان کے خیال میں سادھوی دہشت گرد نہیں ہے۔ چھاپوں کے باوجود اس کے خلاف انھیں (ATS) کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ اگر انھیں کوئی معمولی سا ثبوت بھی مل جاتا تو وہ نارکو ٹیسٹ پر اصرار نہ کرتے۔ انھوں نے اپنے اس انٹرویو میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ اس بات پر ہمیشہ یقین رکھتے رہے ہیں کہ مذہب اور دہشت گردی میں کوئی رشتہ نہیں پایا جاتا... انھوں نے یہ بھی کہا کہ "میں نے جہادی دہشت گردی کی بات تو کہی ہے لیکن اسلامی دہشت گردی کا کبھی نام نہیں لیا ہے"۔

انڈین ایکسپریس نے جب یہ جاننا چاہا کہ کیا وہ سادھوی پرگیہ سنگھ کی ہی طرح ان لوگوں کو بھی بے گناہ سمجھتے ہیں جنھیں سادھوی کے ساتھ مل کر سازش کے جال بننے اور اس سازش پر عمل درآمد میں ہر ممکن تعاون بہم پہنچانے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے تو راج ناتھ سنگھ نے کہا کہ انھیں پرگیہ سنگھ کے علاوہ کسی اور کی گرفتاری کا علم نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ کلچرل نیشنلزم پر یقین رکھنے والا کوئی شخص دہشت گرد ہو ہی نہیں سکتا۔

اپنے اس انٹرویو میں راج ناتھ سنگھ نے دو باتیں ایسی کہی ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور بحث طلب بھی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے لائق احترام صدر کا کہنا ہے کہ مذہب اور دہشت گردی میں کوئی رشتہ نہیں پایا جاتا ان کی اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اختلاف اس سے بھی نہیں ہو سکتا کہ مذہب سے دہشت گردی کا رشتہ جوڑنے والوں میں سنگھ پریوار کے لوگ ہی سر فہرست رہے ہیں۔ یہی لوگ اسلامی یا جہادی دہشت گردی کی بات کرتے رہے ہیں۔ راج ناتھ سنگھ نے اپنے اس انٹرویو میں بھی جہاں اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح استعمال نہ کرنے کی بات کہی ہے وہیں جہادی دہشت گردی کی اصطلاح کے استعمال

کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اب ان سے کون پوچھے کہ محترم یہ جہادی دہشت گردی کی اصطلاح استعمال کر کے آپ کسے کیا بتانا چاہتے ہیں؟ کیا آپ جب جہاد کی بات کرتے ہیں تو اس کا تعلق مسلمانوں کے سوا کسی اور مذہبی اکائی سے بھی ہوتا ہے؟ ظاہر ہے ایسا نہیں ہے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی جانتے ہیں۔ یہ ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے والی بات ہے۔ سنگھ پریوار نے جہاد کے حوالے سے بالکل غلط طور پر مسلمانوں اور اسلام کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کی کوئی دوسری مثال مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔

آج جب مالیگاؤں اور موداسا کے حوالے سے کچھ لوگ ہندو دہشت گردی کی بات کرنے لگے ہیں تو سنگھ پریوار اس پر معترض نظر آتا ہے اور آنا بھی چاہیے کیونکہ سچ یہی ہے کہ دہشت گردی اور مذہب کا سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دہشت گرد کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کوئی بھی دہشت گردی کی راہ پر چل پڑنے کی نادانی کر سکتا ہے۔ اس کا اس کے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا چنانچہ جو لوگ اسلامی دہشت گردی، ہندو دہشت گردی یا سکھ دہشت گردی کی بات کرتے ہیں انھیں گم کردہ راہ اور ذہنی بھٹکاؤ کا شکار ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان میں اور دہشت گردوں میں تھوڑا سا ہی فرق ہوتا ہے بلکہ بعض حالات میں تو انھیں ایک دوسرے سے ممیز کرنے والی لائن تو سرے سے مفقود ہی ہوتی ہے۔ اب اگر سنگھ پریوار کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے تو اسے ایک فال نیک ہی کہا جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ بی جے پی اور سنگھ پریوار کے دوسرے لوگ کھلے دل سے یہ اعتراف کر لیں کہ دہشت گردی کے تعلق سے ان کی سوچ، ان کے اپنے پیمانے غلط تھے۔ یہ اعتراف تو مالیگاؤں کے چشم کشا حقائق کے سامنے آنے سے پہلے ہی کر لیا جانا چاہیے تھا کہ اس ملک میں دہشت گردی کے بہت سے چہرے پائے جاتے ہیں اور ان کا تعلق کسی خاص مذہب سے نہیں ہے۔

سنگھ پریوار اگر حالات کا دیانت داری کے ساتھ جائزہ لے اور دوسروں کے دامن کے داغ تلاش کرنے کے بجائے خود اپنے گریبان میں بھی جھانکنے کی کوشش کرے تو اسے یہ صاف نظر آئے گا کہ مالیگاؤں اور موداسا کی کڑیاں کسی نہ کسی طور پر ناندیڑ، پربھنی، کانپور اور بنگلور وغیرہ سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس ملک کا حقیقی مفاد اس بات میں ہی مضمر ہے کہ دہشت

گردی کے تعلق سے وہ رویہ اختیار کیا جائے جو انصاف و دیانت پر مبنی ہو جس میں ذہنی تحفظات کی بنیاد پر رنگ آمیزی نہ کی گئی ہو۔ سنگھ پریوار کے ذمہ داروں کو اب اس حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، ہندو منچ، درگا واہنی اور ہندو منانی جیسی تنظیمیں خاص طور پر اقلیتوں کے خلاف جو ذہن بنا رہی ہیں وہ ان کے حوالے سے تشدد اور قتل و غارت کے واقعات کو جائز سمجھنے لگتا ہے۔ کیا سنگھ پریوار اپنے رویہ پر نظر ثانی کرے گا؟ بظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا حالانکہ موجودہ حالات میں ملک کا وسیع تر مفاد دوسری چیزوں سے کہیں زیادہ اس بات کا ہی متقاضی ہے کہ نفرت کے بجائے محبت اور رواداری کے پیغام کو عام کیا جائے۔

راج ناتھ سنگھ نے انڈین ایکسپریس کے ساتھ اپنے اسی انٹرویو میں یہ عجیب و غریب کلیہ بھی بیان کیا ہے کہ کلچرل نیشنلزم پر یقین رکھنے والا کوئی شخص دہشت گرد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کلیہ کی جڑیں آر ایس ایس کے نظریہ ساز گرو گولوالکر کے اس دعوے میں پیوست ہیں کہ اس ملک کا وفادار ہندو اور صرف ہندو ہی ہوسکتا ہے۔ ہندو کوئی ایسا کام کر ہی نہیں سکتا جو ملکی مفاد پر ضرب لگانے والا ہو یہ کلیہ سنگھ پریوار کے لوگوں کے لیے ایک ایسا عقیدہ ہے جسے صرف تسلیم کیا جاسکتا ہے بحث نہیں کی جاسکتی اس عقیدے کی موجودگی میں ظاہر ہے سنگھ پریوار جہادی دہشت گردی کے سوا اس موضوع پر کسی اور زاویے سے سوچ ہی نہیں سکتا۔

31/اکتوبر 2008

OO

ہم سب محض رسم ادا کر رہے ہیں

یہ رسم ہے جو کہ گذشتہ 15 سال سے ہم پابندی سے ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔ کچھ لوگ 6 دسمبر کو یوم دعا منانے کی اپیل کرتے ہیں تو کچھ لوگ شوریہ دیوس منا کر یہ بتاتے اور جتاتے چلے آرہے ہیں کہ انھیں اپنے کیے پر کوئی ندامت نہیں ہے۔ ہم جیسے لوگ بھی کسی مضمون، مراسلہ یا کالم کی شکل میں اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے ساتھ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ چلو رسم تو ادا ہو ہی گئی اور ہم ہی کیا رسم تو وہ لوگ بھی ادا کر رہے ہیں جنھیں بابری مسجد کی شہادت کے تعلق سے 3 ماہ کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی اور آج 15 سال گزرنے کے بعد بھی ہنوز روز اول جیسی صورت حال ہے۔ لبرہن کمیشن اگر واقعتاً کام کر رہا ہوتا تو اپنی رپورٹ کب کا پیش کر چکا ہوتا مگر جن کا مقصد محض رسم کی ادائیگی ہو وہ کام کیوں کرنے لگے۔

وہ لوگ جن پر مسجد توڑنے کا الزام ہے، جن کے چہرے جانے پہچانے ہیں ان کے خلاف بھی 15 برسوں سے قانونی کارروائی کا سوانگ رچایا جارہا ہے لیکن ابھی صرف اتنا ہو سکا ہے کہ لال کرشن ایڈوانی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف پہلے گواہ کا بیان قلم بند کرنے کی نوبت ہی آئی ہے ظاہر ہے اسے بھی رسم ادائیگی کا ہی نام دیا جاسکتا ہے اور ان سب سے بھی زیادہ دلچسپ انداز میں رسم ادائیگی کا سلسلہ الہ آباد ہائی کورٹ میں جاری ہے جو دراز سے دراز تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ رسم ادائیگی کی یہ طویل رات کب ختم ہوگی اور اس کی کوکھ سے کوئی چمکتا دمکتا سورج جنم لے گا یا کجلایا سورج جو خون میں لتھڑی صبح کا پیامبر ہوگا۔

15 سال قبل 6 دسمبر 1992 کو اجودھیا میں جو کچھ ہوا وہ نہ تو اچانک رونما ہونے والا کوئی

اتفاقی حادثہ تھا اور نہ کوئی ایسا سانحہ تھا جس سے خاص کر وہ لوگ جو مسند اقتدار پر براجمان تھے یکسر بے خبر رہے ہوں سچ تو یہ ہے کہ آنے والے بھیانک واقعات کی آہٹ وہ سب لوگ سن رہے تھے جنھوں نے اپنے کان بند نہیں کر رکھے تھے۔ اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ اور وزیر داخلہ چوان یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جو وعدہ شکن گروہ جولائی 1992 میں الہ آباد ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے احکامات کو نظر انداز کر کے متنازعہ زمین پر پختہ چبوترا بنا سکتا تھا، جو گروہ قومی یکجہتی کونسل کو کرائی گئی یقین دہانی کو اپنے پاؤں تلے روند سکتا تھا وہ کارسیوا کے نام پر بابری مسجد کو منہدم بھی کر سکتا تھا۔ نرسمہا راؤ اور ان کے قریبی ساتھی اتنے نا سمجھ اور اتنے معصوم بہر حال نہیں ہو سکتے تھے کہ انھیں آنے والے واقعات کا سرے سے کوئی اندازہ ہی نہ رہا ہو خاص کر اس صورت میں جبکہ اس اندیشے کا برملا اظہار کیا جا رہا تھا کہ سنگھ پریوار کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ اور تو اور خود ان کی کابینہ کے سینئر رکن ارجن سنگھ نے بابری مسجد کے انہدام سے دو روز قبل چار دسمبر ہی کو اس وقت کے داخلہ سکریٹری گوڈبولے سے کہہ دیا تھا کہ مسجد کا انہدام ایک یقینی امر ہے۔ مسجد توڑ دی جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ اس موقع پر حکومت کی طرف سے جاری کیے جانے والے بیان کا مسودہ وہ پہلے ہی تیار کر لیں۔ ارجن سنگھ نے یہ نتیجہ غالباً لکھنؤ میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ سے اپنی بات چیت اور ان اطلاعات کی بنیاد پر اخذ کیا تھا جو انھیں مختلف حلقوں سے برابر موصول ہو رہی تھیں۔ ارجن سنگھ کے علاوہ ایک اور سینئر وزیر فوتیدار نے بھی 3 دسمبر کو وزیر اعظم سے ملاقات کر کے انھیں بتایا تھا کہ سنگھ پریوار بابری مسجد کے انہدام کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کے تحفظ کے لیے بھرپور قدم اٹھانا چاہیے۔ نرسمہا راؤ نے انھیں یقین دلایا تھا کہ بابری مسجد کے تحفظ کے لیے ایک جامع ’معقول اور قابل عمل ہنگامی منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے۔ لیکن 6 دسمبر کو جب اس جامع ’معقول اور قابل عمل منصوبہ پر عمل کا وقت آیا تو پتہ چلا کہ اس طرح کا منصوبہ صرف خواب و خیال کی بات تھی۔ یہ محض لوگوں کو دھوکہ دینے کی ایک سازش تھی جسے کمال عیاری کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا۔ چنانچہ 6 دسمبر کو جب شرپسندوں نے بابری مسجد پر حملہ کیا تو سرکاری مشینری، پولس اور فوج کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔ پولس کا عملہ اور فوج کے جوان ہاتھ باندھ کر

کھڑے رہے اور مسجد شہید کردی گئی۔

6 دسمبر کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد اس کے ملبے پر جس طرح بالکل غیر قانونی طور پر عارضی مندر کی تعمیر عمل میں آئی اس کے لیے کسی اور کو نہیں بلکہ نرسمہا راؤ اور چوان کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے کیونکہ اس وقت ریاست میں صدر راج نافذ تھا اور کوئی بھی کام مرکزی حکومت کی مرضی کے خلاف نہیں ہوسکتا تھا۔

6 دسمبر کو اجودھیا میں جو کچھ ہوا وہ ایک طویل سلسلے کی آخری کڑی تھی۔ یہ سلسلہ آزادی کے بعد اتر پردیش کے ایک سابق کانگریسی وزیر نے شروع کیا تھا اور اس تحریک کو ہمیشہ ہی کسی نہ کسی شکل میں سنگھ پریوار اور کانگریس دونوں ہی کی تائید وحمایت حاصل رہی۔ 1986 میں جب بظاہر سنگھ پریوار اس تحریک کو گود لے چکا تھا مبینہ طور پر راجیو گاندھی کی مرضی سے مسجد کا تالا کھول دیا گیا اور تمام لوگوں کو پوجا درشن کی اجازت مل گی اور اس کے ساتھ ہی سنگھ پریوار نے ایک لمبی چھلانگ لگادی۔ اس کے تیور بھی بدل گئے مطالبات اور اہداف بھی۔ اب تک یہ لوگ تالا کھولنے اور عام پوجا پاٹھ کی اجازت کے لیے تحریک چلا رہے تھے اب انھوں نے بابری مسجد کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کا مطالبہ شروع کردیا۔ پھر راجیو گاندھی کے ہی ایماء پر بابری مسجد کی زمین پر مجوزہ مندر کے سنگھ دوار کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اس طرح کانگریسی حکومت کی مہربانیوں سے بات نعروں اور مطالبات کی حدوں کو پھلانگ کر عملی اقدامات کی سرحدوں میں داخل ہوگئی اگر کانگریس بالواسطہ تعاون کی راہ اختیار نہ کرتی تو 6 دسمبر کو بابری مسجد کے انہدام کا سانحہ رونما نہ ہوتا۔ جو کچھ ہوا وہ سنگھ پریوار اور کانگریس کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ نرسمہا راؤ اور چوان نے وہی کچھ کیا جو انھیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا کیونکہ کانگریس جس پالیسی پر عمل پیرا تھی یہی اس کا منطقی نتیجہ تھا۔ سنگھ پریوار نے بھی وہی کچھ کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا کیونکہ ہندتو کو ایک زندہ اور قابل عمل نظریہ کے روپ میں پیش کرنے کے لیے یہ سب کچھ کرنا ضروری تھا۔

چنانچہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد اسے نئی زندگی اور نئی طاقت مل گئی۔ اکثریت کے ایک قابل ذکر حصہ نے بابری مسجد کے انہدام کو سنگھ پریوار کی فتح عظیم کے روپ میں دیکھا اور

اسے یہ بھی لگا کہ ہندو راشٹر کے خاکہ میں رنگ بھرا جا سکتا ہے، یہ حد امکان سے باہر نہیں ہے۔

بابری مسجد کے انہدام نے کانگریس کے چہرے سے وہ سیکولر نقاب نوچ لی جو کبھی اس کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی تھی مسلمانوں اور انصاف پسند ہندوؤں نے اس کے طرز عمل کو نرم ہندوتوا کے روپ میں دیکھا اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ یہ سلسلہ آج بھی بڑی حد تک جاری ہے۔ کانگریس کو جو نقصان ہوا ہے اس کی بھرپائی مشکل سے ہی ہو پائے گی۔

بابری مسجد کو شہادت کی منزل تک پہنچانے میں کانگریس اور سنگھ پریوار کے علاوہ ایک اہم رول طالع آزما مسلم قیادت نے بھی ادا کیا ہے۔ مسلمانوں کے لیڈر سنگھ پریوار کے اس اعلان کے باوجود کہ وہ رام جنم بھومی کو آستھا یعنی عقیدہ کا مسئلہ سمجھتا ہے اور اس سے سر مو بھی انحراف نہیں کرے گا مختلف مرحلوں میں اس کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرتے رہے اس کا نہ کوئی تک تھا نہ جواز۔ بابری مسجد کے قضیہ کا تعلق ملکیت کے تعین سے تھا۔ اس کے علاوہ جو باتیں بھی تھیں وہ سب فروعی تھیں مسئلے کو الجھانے کے لیے تھیں۔ سنگھ پریوار کو اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے وقت درکار تھا اور مسلم قیادت اس سے مذاکرات کے نام پر اسے یہ موقع فراہم کرتی رہی۔

14/دسمبر 2007

○○

مسکراتی، گنگناتی صبح آپ کی منتظر ہے

اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ ہند پاک تعلقات کی ہموار سطح ہمیشہ ہی دونوں ملکوں کے لیے وقت کی اہم ترین ضرورت رہی ہے اور انکار اس سے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ضرورت ہمیشہ ہی تشنۂ تکمیل رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس سمت میں کبھی کوئی بھرپور قدم نہ اٹھایا گیا ہو یا کوئی ہمہ جہت کوشش نہ کی گئی ہو اور ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کوششوں کے ایسے نتائج نہ برآمد ہوئے ہوں جنھیں وقتی طور پر اطمینان بخش کہا جا سکتا ہو۔ یہ کوششیں ثمر بار بھی ہوئیں اور ان کے نتیجے میں ماحول کی حدّت بھی قدرے کم ہوئی لیکن یہ سب کچھ عارضی ثابت ہوتا رہا ہے۔ مخاصمت و معاندت پر مبنی منفی سوچ کا اژدہا ہمیشہ ہی مثبت نتائج کو نگل لیتا رہا ہے۔ گزشتہ 62 برسوں سے یہی سب کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اور آج جب ہم 21 ویں صدی کے دوسرے عشرے کی دہلیز پر کھڑے ہیں تو ایٹمی صلاحیت کے حامل ہمارے دونوں ملکوں کی شناخت بڑی حد تک باہم نبرد آزما، دیرینہ دشمنوں کے طور پر ہی ہوتی ہے جن کی باہمی آویزش جنوبی ایشیا ہی نہیں بلکہ عالمی امن کو بھی معرض خطر میں ڈال سکتی ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ کیا ہجرتوں کی نیش زن راتوں کا کرب، اپنی زمین، اپنے گھر بار چھوڑ کر دیارِ غیر میں پناہ لینے اور ایک نئی زندگی کی داغ بیل ڈالنے کی مجبوری اب بھی دونوں ملکوں کے عوام کو ایک دوسرے سے دور رکھنے اور باہمی نفرت کے الاؤ کو سلگائے رکھنے کا ذریعہ بن رہی ہے۔ بظاہر ایسا نہیں ہے۔ دونوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں انسانی رشتوں، ثقافتی قدروں اور تاریخی تسلسل کی ڈور میں بندھے لوگ وقتی طور پر جذبات کی

رو میں بہہ کر، نامساعد حالات کے بوجھ تلے دب کر ایک دوسرے کے تئیں بے رخی اور معاندت کا رویہ اختیار تو کر سکتے ہیں لیکن اس ڈگر پر مسلسل قائم نہیں رہ سکتے۔ عالمی سطح پر انسانی گروہوں کے جذب وانجذاب اور ایک دوسرے سے کٹنے اور جڑنے کا عمل اس کی ہی تصدیق وتوثیق کرتا نظر آتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے عوام اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اعداد وشمار اس کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ پاکستان کے جنگ گروپ اور ٹائمنر آف انڈیا گروپ کے ایڈیٹرس کی طرف سے نئے سال کو امن کے سال کے طور پر منانے کے فیصلے کے تحت دونوں ملکوں کے کچھ منتخب شہروں کے باشندوں سے ان کی رائے جاننے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ پاکستان کے 72 فیصد اور ہندوستان کے 66 فیصد لوگ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور پرامن تعلقات کو پروان چڑھانے کے خواہاں ہیں جبکہ ہندوستان کے صرف 17 فیصد اور پاکستان کے 8 فیصد لوگ ہی ایسے ہیں جو پرانی عصبیتوں کو قائم ودائم رکھنے اور دیرینہ کدورتوں کو پالتے پوستے رہنے کے حق میں ہیں۔ یہ حقیر تعدادیوں تو ایسی نہیں ہے کہ پوری قومی زندگی کی محور بن جائے لیکن عملاً ہوا ایسا ہی رہا ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کی بھاری اکثریت بوجوہ اپنے حکمرانوں کو معاندت ومخاصمت کا راستہ ترک کرنے پر آمادہ نہیں کر پا رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب عوام کی غالب اکثریت نفرتوں، عداوتوں مخاصمتوں اور کدورتوں کے سیل رواں سے دامن بچا کر ترقی اور خوش حالی، دوستی اور امن کی شاہراہ پر ایک نیا سفر شروع کرنے اور محبتوں کے چلن کو عام کرنے کی حامی ہے تو وہ اس معاملے میں اپنی اجتماعی قوت کا بھرپور مظاہرہ کرنے اور نامساعد حالات پر اثر انداز ہونے میں ناکام کیوں رہتی ہے؟ یہ سوال انتہائی اہم بھی ہے اور سنجیدہ غور وفکر کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ اس سوال کا جواب جزوی طور پر برصغیر کی تقسیم کی کوکھ سے جنم لینے والے ان مسائل میں تلاش کیا جا سکتا ہے جو دور دور تک اپنی جڑیں پھیلائے نظر آتے ہیں۔ ان میں بیشتر مسائل برطانوی استعمار کی اپنی پیچ در پیچ مصلحتوں کی دین ہیں۔ علاوہ ازیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی عجلت پسندی اور سر ریڈ کلف کی ذہنی ٹیڑھ بھی ان کے لیے کسی حد تک ذمہ دار رہی ہے۔ یہ مسائل سنگین نوعیت کے ضرور

ہیں لیکن حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو ان کا حل تلاش کر لینا کچھ بہت زیادہ دشوار بھی نہیں ہے شرط صرف یہ ہے کہ ان کے تعلق سے جو بھی فیصلے کیے جائیں، جو بھی قدم اٹھائے جائیں وہ بہر صورت تحمل، تحمل، تفکر، تدبر اور توازن کے آئینہ دار ہوں۔ اس کے لیے مافوق الفطرت صلاحیتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بس دردمند دل چاہئے جو نجی اور گروہی مفادات سے بلند تر ہو کر سب کے لیے دھڑکتا ہو، وہ ذہن رسا چاہیے جو ہم اور تم کے خانوں سے بلند تر ہو کر سوچ سکے، جو انسانیت عظمیٰ کی صلاح وفلاح پر یقین رکھتا ہو اور اسی کو سود وزیاں کی میزان قرار دیتا ہو۔

برصغیر کو جن مسائل کا سامنا ہے ان کے حوالہ سے حکمرانوں کی اپنی مصلحتوں اور مفادات حاصلہ کی ریشہ دوانیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالات کو بگاڑنے اور الجھی ڈور کو الجھاتے چلے جانے میں ان کا رول بھی خاصا اہم رہا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں ملکوں کے تعلقات کو بگاڑنے اور حالات کو دھماکہ خیز بنائے رکھنے میں ''دست نادیدہ'' کی کرم فرمائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ٹائمز آف انڈیا اور جنگ گروپ کے ایڈیٹرز اپنے مشترکہ بیان میں ''دست نادیدہ'' کے تعلق سے کہتے ہیں: ''اس خطے میں ایسے غیر ملکی بیرونی عناصر بھی کام کر رہے ہیں جو ان دونوں ہمسایہ ملکوں کی دشمنی، رقابت اور عناد کا فائدہ اٹھانے کے درپے ہیں۔ اس خطے کو بحران اور مصائب میں مبتلا رکھنا ہی ان کا مطمح نظر ہے۔ ہمیں ایسے عناصر کے خلاف اٹھ کھڑے ہو کر ان کے مفادات کو یکسر ناکام بنانا ہوگا۔ اگر دونوں ممالک کی سول سوسائٹی ذرائع ابلاغ کے ساتھ مل جل کر اپنے اپنے اندر لچک اور خیر سگالی کے جذبے کو فروغ دے تو اس صورت میں ہم ان قوتوں کو جو نفرت کو پروان چڑھاتی ہیں پیچھے دھکیل سکتے ہیں''۔

اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کی ناہموار سطح کے لیے وہ ذہنیت بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہے جو افسانہ اور حقیقت میں یا تو جان بوجھ کر فرق کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتی یا منفی سوچ کی اس حد تک عادی ہو چکی ہے کہ ہر اس چیز کو آسانی سے قبول کر لیتی ہے جو مسائل میں مزید شدت پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ صورت حال جب تک برقرار رہے گی امن وخوش حالی کا سورج برصغیر کے افق پر اپنی تمام تر تابانیوں کے

ساتھ جلوہ گر نہیں ہوگا۔ مقام مسرت ہے کہ ہندوستان کے ٹائمز آف انڈیا گروپ اور پاکستان کے جنگ گروپ نے اس تناظر میں شانہ بشانہ کھڑے ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ دونوں ملکوں میں محبت اور اعتماد کے چلن کو عام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھیں گے۔ انہوں نے اپنی اس مہم یا تحریک کو امن کی آشا کا نام دیا ہے۔ دونوں گروپوں کے ایڈیٹرز نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا ہے۔: ''ٹائمز آف انڈیا گروپ، جنگ گروپ مل جل کر دونوں ممالک کے مابین قیام امن کے عمل کو یقینی بنائیں گے کیونکہ ہمیں پورا یقین ہے کہ اب اس طرح کی مداخلت کا وقت قریب تر آ پہنچا ہے۔ ہم اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ابتداء میں اس راستے میں بہت سی رکاوٹوں کا بھی سامنا کرنا ہوگا تاہم، ہم ان رکاوٹوں کو ہرگز یہ موقع نہیں دیں گے کہ وہ قیام امن کے عمل کو پٹری سے ہی اتار پھینکیں۔ ہمیں سب سے پہلے ان بنیادی مسائل کے حل کی جانب توجہ دینا ہوگی جو فوری اور ترجیحی نوعیت کے حامل ہیں اور آسانی سے حل کیے جا سکتے ہیں۔

ہندو پاک کے دو بڑے اخباری گروپوں نے دونوں ملکوں کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے جس عزم و حوصلہ کا اظہار کیا ہے اسے بہر حال مستحسن ہی کہا جائے گا۔ امن، باہمی اعتماد اور مسائل کی ڈور کو الجھاتے چلے جانے کے بجائے اسے سلجھانے کی کوشش میں ہی اس خطے کا حقیقی مفاد مضمر ہے۔ دونوں ملکوں کے ذرائع ابلاغ اس سلسلے میں کافی کارآمد رول ادا کر سکتے ہیں۔ یہ اگر چاہیں تو موجودہ گھٹن کو کم کرنے اور ایک ایسا سازگار ماحول تیار کرنے میں نمایاں رول ادا کر سکتے ہیں جو نئے تصورات کی آبیاری اور حوصلہ افزائی کرنے والا ہو۔ یہ سب کچھ ممکن ہے، شرط صرف یہ ہے کہ صدق دلی کے ساتھ کوشش کی جائے، آستینوں میں خنجر چھپا کر امن و آشتی کی بات کرنے کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ اس خطے کے ڈیڑھ ارب انسان ایک ایسی صبح کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں جو اپنے ساتھ ان کے لیے امن و آشتی اور غربت و افلاس کے خاتمہ کی نتیجہ خیز کوششوں کے آغاز کی نوید لائے گی۔ یہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ میڈیا کے لوگ دوسرے نیک نیت لوگوں کے ساتھ مل کر اس حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں جلوہ گر دیکھنے کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ یہ دونوں ملکوں کی، انسانیت عظمیٰ کی بہت

بڑی خدمت ہوگی۔ وہ دیوار جس نے دلوں کو بانٹ رکھا ہے وقت آگیا ہے کہ اسے گرادیا جائے۔ ایک چمکتی، دمکتی، مسکراتی، گنگناتی صبح آپ کے بند کواڑوں پر دستک دے رہی ہے۔ اسے مایوس و نامراد لوٹ جانے پر مجبور نہ کیجیے۔ اپنے گھروں کے دروازے اور دل کے پٹ اس کے لیے کھول دیجیے۔ اسی میں برصغیر کی بھلائی ہے۔

8/جنوری 2010

OO

اب مسجدوں کے مینار بھی چبھنے لگے

بات ڈریس کوڈ سے حجاب اور اسکارف سے شروع ہوئی تھی جا پہنچی مسجدوں کے مناروں تک۔ براعظم یورپ جو بتدریج 3 کروڑ 38 لاکھ مسلمانوں کا مسکن، ان کی آرزوؤں کا محور ومرکز بن چکا ہے، اب انھیں مختلف عنوان وانداز سے یہ بتانے اور جتانے کی کوشش کررہا ہے کہ وہ عملاً ایک ناپسندیدہ عنصر، ایک تکلیف دہ بوجھ بنتے جارہے ہیں۔ ان سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی تہذیب وثقافت کی ان علامتوں سے دستبردار ہوجائیں جو انھیں دوسروں سے الگ تھلگ کرتی ہیں، جو یورپی سماج میں ان کے ضم ہوجانے کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں، وہ اپنے رہن سہن کو اہل یورپ کے رہن سہن سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔ ان پر الزام لگایا جارہا ہے کہ وہ اپنی آبادی میں غیر معمولی اضافہ کے ذریعہ آبادی کے تناسب کو تبدیل کرنے اور اس طرح اپنے آپ کو اس پوزیشن میں لانے کی کوشش کررہے ہیں کہ ایوان اقتدار کی غلام گردشوں میں ان کی آواز دوسروں کی آواز پر حاوی ہوجائے، مسند اقتدار پر ان کا کوئی اپنا براجمان نظر آئے اور پھر وہ سب کچھ بستہ بند کردیا جائے جو یورپی معاشرہ کی شناخت، اس کی اصل روح کی حیثیت رکھتا ہے۔

یورپ کے تقریباً تمام ملکوں میں ایسی تنظیمیں وجود میں آچکی ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ مہم چلاکر فضا کو شراروں سے بھر دینے اور پورے ماحول کو آتش بار کردینے کی کوشش کررہی ہیں۔ ان تنظیموں کے اثر ونفوذ میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ سویڈن میں حکمراں محاذ کو انتہاپسند نسل پرست محاذ سے صرف دو سیٹیں ہی زیادہ مل پائی ہیں۔ یوروپی یونین

کی پارلیمنٹ کے حالیہ چناؤ میں پہلی بار برطانیہ تک میں نسل پرستوں کے امیدواروں کو کامیابی ملی ہے۔ اب سوئیٹزرلینڈ میں دائیں بازو کی انتہا پسند، اسلام مخالف سوئس پیوپلز پارٹی (SVP) کو مسجدوں کے ساتھ میناروں کی تعمیر پر پابندی سے متعلق استصواب رائے میں غیر معمولی کامیابی ملی ہے۔ اسے 57 فیصد ووٹ ملے ہیں جبکہ 2007 کے چناؤ میں یہ محض 29 فیصد ووٹ ہی حاصل کرسکی تھی۔ اس کی مقبولیت میں یہ غیر معمولی اضافہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کی اشتعال انگیز مہم کا ہی رہین منت ہے۔

سوئیٹزرلینڈ میں رائے دہندگان کو راست قانون سازی کا اختیار ابھی حاصل ہے۔ اس نے راست جمہوریت کو ابھی مکمل طور پر خیرباد نہیں کہا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کوئی پارٹی یا پارٹیوں کا محاذ رائے دہندگان کی مقررہ تعداد کے دستخطوں کے ساتھ اگر یہ مطالبہ کرتا ہے کہ کسی موضوع پر استصواب رائے (Referendum) کرایا جائے یعنی اس کے حوالہ سے عوام کے ذریعہ باضابطہ طور پر قانون سازی کرائی جائے تو حکومت اسے منظور کرلینے اور ووٹنگ کی تاریخ طے کردینے کی پابند ہے۔ وہ اس مطالبے کو مسترد نہیں کرسکتی۔ پھر رائے دہندگان کی اکثریت کے ساتھ ساتھ صوبوں (Cantons) کی اکثریت بھی اگر اس کی تائید کردیتی ہے تو اسے باضابطہ قانون کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔ حکومت براہ راست عوام کے ذریعہ بنائے جانے والے اس قانون کو روبہ عمل لانے کے لیے مجبور ہوتی ہے میناروں پر پابندی سے متعلق استصواب رائے کے ذریعہ تشکیل دیا جانے والا قانون اسی ضمن میں آتا ہے۔ چنانچہ حکومت اس کی مخالفت کرنے، اسے ناپسندیدہ قرار دینے اور یہ توقع ظاہر کرنے کے باوجود کہ عدالت اسے مسترد کردے گی، یہ اعلان کرنے پر بھی اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے کہ وہ اسے بہر صورت اور بہر قیمت روبہ عمل لائے گی۔

یہ قانون بظاہر ملک کے آئین سے متصادم نظر آتا ہے۔ یہ بین الاقوامی انسانی حقوق کے قانون کی بھی عملاً نفی کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ قانون انسانی حقوق کے یورپی کنونشن سے بھی متصادم ہے اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارے کی سربراہ نادی پلے کے مطابق یہ بڑی حد تک ناقابل فہم بھی ہے۔ لیکن اس کے تعلق سے بھری دوپہر کے دہکتے سورج کی

طرح جھلسا دینے والی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ قانون سوئیٹزر لینڈ کے عوام کی واضح اکثریت نے منظور کیا ہے۔ یہ اس کی سوچ کا آئینہ دار ہے اور اس کی سوچ جس محور کے گرد گھومتی ہے وہ یہی ہے کہ اسلام ان کے ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ مسجدوں کے میناروں کی حیثیت تو محض علامت کی ہے۔ مسجدوں کے ساتھ میناروں کی تعمیر پر پابندی عائد کر کے فی الواقع مسلمانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو پہچانیں، وہ ایک ناپسندیدہ عنصر بن گئے ہیں انھیں بحالت مجبوری ہی برداشت کیا جا سکتا ہے۔ میناروں پر پابندی کی مہم کے دوران اسلام کے روز افزوں اثر و نفوذ اور قانون شریعت کی ''ہولناکیوں'' کا ذکر عام طور پر کیا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ پیوپلز پارٹی مذہبی آزادی پر ضرب نہیں لگانا چاہتی۔ وہ میناروں پر پابندی عائد کرنا چاہتی ہے کیونکہ یہ اسلام کا سیاسی نشان ہے اور اسلام رواداری پر، دوسروں کو برداشت کرنے پر شمہ برابر بھی یقین نہیں رکھتا۔

کل ملا کر جو تصویر بنتی ہے وہ یہی ہے کہ حجاب اور اسکارف کے نام پر، رحمت عالم ﷺ کے خاکے چھاپ کر اور قرآن پاک کو فتنہ و فساد پھیلانے والی کتاب ثابت کرنے کی مہم چلا کر مسلمانوں کے حوالے سے فضا کو شراروں سے بھر دینے کی جو کوشش یورپ کے دوسرے ملکوں میں اب تک کی جاتی رہی ہے اسی کا اعادہ سوئیٹزر لینڈ میں مسجدوں کے میناروں پر پابندی عائد کرنے کے انتہائی بھونڈے قانون کے ذریعہ بھی کیا گیا ہے، اور اس کا مقصد بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو عمل اور ردِّ عمل کے ایک ایسے بھنور میں دھکیل دیا جائے جو ایک طرف ان کی اور ان کے مذہب کی شبیہ کو مزید خراب کرنے کا ذریعہ بنتا ہے تو دوسری طرف نسل پرست، اسلام دشمن عناصر کے اثر و نفوذ کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جانے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ کھیل بڑی حکمت، بڑی مہارت کے ساتھ بہت ہی منصوبہ بند طریقے سے یورپ میں کھیلا جا رہا ہے۔ دہشت گردی کو اسلام کے ساتھ جوڑ کر اسے دو آتشہ بنا دیا گیا ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کو دنیا کی ارذل ترین مخلوق اور اسلام کو خون آشام مذہب کے روپ میں دیکھا اور دکھایا جائے اور دکھ اس بات کا ہے کہ ہم گریہ و ماتم اور عمل اور ردِّ عمل کے شیطانی چکر سے نکل کر اپنے لیے کسی مثبت راہِ عمل کا تعین نہیں کر سکے ہیں۔

ایک طرف اسامہ بن لادن اور اس کے ماننے والے ہیں جو ہر اس ملک کے درپے آزار ہیں جو ان کے نظریہ اسلام کا ہمنوا نہیں ہے، جو یہ مان کر چل رہا ہے کہ اسلام اعتدال پسندی کا مذہب ہے۔ اسلام کا دہشت گردی سے، فتنہ وفساد سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے، اس بات پر تو عالم اسلام میں اجماع پایا جاتا ہے۔ عام مسلمان نہ تو دہشت گردوں کو پسند کرتا ہے، نہ دہشت گردی کی حمایت کرتا ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مسلمانوں میں ہی بعض ایسے گروہ بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے نجی، گروہی اور اپنے پالنے پوسنے والوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے دہشت گردی کے مرتکب ہوتے نظر آرہے ہیں۔ علاوہ ازیں مسلمانوں میں ہی علماء اور دانشوروں کے ایسے گروہ بھی پائے جاتے ہیں جو سیاسی اسلام کی، انقلابی اسلام کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں، جو یہ مان کر چلتے ہیں کہ ایوان ہائے اقتدار پر اسلامی پرچم لہرائے بغیر یہ دین مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہ لوگ اپنی تحریروں سے، اپنی تقریروں سے نوجوانوں کے ذہنوں کو پراگندہ کرتے ہیں، انھیں بتدریج اس راہ پر ڈال دیتے ہیں جو انھیں کسی دہشت گرد تنظیم کے حلقۂ اثر تک پہنچا دیتی ہے۔

براعظم یورپ کے ملکوں اور امریکہ میں کروڑوں مسلمان سکونت پذیر ہیں۔ انہیں وہاں روزگار کی سہولت کے ساتھ ساتھ وہ سارے حقوق بھی حاصل ہیں جو انھوں نے اپنے شہریوں کو دیے ہیں، نو وارد قرار دے کر ان کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا گیا ہے۔ یہ چاہتے تو انجمن سازی اور تحریر وتقریر کے حقوق کا فائدہ اٹھا کر اسلام کے پیغام رحمت کو عام کرنے کے لیے وقت نکال سکتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کے نتیجے میں اپنے آپ کو نشان عبرت بنا لیا ہے۔ کسی اور کی نہیں بلکہ مسلم تارکین وطن کی مہربانیوں کے نتیجے میں ہی برطانیہ میں مسجدوں پر تالے بھی پڑے اور مختلف مسلکوں کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا بھی ہوئے۔ ملّا باکری اور کلیم صدیقی جیسے ناعاقبت اندیش ''اکابرین'' کے خطبوں اور آتش بداماں لٹریچر نے نہ صرف یہ کہ مسلم نوجوانوں کو گمراہ کیا بلکہ اغیار کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بہت ہی دھاردار پروپیگنڈہ ہتھیار بھی مہیا کرادیا۔ اسے اس صدی کا سب سے بھیانک مذاق نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ لندن میں برطانوی پارلیمنٹ کے جواب

میں ''مسلم پارلیمنٹ'' تشکیل دی جاتی ہے۔ یہ ناقابل یقین کارنامہ بھی ہم انجام دے چکے ہیں۔ ہمارے کارناموں کی فہرست بڑی طویل بھی ہے اور ملک در ملک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم اپنے آپ کو قطعاً بے قصور قرار دے کر اغیار پر سازشیں ترتیب دینے کا الزام عائد کرتے اور اپنی تمام تر ذلت و رسوائی کے لیے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو اسے غایت درجہ کی سادہ لوحی کے سوا آخر اور کیا کہا جائے گا؟

مثالیں تو ان گنت ہیں آپ چاہیں تو دو اور واقعات پر نظر ڈال لیں۔ مغربی ملکوں اور امریکہ میں پناہ لینے اور ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہونے والے بہت سے علما کرام اور مجاہدین عظام کی طرح مصری مجاہد شیخ عمر عبدالرحمٰن بھی غیر قانونی طور پر نیویارک پہنچے تو امریکی حکومت نے انھیں سیاسی پناہ دی، وظیفہ مقرر کیا، مسجد دی اور گھر بھی دیا۔ شیخ نے اس کا صلہ دہشت گردوں کی پرجوش حمایت اور مبینہ طور پر دریائے ہڈسن کے نیچے سرنگ پل میں بم نصب کروا کر دیا۔ میجر حسن ندال کی فوجیوں پر فائرنگ تو ابھی کل کی بات ہے۔ وہ امریکی فوج میں میجر کے عہدہ پر فائز تھے انھوں نے اس اعتماد کا صلہ تقریباً ایک درجن بے قصور فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر دیا۔ اس طرح کے واقعات پر اہل مغرب کا ردعمل اس کے سوا اور بھلا کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی نظر میں مسلمانوں اور اسلام کی تصویر مزید خراب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ مغرب میں آباد ہو کر اسلام کا چراغ روشن کرتے لیکن ہم اس طرح کے حالات پیدا کر رہے ہیں کہ دن بدن ہماری اپنی رسوائی کا سامان فراہم ہوتا جا رہا ہے۔ ہم اغیار کی جس سازش کا رونا مسلسل روتے رہتے ہیں، عین ممکن ہے کہ اس میں بھی کچھ سچائی ہو لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس گھر کو گھر کے چراغ سے ہی آگ لگ رہی ہے۔

4/دسمبر 2009

○○

اسلامی کانفرنس برائے بین المذاہب مکالمہ

''اسلامی ممالک متحد ہو جائیں۔ دوسرے مذاہب سے برابری کی بنیاد پر مکالمہ کیا جائے۔ تہذیبوں کے مابین تصادم تباہ کن ہوگا۔ انسانیت کی مشترکہ قدروں کا تعین کرنا ہوگا''۔

یہ باتیں مکہ میں 4 جون 2008 کو منعقد ہونے والی تین روزہ بین المذاہب مکالمہ کانفرنس کے اعلانیہ میں کہی گئی ہیں۔ اس کانفرنس میں 500 سے زائد جید' فقہاء' علماء' ممتاز اسکالروں، مفکرین اور مبصرین کے علاوہ 14 سو کے قریب دیگر مہمان بھی شریک ہوئے تھے۔ سعودی فرماں روا شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''عالم اسلام کو اپنے سنگین مسائل حل کرنے کے لیے دوسرے مذاہب سے مذاکرات کرنے ہوں گے۔ مسلمانوں کو اس وقت کئی بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے ان کے حوالے سے مسلم امہ کو غور وفکر کرنا چاہیے۔ ہم دنیا کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہم انصاف' اخلاقی اقدار' بقائے باہم اور بامقصد مذاکرات کے حق میں ہیں۔ اسلام پر چاروں طرف سے یلغار ہو رہی ہے اس کے مقابلے کے لیے امت مسلمہ کو متحد و متفق ہونا چاہیے۔ آج ہم اسلامی قدروں کو دوسروں کے سامنے پیش کر کے اسلام کے تشخص کو فروغ دینے' اپنی عزت و وقار کے تحفظ کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اسلام جارح نہیں امن کا علم بردار ہے۔

کانفرنس کے اعلامیہ کو اگر سعودی فرماں روا کے خطاب کی بازگشت کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ شاہ موصوف نہ صرف یہ کہ اس کانفرنس کے روح رواں اور اس کے میزبان تھے بلکہ وہ اس سے پہلے بھی اپنے غیر ملکی دوروں میں بین المذاہب مکالمہ

کی پرزور وکالت کر چکے ہیں۔ نومبر 2007 میں عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ بنی ڈکٹ سے ویٹکن سٹی میں شاہ عبداللہ کی ملاقات میں جو موضوع تفصیل کے ساتھ زیر غور آیا اس کا تعلق بین مذاہب افہام وتفہیم سے ہی تھا۔ شاہ عبداللہ کے بعد کچھ دوسری اہم شخصیتوں کے علاوہ ایران کے سابق صدر علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے بھی کانفرنس سے خطاب کیا۔ رفسنجانی نے عالم اسلام کے اتحاد کی پرزور وکالت کرتے ہوئے کہا کہ ''زبردست قدرتی اور انسانی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود اگر آج ہم دشمنوں کے لیے لقمۂ تر ہیں تو اس کا بنیادی سبب آپس کے فروعی اختلافات ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ عالم اسلام متحد ہو جائے''۔

اسلامی ملکوں کے اتحاد کی بات بیشتر مقررین نے بھی کہی اور اسے کانفرنس کے اعلامیہ کی پہلی شق میں جگہ بھی ملی ہے اور ملنی بھی چاہئے تھی کیونکہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ علی اکبر ہاشمی رفسنجانی کی اس بات سے اختلاف کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسلمان آپسی اختلافات کے سبب ہی اغیار کے لیے لقمۂ تر بنتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلام پر چاروں طرف سے جو یلغار ہو رہی ہے اس کا مقابلہ متحد ہو کر ہی کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو عالمی سطح پر متحد کرنے کی خواہش کا اظہار تو مختلف سطحوں پر کیا جاتا رہا ہے لیکن عملاً کوئی ایسا قدم کبھی نہیں اٹھایا گیا جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہو۔ نتیجے کے طور پر مسلمانوں کا اتحاد کل بھی ایک حسین خواب تھا اور آج بھی یہ ایک پرکشش اور دلوں کو برمانے والی آرزو ہی ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ اگر کوئی معجزہ رونما نہ ہوا تو کل بھی یہ خواب تعبیر سے تہی دامن خواب ہی رہے گا۔ کانفرنسیں ہوتی رہیں گی۔ وعظ و نصیحت کا سلسلہ بھی جاری رہے گا اور دانشورانہ موشگافیوں کا سلسلہ بھی تھمنے کا نام نہیں لے گا لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہیں آئے گا کیونکہ ہم نیک نیت نہیں ہیں ہمارے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں ہم زبان سے اتحاد و اتفاق کی بات تو کرتے ہیں لیکن ہمارا عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ایک اللہ، ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان کے باوجود ہم ایک نہیں بن سکے ہیں یہی ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔ یہی ہمارے لیے نو بہ نو خطرات کو جنم دینے والا ہے۔ اسی نے ہمیں عالمی برادری میں عملاً بے وزن بنا رکھا ہے۔ آج تہذیبوں کے تصادم کی بات اس لیے کی جا رہی ہے کہ اہل

یورپ کا خیال ہے کہ ان کی تہذیب بالادست ہے اور دوسری تہذیبوں خاص کر اسلامی تہذیب کے لیے شکست مقدر ہو چکی ہے۔ اسے اگر زندہ رہنا ہے تو ہر حال میں تابع مہمل کا رول ہی ادا کرنا ہوگا۔ ان حالات میں مکہ کی بین الاقوامی کانفرنس اگر اسلامی اتحاد کی راہ ہموار کرنے کی سمت میں کسی مثبت پیش رفت کا آغاز کر سکے تو یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ کام مشکل ضرور ہے اور راہ بھی انتہائی پر صعوبت اور تلوؤں کو لہولہان کرنے والی ہے۔ لیکن کامیابی کے دروازے پہنچ سے باہر نہیں ہیں۔ ان تک پہنچا بھی جا سکتا ہے اور انھیں کھولا بھی جا سکتا ہے شرط صرف یہ ہے کہ سفر کا حوصلہ بھی ہو اور اپنے مقصد کی پاکیزگی کا یقین بھی ہو۔

یہ کانفرنس کوئی اہم رول ادا کر سکے گی یا نہیں اس سے قطع نظر یہ مان کر بہر حال چلنا چاہیے کہ یہ مسلمانوں کی اپنی ضرورت ہے۔ اس کی تمام تر اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ اس کا اولین مقصد اہل مغرب کے سامنے اسلام کی اصل تصویر پیش کرنا ہے۔ انھیں یہ یقین دلانا ہے کہ دہشت گردی اور ہمہ نوع کی انتہا پسندی کا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام ان سے برأت کا اظہار کرتا ہے۔ شدت پسندی، انتہا پسندی اور ظلم و جبر کو اسلامی ضابطۂ حیات کے حوالہ سے کسی بھی صورت میں قابل برداشت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلاضرورت طاقت کے استعمال کے بجائے افہام و تفہیم اور آپسی بات چیت کے ذریعہ مسائل کو حل کرنے کی روایت کو اسلامی معاشرے میں ہمیشہ ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بھی ثابت ہے کہ پیغمبر ﷺ نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ مختلف اوقات میں مختلف شرائط کے ساتھ مکالمہ فرمایا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جس کی نشاندہی مکہؔ کی بین المذاہب کانفرنس میں کی گئی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ مکالمے کی اپنی کچھ حدود و قیود بھی ہوتی ہیں جنھیں نظر انداز کر دینے کی صورت میں اس کا اصل مقصد ہی فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اہل مغرب کو اسلام کے خلاف ورغلانے کی پر زور اور پر شور مہم چلائی جا رہی ہے۔ جھوٹ کے طومار باندھے جا رہے ہیں۔ کہیں حجاب کے خلاف اس طرح مہم چلائی جا رہی ہے گویا مغربی تہذیب کے لیے موت و زیست کا خطرہ پیدا ہو چلا ہے۔

تو کہیں مسجدوں کے میناروں کو اسلام کی بالادست قوت کی علامت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش اور مغرب پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کے روپ میں دیکھا جارہا ہے۔ کہیں پیغمبر اسلام ﷺ کے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کے ذریعہ خبث باطن کا مظاہرہ کیا جارہا ہے تو کہیں قرآن کریم پر بیہودہ فلم بنا کر مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہی نہیں ایک امریکی فوجی نے عراق میں قرآن کریم کے مقدس صفحات کو گولیوں سے چھلنی کرکے خباثت ذہنی کا وہ مظاہرہ کیا ہے جس کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔

کل ملا کر جو تصویر بنتی ہے وہ یہی ہے کہ امریکہ اور یورپ میں ایک ایسا گروہ سرگرم ہے جو ہمہ نوع کی شرانگیزیوں کے ذریعہ تہذیبوں کے مبینہ تصادم کو قریب سے قریب تر لانے کے لیے کوشاں ہے۔ ہمہ قسم کے وسائل سے لیس یہ شاطر گروہ ہر وہ حربہ استعمال کر رہا ہے جو اسلام کی شبیہ کو خراب سے خراب تر کرنے اور اسلام اور عیسائیت کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں معاون بن سکتا ہو۔ ایسے میں مسلمانوں کو کچھ اور نہیں تو یہ تو کرنا ہی چاہیے کہ وہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے قول وعمل سے یہ بتانے اور جتانے کی کوشش کریں کہ اسلام کے خلاف جو آتش گیر مہم چلائی جارہی ہے وہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ اسلام پوری دنیا کے لیے امن وسلامتی کا پیامبر ہے۔ اسے اسی روپ میں دیکھا اور برتا جانا چاہیے۔ مکہ کی بین المذاہب مکالمہ کانفرنس نے اس موضوع پر بھی مثبت رخ اختیار کرنے کی بات کہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے اور معقول لوگوں کے ذریعہ افہام وتفہیم کی کوئی معقول مہم شروع کی جاتی ہے تو اس کے مثبت نتائج ضرور نکلیں گے۔

13/جون 2008

OO

سات پردوں میں مستور سچ

بنگلہ دیش کا جنم برصغیر کی خوں چکاں تاریخ کے ایک ایسے باب کی نشاندہی کرتا ہے جسے اگر آپ چاہیں تو 1947 میں ہندوستان کی تقسیم کے تکملہ یا اس کے منطقی انجام کے روپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ معصوم لہو کی جو روح فرسا ارزانی تقسیم وطن کے بعد دیکھنے کو ملی تھی کم وبیش اسی کا اعادہ اس وقت بھی ہوتا نظر آیا جب مشرقی پاکستان کے عوام آگ اور خون کے سمندر سے گزر کر ایک آزاد وخود مختار قوم کی حیثیت سے اپنی آرزوؤں، اپنی امنگوں اور اپنے عزائم کو مرئی روپ دے رہے تھے۔ پاکستانی فوج کے درندہ صفت افسروں اور جوانوں نے آپریشن سرچ لائٹ کے دوران اور اس کے بعد سقوط ڈھاکہ تک انسانی جان اور عزت وآبرو کے ساتھ جو کھلواڑ کیا اسے نسل کشی کا نام دیا گیا ہے اور اس میں کچھ بہت زیادہ مبالغہ بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ اس کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جو اپنے آپ میں انتہائی اذیت ناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ پاکستان کے بے غیرت اور سادیت پسند حکمرانوں کے ذریعہ مشرقی پاکستان پر مسلط کی جانے والی شب ستم میں صرف بنگالی آبادی کو ہی بدترین قسم کی بہیمیت کا سامنا کرنا نہیں پڑا بلکہ ان لوگوں کو بھی انتہائی بے رحمی کے ساتھ بڑے پیمانے پر نشانہ بنایا گیا جو ہندوستان میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر، سارے رشتے ناطے توڑ کر، سونار بنگلہ کی روح پرور فضاؤں میں ایک نئی زندگی کے تانے بانے بن رہے تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ یہ اردو بولنے والے لوگ تھے اور ان میں سے کچھ عوامی لیگ کی شدت پسندی اور پاکستان کی تقسیم کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد بنگالی عوام کو تو پاکستانی فوج کے ظلم بے پناہ سے نجات مل گئی لیکن غیر بنگالی آبادی جو بہاری مسلمان کے نام سے جانی جاتی ہے ابتلا و آزمائش کے مرحلے سے بدستور دوچار رہی۔ مکتی باہنی کے علاوہ قادر صدیقی کی رسوائے زمانہ قادر واہنی نے جس کی تنظیم و تربیت ہندوستان میں ہوئی تھی بہاری مسلمانوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا۔ ان ظالموں کے ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں تھا۔ بہاری مسلمانوں نے جو کچھ کمایا' بنایا تھا وہ سب کچھ چھن گیا' یہاں تک کہ خواتین کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں رہی۔ پناہ گزین کیمپ ان کا مقدر بن گئے۔ آج بھی تقریباً ڈھائی لاکھ پناگزین بہاری مسلمان متعدد کیمپوں میں جانوروں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ بہاری مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس نے بنگلہ دیش کے جنم کو عملاً ولادت بے سعادت کے زمرے میں لاکھڑا کیا۔ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے دامن پر یہ بدنما داغ آج بھی ان بڑے بڑے دعووں اور سنہری اصولوں کی قلعی کھولتے نظر آتے ہیں جن کی دہائی عوامی لیگ کے لیڈر ہی نہیں ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور ان کے پابند نظریہ دانشور دیتے رہے ہیں۔

بنگلہ دیش کا جنم جن حالات میں ہوا وہ دوسری چیزوں کے علاوہ چیخ چیخ کر یہ بھی کہتے سنائی دے رہے ہیں کہ اقتدار پر قابض فوجی جنرلوں اور سیاستدانوں کا ناپاک گٹھ جوڑ کبھی بھی کسی بھی ملک کے لیے صرف تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہی بن سکتا ہے۔ یہ گٹھ جوڑ بنیادی انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کا گلا گھونٹ دینے کے علاوہ معاشی لوٹ کھسوٹ اور جنسی بے راہ روی کی حوصلہ افزائی کے ذریعہ اپنی عمر میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اپنے اقتدار کو بہر قیمت اور بہر صورت قائم و دائم رکھنا ہی اس کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش کا جنم ایک ایسے ہی ناپاک گٹھ جوڑ کی خود غرضی اور اس کی نو بہ نو سازشوں کے نتیجے میں ایک ناگزیر ضرورت بن گیا تھا۔ ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے جو موقع شناسی اور موقع پرستی کے معاملہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پاکستان کو دو ٹکڑے کر دینے کے اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔ پاکستان کے اس وقت کے بلانوش اور انتہائی عیاش صدر جنرل یحییٰ خان اور پاکستان پیپلز پارٹی کے عقل کل اور پاکستان پر حکمرانی کو اپنا

ناقابل تنسیخ حق سمجھنے والے ذوالفقار علی بھٹو اگر انصاف و دیانت سے کام لیتے اور مشرقی پاکستان کی گتھی کو ناخنِ تدبیر سے سلجھانے کی کوشش کرتے تو شاید بنگلہ دیش کے المیہ سے اس کے دوررس مضمرات سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن بھٹو کو تو ہر قیمت پر پاکستان کا تخت و تاج چاہیے تھا۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کے لیے ملک کے نصف حصّے کی قربانی بھی دینی پڑ سکتی ہے۔ قضا و قدر کے فیصلے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ پاکستان ٹوٹ گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو بلا شرکت غیرے کٹے پھٹے پاکستان کے مالک کل بن بیٹھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک نادیدہ ہاتھ بھی حرکت میں آ گیا جس نے انھیں انجام کار تختۂ دار تک پہنچا دیا۔

مشرقی پاکستان میں بے چینی کی ابتدا فی الواقع 1948 میں ہوئی جب محمد علی جناح نے ڈھاکہ میں اعلان کیا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو ان کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ 1952 میں اسی مسئلے کو لے کر ڈھاکہ میں پولیس اور طلباء کے درمیان تصادم ہوا جس میں بہت سے طلباء کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

بعد ازاں زبان اور معاشی استحصال کو لیکر مشرقی پاکستان میں اضطراب و بے چینی کی لہریں وقتاً فوقتاً اٹھتی رہیں یہاں تک کہ 1970 کے انتخاب میں شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی عوامی لیگ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری۔ اس نے مشرقی پاکستان کو الاٹ کی جانے والی 162 سیٹوں میں سے 160 پر قبضہ کر لیا۔ انتخابی نتائج کی رو سے شیخ مجیب الرحمٰن کو وزارت سازی کی دعوت دی جانی چاہیے تھی لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے انھیں وزیر اعظم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے ملک کے دونوں حصوں کے لیے دو الگ الگ وزرائے اعظم کی عجیب و غریب تجویز پیش کی۔ عوامی لیگ کو ظاہر ہے یہ تجویز پسند نہیں آ سکتی تھی۔ اس سے قبل بھٹو، شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کو بھی مسترد کر چکے تھے۔

3 مارچ 1971 کو بھٹو، شیخ مجیب الرحمٰن اور جنرل یحییٰ خان نے ایک خصوصی میٹنگ میں آئینی بحران کو حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بھٹو کی ہٹ دھرمی کے سبب یہ میٹنگ بے نتیجہ رہی۔ چار دن بعد شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی ایک تقریر میں چار مزید نکات پیش کیے جن کے تحت مارشل لاء کو بلا تاخیر ختم کرنے اور فوجوں کو بیرکوں میں واپس بھیجنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ شیخ

صاحب نے اپنی تقریر کے اختتام پر لوگوں سے اپیل کی کہ وہ ہر گھر کو مزاحمت کے قلعے میں تبدیل کر دیں۔ پھر 25 مارچ کو پاکستانی فوج نے آپریشن بلیو اسٹار شروع کیا جس کے دوران ہزاروں بنگلہ دیشیوں کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ اسے بیشتر مبصرین نے نسل کشی کے آغاز کا نام دیا ہے۔ پاکستان کے اس وقت کے چیف جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں قائم کیے گئے تحقیقاتی کمیشن نے بھی اپنی رپورٹ میں جو کبھی منظرِ عام پر نہیں آئی بڑے پیمانے پر پاکستانی جنرلوں کے ذریعہ اختیارات کے بے جا استعمال' ہزاروں بنگلہ دیشیوں کے قتل' آبروریزی' پان کی اسمگلنگ' مشرقی پاکستان کے بینکوں کی لوٹ، افسروں کی شراب نوشی اور عیاشی کی ہوش ربا تفصیل بیان کی ہے۔ جسٹس حمود الرحمٰن نے فوج کے متعدد اعلا افسروں کے کورٹ مارشل اور ان پر باقاعدہ مقدمہ چلانے کا مشورہ بھی دیا تھا جس پر عمل نہیں کیا گیا۔

25 مارچ 1971 کو پاکستانی فوج نے قتل و غارت کی جو مہم شروع کی اس نے مفاہمت کی تمام کوششوں پر عملاً پانی پھیر دیا اور جنرل یحییٰ اور بھٹو کا غالباً مقصد بھی یہی تھا۔ وہ اپنے اس مقصد میں اس طرح کامیاب رہے کہ مشرقی پاکستان ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے ساتھ ہی ان کے نامۂ اعمال میں ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کے قتل اور آبروریزی کے ہزاروں واقعات درج ہو گئے۔

26 مارچ کو مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان بھیج دیا گیا جہاں یحییٰ خان نے بریگیڈیر رحیم الدین خان کی سربراہی میں ایک خصوصی ٹریبونل قائم کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کو اس کے حوالے کر دیا۔ رحیم الدین نے شیخ صاحب کو موت کی سزا دی لیکن جنرل یحییٰ خان نے اس پر عمل درآمد روک دیا۔ بعد ازاں 27 مارچ کو میجر ضیاء الرحمٰن نے شیخ مجیب الرحمٰن کی جانب سے بنگلہ دیش کی آزادی کا باضابطہ طور پر اعلان کر دیا۔ 17 اپریل کو عوامی لیگ کے سینئر لیڈر مہر پور کے بیدیہ ناتھ تلا (مجیب نگر) میں جمع ہوئے اور بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا اس حکومت کے صدر کا منصب شیخ مجیب الرحمٰن کو ملا لیکن چونکہ وہ پاکستان کی قید میں تھے اس لیے سید نذرالاسلام کو عارضی صدر' تاج الدین احمد کو وزیر اعظم اور خوند

کر مشتاق احمد کو وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ اس حکومت کے قیام کے ساتھ ہی دوست ملکوں خاص کر ہندوستان کے لیے بنگلہ دیش کو ہر ممکن مدد بہم پہنچانے کا راستہ پوری طرح صاف ہو گیا۔

پھر عطاء الغنی عثمانی کی قیادت میں مکتی باہنی نے بڑے پیمانے پر گوریلا حملے شروع کر دیئے۔ اگست 1971 میں ہندسوویت معاہدے کے بعد ہندوستان نے بنگلہ دیش کے معاملات میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ بڑے پیمانے پر دلچسپی لینی شروع کر دی اور 3 دسمبر 1971 کو ہماری فوجیں جنگ میں باقاعدہ طور پر شریک ہو گئیں۔ یوں تو ہندوستانی فوجیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خاص کر بیلونیا کے معرکے کے بعد مختلف محاذوں پر مختلف شکلوں میں اپنی موجودگی بنائے ہوئے تھے اور مکتی باہنی کی مختلف ٹکڑیوں کی تربیت اور رسد کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کی فراہمی کی ذمہ داری بھی کسی نہ کسی درجے میں ہندوستانی فوج ہی سنبھالے ہوئے تھی۔ ایک کروڑ بنگلہ دیشی پناہ گزینوں کا بوجھ ہمارے کندھوں پر تھا اور اس نے ہمارے لیے یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ ہم پوری دنیا میں بنگلہ دیش کی تحریک کے جواز کا ڈھول پیٹتے پھریں۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ بنگلہ دیش کے معاملے میں ایک عام جھلی والے اور اپنے آپ کو دانشور کہلوانے والوں کی سوچ میں شمہ برابر کوئی فرق نہیں تھا۔ سب ایک سُر میں بنگ بندھو کی آرادھنا کرتے نظر آ رہے تھے اپنے آپ کو سوشلسٹ کہنے والے جے پرکاش نارائن عملاً ناگپور کی ٹکسالی بولی بولتے سنائی دے رہے تھے تو مارکس کی امت سوویت یونین کی انگلی تھام کر آزادی اور جمہوریت کے گیت گاتی نظر آ رہی تھی سب ایک رنگ میں رنگ گئے تھے اور وہ تھا زعفرانی رنگ۔ مسز گاندھی نے خود بھی ہمارے پرچم کے سبز اور سفید رنگوں کے بجائے اپنی ساری توجہ زعفرانی رنگ پر مبذول کر دی تھی۔

ابتدا میں ہم نے قدرے محتاط رویہ اختیار کیا۔ لیکن 3 دسمبر 1971 کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پاکستان نے ہوائی حملے میں پہل کر کے ہماری فوجوں کو جنگ میں باضابطہ طور پر کود پڑنے پر مجبور کر دیا۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے پاکستان کی اس حماقت کا منہ توڑ جواب اس طرح دیا کہ ہندوستانی فوجوں نے مغربی بنگال، تریپورہ اور آسام کی ریاستوں سے ڈھاکہ کی طرف بڑھنا شروع کیا اور تقریباً دو ہفتوں میں سارا کھیل

ختم ہوگیا۔ 16 دسمبر 1971 کو پاکستان کی فوج کی چودھویں ڈویژن کے میجر جنرل جمشید نے ڈھاکہ میں میر پور برج کے پاس جنرل ناگرا کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے ساتھ ہی نو ماہ کی جنگ آزادی عملاً اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ بعد ازاں پاکستانی فوج کی مشرقی کمان کے جنرل اے۔ اے۔ کے نیازی نے لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈال کر پاکستان کی شرمناک شکست پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

بنگلہ دیش کی تشکیل میں بھٹو اور جنرل یحییٰ خان کی ہٹ دھرمی اور ہوس اقتدار نے بلاشبہ کلیدی رول ادا کیا تھا۔ ان کی ہٹ دھرمی نے شیخ مجیب الرحمٰن کو پورا پورا موقع فراہم کیا کہ وہ بنگلہ دیش کی آزادی کے اپنے دیرینہ خواب کی من چاہی تعبیر تلاش کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے حتی الوسع اس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ وہ حالات کو سنبھالنے کے بجائے انھیں بگاڑتے چلے جائیں۔ بنگلہ دیش کی تحریک میں مسز اندا گاندھی کا رول بھی کچھ کم اہم نہیں رہا۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے قیام کا سب سے زیادہ کریڈٹ انھیں کو جاتا ہے۔ سوویت یونین کی انھیں بھرپور تائید وحمایت تو حاصل تھی ہی شیخ مجیب الرحمٰن کی شکل میں انھیں ایک ایسا قد آور سیاسی لیڈر بھی مل گیا تھا جس کی مدد سے وہ پاکستان کو توڑنے کی اپنی دیرینہ آرزو پوری کر سکتی تھیں۔ آخری عمر میں ان میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں ان کے پیش نظر ان کا بنگلہ دیش کی تحریک کی دامے، درمے، قدمے تائید وحمایت کرنا کوئی غیر متوقع بات نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے پاکستان توڑ دیا اور اٹل بہاری باجپائی جیسے کٹر ہندوتوادیوں نے دیوی درگا کہہ کر انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ وہ دیکھتے دیکھتے ہندوتوادیوں کی بھی آنکھ کا تارا بن گئیں اور شاید ان کے جواں سال پوتے راہل گاندھی نے یہ یاد دلا کر کہ ان کی دادی نے پاکستان کو توڑا تھا ایک بار پھر ہندوتوادیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں گے اس کا صحیح اندازہ تو انتخابات کے بعد ہی ہوگا۔ لیکن راہل گاندھی نے مسز گاندھی کے تعلق سے جو بات کہی ہے وہ بلاشبہ صدفی صد سچ ہے۔ انھوں نے اتنا بڑا سچ بول کر بلاشبہ ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے وہ سچ جو سات پردوں میں مستور تھا اسے انھوں نے بے نقاب کر کے یہ کہنے کا حق بہر حال حاصل کر لیا ہے کہ ہم نہرو گاندھی پریوار کے لوگ سچ بھی

بولتے ہیں۔

پس تحریر: اسے محض اتفاق کہا جاسکتا ہے یا کچھ اور کہ بنگلہ دیش کے قیام میں جن اہم شخصیتوں نے مثبت یا منفی طور پر کلیدی رول ادا کیا تھا ان میں سے کسی کو بھی فطری موت یا آرام وسکون کی زندگی نصیب نہیں ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو ایک عدالتی فیصلے کی آڑ میں تختۂ دار پر کھینچ دیا گیا۔ جنرل یحییٰ خان جو عملاً بھٹو کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن چکے تھے اپنے گھر میں قید رہ کر موت کا انتظار کرتے رہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو 15 دسمبر 1975 کو ان کے اہل وعیال کے ساتھ گولی ماردی گئی۔ ان کی دو بیٹیاں شیخ حسینہ واجد اور ریحانہ جو ملک سے باہر تھیں صرف وہی بچی رہ گئیں۔ بنگلہ دیش کی جلا وطن حکومت کے عارضی صدر سید نذر الاسلام، وزیر اعظم محمد تاج الدین اور دو وزرا محمد منصور علی اور ابوالحسنات محمد قمر الزماں کو 3 نومبر 1975 کو ڈھاکہ جیل میں فوج اور پولیس کے کچھ افسروں نے سنگینیں چبھو چبھو کر انتہائی بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا۔ مسز اندرا گاندھی کی موت کن حالات میں ہوئی اس سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔

25/اپریل 2007

○○

بنگلہ دیش کے بہاری مسلمان

برصغیر ہند پاک و بنگلہ دیش میں ان دنوں حالات و واقعات کی روش ایک خاص سمت میں اشارہ کرتی نظر آرہی ہے، جس میں اگر آپ چاہیں تو آنے والے دنوں کی دھندلی سی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اتر پردیش کے اسمبلی انتخابات کے حوالے سے ایک نئی صف بندی کے لیے زمین ہموار کی جارہی ہے تو بنگلہ دیش کی عبوری حکومت نے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر کے عملاً مارشل لاء جیسے حالات پیدا کر دیے ہیں۔ پاکستان میں جنرل پرویز مشرف نے اپنے اختیارات کے من مانے استعمال کی تمام حدیں توڑ دی ہیں انھوں نے عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس کو بہ یک جنبش قلم برخاست کر کے عدلیہ کو عملاً یہ بتا اور جتا دیا ہے کہ اختیارات کا اصل سرچشمہ وہی ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنے کا مطلب محرومی و مایوسی اور ذلت و خواری کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں اس منظر نامہ میں اگر امریکی وزارت خارجہ کی عالمی سطح پر انسانی حقوق کی پامالی سے متعلق رپورٹ بھی شامل کر لی جائے تو کسی کالم نگار نے کے لیے ان میں سے کسی ایک موضوع کا انتخاب کچھ آسان نہیں ہوسکتا۔ لیکن میں نے ان سب کو نظر انداز کر کے اپنے قارئین لیے ایک ایسا موضوع منتخب کیا ہے جسے بظاہر بے وقت کی راگنی ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس موضوع کا تعلق بنگلہ دیش میں محصور بہاری مسلمانوں کی حالت زار سے ہے جو بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد سے اب تک پناہ گزین کیمپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس کالم کی محرک وہ چھوٹی سی خبر ہے جو ایک انگریزی اخبار کے ایک گوشے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ چھوٹی سی خبر اپنے دامن میں محرومی

ومایوسی، ظلم وجبر اور حرماں نصیبی کی ایک ایسی داستان سمیٹے ہوئے ہے جو 35 برسوں پر محیط ہے۔ اس خبر کے مطابق پناہ گزینوں سے متعلق اقوام متحدہ کے کمشنر نے کہا ہے کہ بہاری مسلمانوں کے مسئلہ کا واحد حل یہی ہے کہ انھیں بنگلہ دیش کی شہریت دے دی جائے۔

بنگلہ دیش میں واقع ریڈ کراس کے 66 کیمپوں میں دولاکھ 60 ہزار مہاجر انتہائی کسمپرسی کے حالات میں عملاً بھکاریوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو غیر منقسم ہندوستان کی مسلم آبادی کا ایک حصہ تھے۔ تقسیم وطن کے بعد ان لوگوں نے ایک اجنبی دیس میں ایک نئی زندگی شروع کرنے کی آرزو لے کر نومولود پاکستان کا رخ کیا تھا۔ اس وقت ان کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں رہی ہوگی کہ ایک ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب وہ اپنے نئے وطن میں اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔ یہ لوگ اپنے وطن ہندوستان میں نہ بے یارومددگار تھے نہ بے گھر بے در۔ یہ لوگ یہاں ایک پرسکون زندگی گزار رہے تھے لیکن اسے حالات کی ستم ظریفی کہیے یا کچھ اور کہ آج ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ جو کچھ ہندوستان میں تھا اس سے یہ خود دست بردار ہو گئے تھے اور مشرقی پاکستان میں انھوں نے شب وروز کی محنت سے جو کچھ کمایا، بنایا تھا وہ ان سے چھن گیا انھیں وہ بنیادی سہولتیں بھی حاصل نہیں ہیں جو غریب سے غریب ملک بھی اپنے شہریوں کو مہیا کرتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ عملاً کسی بھی ملک کے نہ تو شہری ہیں نہ اس کی ذمہ داری۔

آگ اور خون کا سمندر پار کر کے جب بنگلہ دیش کی نئی مملکت وجود میں آئی تو ان بدنصیب مہاجروں نے اپنے آپ کو ایک دشت بے اماں میں پایا ان کے مکانات اور ان کی املاک بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ متعدد سرکاری حکم ناموں مثلاً کارگزار صدر کے حکم نامہ نمبر (1) مجریہ 1972 ' بنگلہ دیش متروکہ املاک (کنٹرول انتظام وانصرام اور خرید وفروخت) آرڈر 1972 اور صدارتی حکم نامہ نمبر 16 وغیرہ کے ذریعہ بہاری مسلمانوں کو ان کے مکانوں ' دکانوں اور دیگر املاک سے محروم کرنے کا راستہ ہموار کر دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر 1972 کے وسط تک مجموعی طور پر 10,08,680 بہاری مسلمان پوری طرح لٹ پٹ کر پورے ملک میں پھیلے ہوئے پناہ گزین کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

حکومت بنگلہ دیش نے 1972 میں ہی صدارتی حکم نامہ نمبر 149 جاری کیا جسے بہاری مسلمانوں کے تعلق سے ایک مثبت قدم کہا جاسکتا ہے۔ اس حکم نامہ کے ذریعہ بہاری مسلمانوں کو بنگلہ دیش کی شہریت کی پیش کش کی گئی تھی۔ حکومت بنگلہ دیش کے ذرائع کے مطابق 6 لاکھ بہاری مسلمانوں نے بنگلہ دیش کی شہریت قبول کر لینے کا اعلان کیا جبکہ 539,669 لوگوں نے ان کے برعکس اپنے نام صلیب احمر کی بین الاقوامی کمیٹی (ICRC) کے یہاں درج کرائے اور پاکستان منتقل ہونے کے عزم بالجزم کا اظہار کیا۔ اور غالباً یہیں ان سے ایک بڑی چوک ہوگئی۔ انھوں نے پاکستان کے حکمرانوں اور پاکستان کے عوام کے ذہن ومزاج کو سمجھنے میں شدید غلطی کی۔ وہ اس حقیقت کا ادراک بھی نہیں کر سکے کہ پاکستان کے سندھی، پنجابی، بلوچ اور پٹھان مہاجروں لیے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے بہیمانہ قتل کے بعد قائم ہونے والی مختلف بنگلہ دیشی حکومتوں نے بہاری مسلمانوں کی منتقلی پر اسلام آباد کو آمادہ کرنے کے لیے سفارتی سطح پر کئی قدم اٹھائے لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ پاکستان کے اس وقت کے صدر جنرل ضیاء الحق 1985 میں جب ڈھاکہ گئے تو انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اگر مالی وسائل فراہم ہو جائیں تو پاکستان بہاری مسلمانوں کو بے چون وچرا اپنا لے گا۔ انھوں نے رابطہ ٹرسٹ کے نام سے ایک باضابطہ ادارہ بھی قائم کردیا تھا جس کے بنیادی ارکان میں ان کے علاوہ پاکستان کے وزرائے داخلہ وخزانہ اور سعودی عرب کے شہزادہ طلال بن عبدالعزیز، رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل اور سعودی چیمبر آف کامرس کی کونسل کے صدر بھی شامل تھے۔ اس ٹرسٹ کا بنیادی مقصد بہاری مسلمانوں کی پاکستان واپسی اور ان کی باز آبادکاری کے لیے رقوم فراہم کرنا تھا۔ اس کی تشکیل کے وقت جو بنیادی فنڈ قائم کیا گیا تھا اس میں 5 کروڑ روپے رابطہ عالم اسلامی نے دئے تھے اور 25 کروڑ روپے حکومت پاکستان نے۔ طے یہ پایا تھا کہ خلیج کے ملکوں کے ارباب ثروت سے رقوم اکٹھا کرنے کی باضابطہ مہم چلائی جائے گی اور ایسا کیا بھی گیا۔ رابطہ نے اپنے طور پر بہاری مسلمانوں کی واپسی سے متعلق ایک جامع منصوبہ بھی تیار کیا تھا جس میں 27 کروڑ 80 لاکھ ڈالر

کی لاگت سے 36 ہزار مکانوں کی تعمیر کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہ مکانات 80 مقامات پر تعمیر کیے جانے والے تھے۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکی۔ صرف اتنا ہوا کہ ٹرسٹ کے ذریعہ 1990 کے اوائل میں ایک ہزار مکانات صوبہ پنجاب کے میاں چنوں میں تعمیر کرا دیے گئے جو آج بھی اپنے مکینوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ٹرسٹ کی آخری میٹنگ 1997 میں اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی اور اب اس کی کوئی اور میٹنگ شاید ہی منعقد ہو کیونکہ 23 ستمبر 2001 کو امریکی وزارت خارجہ نے رابطہ ٹرسٹ کو دہشت گردوں کی مالی معاونت کرنے والے خیراتی اداروں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے رابطہ ٹرسٹ نے بنگلہ دیش میں مقیم بہاری مسلمانوں کی منتقلی کے بجائے غالباً اپنی دلچسپیوں کا مرکز دوسرے موضوعات کو بنالیا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی واپسی کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔

بہاری مسلمانوں کی واپسی میں سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان کا رویہ بنا رہا ہے وسائل وذرائع کا مسئلہ تو اس لیے اٹھایا جاتا رہا ہے کہ عالمی رائے عامہ کو گمراہ کیا جا سکے۔ اصل مسئلہ اس زمین کا ہے' اس خطے کا ہے جہاں انھیں بسایا جا سکے۔ سندھ انھیں کسی بھی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بلوچستان کے میر ظفر اللہ پہلے بار بار یہ اعلان کرتے رہے کہ بلوچستان کے دروازے بہاری مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں لیکن 2003 میں جب انھوں نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا تو یہ اعلان کر دیا کہ 1971 کے بعد پیدا ہونے والے بنگلہ دیشیوں کو وہیں بنگلہ دیش میں بسا دیا جائے ان بدنصیب بہاری مسلمانوں کے لیے نہ سندھ میں کوئی جگہ ہے نہ پنجاب میں نہ بلوچستان انھیں قبول کرنے کے لیے تیار ہے نہ صوبہ سرحد۔ اگر ان کی واپسی کے لیے رقوم کا انتظام ہو جائے تو بھی یہ جائیں گے کہاں؟ اور اگر عالمی برادری ان کے لیے مکانات کی تعمیر کے لیے ضروری رقوم بھی مہیا کر دے تو یہ مکانات بنائے کہاں جائیں گے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اہل پاکستان کے دل اتنے کشادہ نہیں ہیں کہ ان لوگوں کے لیے زمین کے کچھ ٹکڑے مہیا کرا دیں' اور خلا میں مکانات کی تعمیر کی منزل ابھی بھی ایک خوبصورت خواب بنی ہوئی ہے۔ دیوانے کا خواب بہتر یہی ہوگا کہ بہاری مسلمان اب

پاکستان واپس جانے کی آس چھوڑ دیں۔ موجودہ حالات میں بہاری مسلمانوں کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا ہے کہ وہ بنگلہ دیش کو ہی اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیں۔ ویسے بنگلہ دیش کے لیے بھی اب انھیں قبول کرلینا کوئی آسان بات نہیں ہوگی۔

16/مارچ2007

OO

پہاڑوں جیسے سربلند لوگ

چیچنیا کے غیور، حوصلہ مند اور ایثار پیشہ مسلمان اپنے مقدس لہو سے تاریخ عظیم کا جوزریں باب رقم کر رہے ہیں، اس نے نہ صرف یہ کہ دنیا بھر کے حریت پسند اور دین پسند مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے، بلکہ ان کے ادائے جہاد نے خون مسلم کو ایک نئے تموج اور نئی حرارت سے آشنا بھی کیا ہے۔ بلانوش یلتسن اور اس کے وحشی وزیر جنگ گراچیف کی خون آشام فوجوں کو ناکوں چنے چبوا کر چیچنیا کے مجاہدوں نے عملاً یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ امام منصور رحمۃ اللہ علیہ، غازی محمد، حمزہ بک اور امام شامل کی فکر فلک رسا اور ان کے جذبہ جہاد کے نہ صرف یہ کہ حقیقی وارث ہیں، بلکہ اپنے ان بزرگوں کی میراث میں مزید اضافہ کی اہلیت اور حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

راجدھانی گروزنی میں نئے سال کا پہلا دن، اس کی چار لاکھ آبادی کے لیے موت وتباہی کا پیغام بن کر طلوع ہوا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی، تیل کے کنوئیں موت کے کنوئیں بن بن گئے تھے، ہنستے بستے گھر کھنڈروں میں تبدیل ہو رہے تھے اور بوڑھے، بچے، جوان بلا تخصیص لقمۂ اجل بن رہے تھے۔ روس کی حملہ آور قیادت کا خیال تھا کہ گروزنی پر چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ 24 گھنٹے میں قبضہ ہو جائے گا، لیکن ان کی یہ خوش فہمی ریت کی دیوار یا دیوانے کا خواب ثابت ہوئی۔ چیچنیا کے غیور مسلمانوں نے ایک دو نہیں پورے دس دن تک حملہ آور فوجوں کا مقابلہ کیا اور ہزاروں روسی فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ روس کے عوام نے جب ٹیلی ویژن پر گروزنی کی سڑکوں پر بکھری ہوئی اپنے فوجیوں کی سڑتی ہوئی لاشیں اور جلتے ہوئے ٹینکوں کے ہوش ربا منظر دیکھے تو وہ سراپا احتجاج بن گئے، ماسکو اور ملک

کے دوسرے حصوں میں مظاہروں کا جو زبردست سلسلہ شروع ہوا اس سے یلتسن اور گراچیف کا امن وسکون غارت ہو کر رہ گیا۔

گروزنی کھنڈر بن چکا ہے، روسی فوجیں اس کھنڈر میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں، لیکن چے چنیا کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ گروزنی تو اس کی پہلی دفاعی چوکی تھی۔ چیچنیا کے مرد ان حر، پہاڑوں جیسے سربلند لوگ، ایک بار پھر پہاڑوں کی جانب رواں دواں ہیں، جہاں سے وہ ایک طویل وفیصلہ کن جنگ شروع کرنے والے ہیں۔ ایک ایسی جنگ جو انشاء اللہ ان کی فتح پر منتج ہوگی۔

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ڈیڑھ سو سال قبل زار شاہی کے خلاف قفقاز میں جو مسلح مزاحمت شروع ہوئی تھی اس کے قائد اول اور رح رواں امام منصور چیچنیا ہی کے رہنے والے تھے اور تحریک مریدیہ جس نے قفقاز میں تقریباً نصف صدی تک مسلمانوں کے دلوں کو جوش جہاد سے گرمائے رکھا اس کا سب سے بڑا مرکز بھی چیچنیا میں ہی تھا۔ تحریک مریدیہ کے آخری قائد امام شامل رح اور ان کے ساتھیوں کی شجاعت وبسالت کو دوسروں کے علاوہ مادیت کے مبلغ کارل مارکس نے بھی خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی جدوجہد آزادی کو دوسری قوموں کے لیے ایک عظیم الشان سبق قرار دیا ہے۔

امام منصور نے تحریک مریدیہ کے لیے جو ترانہ تحریر کیا تھا وہی آج بھی چے چنیا کا قومی ترانہ ہے۔ اس ترانے میں کہا گیا ہے: ”لا الہ الا اللہ ...... ہم پہاڑوں کے غازی ہیں۔ ہم خالدؓ وعمرؓ کے جانشین ہیں، ہم اپنی مسلمان بہنوں، بیٹیوں کے محافظ ہیں۔ ہم اپنی قوم کی حفاظت کریں گے اور جہاد کے ذریعہ دنیا پر چھا جائیں گے“۔

تاریخ نے کئی کروٹیں لیں۔ اندھیروں نے کئی بار یلغار کی۔ ظلم وجبر کی قوتوں نے کئی بار پہاڑوں کے بیٹوں کے صبر وحوصلہ کا امتحان لیا، لیکن وہ انھیں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ امام منصور کے اس ترانے کو اپنے سب سے بیش قیمت اثاثہ کے روپ میں دل سے لگائے رکھا بلکہ اپنے آپ کو خالدؓ وعمرؓ کا جانشین ثابت کرنے کی بار بار کوشش بھی کی جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور اس وقت تک جاری

رہے گا جب تک کہ روس کے غاصب حکمراں ایک آزاد وخود مختار قوم کی حیثیت سے ان کے وجود کو تسلیم نہیں کر لیتے۔

روس کی قوت قاہرہ اپنی جگہ پر، اوراس سے بھی انکار نہیں کہ مادی وسائل کے اعتبار سے روس اور چیچنیا کا سرے سے کوئی مقابلہ نہیں ہے، لیکن انکار اس سے بھی نہیں کیا جاسکتا کہ چیچنیا کے عوام جس جذبہ جہاد سے سرشار ہیں روسی فوجیں اس سے قطعاً محروم ہیں، اور انکار اس سے بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ میدان جنگ میں ہمیشہ فیصلہ اسلحی برتری کی بنیاد پر ہی نہیں ہوا کرتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو سوویت یونین کو، جس کی فوجی طاقت اور حربی صلاحیت روسی وفاق سے کہیں زیادہ تھی، افغانستان سے انتہائی ذلت کے ساتھ بے نیل ومرام واپس نہ لوٹنا پڑتا۔ اور افغانستان کی کہانی ایک بار پھر چیچنیا میں بھی دہرائی جائے گی، اس میں کم از کم ان لوگوں کو قطعاً کوئی شک وشبہ نہیں ہے جو اللہ کی نصرت پر یقین رکھتے ہیں اور یہ مان کر چلتے ہیں کہ اصل فیصلے زمین پر نہیں بلکہ آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ انشاء اللہ وہ دن ضرور آئے گا جب خالدؓ وعمرؓ کے جانشین سربلند وسرخرو ہوں گے۔ خدا کرے وہ دن جلد آئے۔ (آمین)

15/فروری 1995

○○

اپنی تعمیری فکر کے سبب صحافت کو عبادت کی طرح انجام دیتے ہیں۔ ان کو بخوبی معلوم ہے کہ اس عبادت میں کہاں سجدہ اور کہاں رکوع کرنا ہے اور کہاں سلام پھیر کر اٹھ جانا ہے۔ وہ ایک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ صحافیانہ مضامین کے ساتھ ساتھ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ادبی مضامین اور شخصی خاکے بھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سہیل انجم جس تحریری میدان میں بھی قدم رکھتے ہیں وہاں کامیابی و کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی
ایڈیٹر ماہنامہ آجکل
نئی دہلی

Mahfoozur Rahman

Urdu Sahafat Ka Nishan-e Imtiyaz

Author: Suhail Anjum



برادرم سہیل انجم نئی نسل کے ان پختہ کار صحافیوں میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی محنت، جدوجہد، لگن اور جاں فشانی کے ساتھ اردو صحافت میں نام پیدا کیا ہے۔ وہ جس دور میں اس راہ کے مسافر ہوئے تھے تب محنت اور ایمانداری ہی کامیابی اور اعتبار حاصل کرنے کا وسیلہ تھی۔ اس راہ کے مسافروں میں یہ خاکسار بھی شامل ہے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اس میدان میں قدم رکھا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھا۔ ساتھ ہی ان بزرگان صحافت سے بھی قریبی رسم وراہ رکھی جن کے نقش قدم پر چل کر ہم اس کارواں میں شامل ہوئے۔ یہ کتاب بزرگ صحافی اور دانشور مخدومی محفوظ الرحمٰن مرحوم کو ایک بھرپور خراج عقیدت کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کی آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ بھی ہے۔ سہیل انجم زود نویس صحافی ہیں جو اس میدان میں کامیابی کا سب سے بڑا وصف ہے۔ شاید اسی لیے صحافت کو عجلت میں لکھا ہوا ادب (Literature in hurry) بھی کہا جاتا ہے۔ وہ اردو صحافت کے بال و پر سنوارنے کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔ اسی لیے ان کے زبان و بیان میں ستھرائی بھی ہے اور روانی بھی۔

—— معصوم مرادآبادی

ISBN 978-93-83239-33-7

اپلائڈ بکس
APPLIED BOOKS
1739/10 (Basement), New Kohinoor Hotel, Pataudi House
Darya Ganj, New Delhi-110002
Tel.: 011-23266347 Email: appliedbooks@gmail.com